محمود الفتاویٰ

جلد چہارم

حضرت اقدس مولانا مفتی احمد صاحب خانپوری دامت برکاتہم
سابق صدر مفتی و حال شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین، ڈابھیل

ترتیب
مفتی عبد القیوم راجکوٹی

مکتبہ محمودیہ
محمود نگر، ڈابھیل، گجرات

محمود الفتاویٰ (مبوب)

جلد چہارم

بقیۃ کتاب الزکاۃ، کتاب الصوم، کتاب الحج

حضرت اقدس مفتی احمد صاحب خانپوری دامت برکاتہم
(سابق صدر مفتی، حال شیخ الحدیث: جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین، ڈابھیل)

مرتب: مفتی عبدالقیوم صاحب راجکوٹی

ناشر
مکتبہ محمودیہ، محمود نگر، ڈابھیل، گجرات

تفصیلات

نام کتاب: .... محمود الفتاویٰ (جلد چہارم)

مرتب: .... مفتی عبدالقیوم صاحب راجکوٹی

کمپیوٹر سیٹنگ: .... محمد ساجد بن مصطفیٰ پٹنی ، عبداللہ بن اشرف مانگرولی

ناشر: .... مکتبہ محمودیہ، محمود نگر، ڈابھیل

ملنے کے پتے

مکتبۂ انور، محمود نگر، ڈابھیل، 9924693470

ادارۃ الصدیق ڈابھیل، نزد جامعہ، 9904886188 / 9913319190

ادارۃ الصدیق دیوبند، نزد مدنی مسجد، مدنی روڈ، دیوبند، 9997953255

فہرست

کتاب الصوم

باب رؤیة الهلال

بقیۃ باب المصارف

مکاتب قرآنیہ میں زکوۃ صَرف کرنے کے فضائل ومسائل

(۱) مصرف کی تلاش (۲) فضائل انفاق مال (۳) مال میں زکوۃ کے علاوہ حقوق (۴) ہر سال حج وعمرہ کرنے والوں کے لیے لمحۂ فکریہ (۵) زکوۃ وخیرات کا بہترین مصرف (۶) زکوۃ کی ادائیگی رمضان ہی میں کیوں؟ (۷) زکوۃ تھوڑی تھوڑی نکالنے کی تین مصلحتیں

سوال: اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے صوبہ گجرات کے غربت زدہ اور دینی لحاظ سے پسماندہ علاقوں میں چند رفقاء کے ساتھ مکاتب کے قیام کی سعادت حاصل ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے اب تک تقریباً دوسو پچھتر آبادیوں میں قیام مکتب کی سعادت حاصل ہوئی ہے، اب الحمد للہ یہ سلسلہ بڑھتا ہی جارہا ہے، اولاً ان مکاتب کے قیام کا پس منظر قدرے عرض کرتا ہوں:

جن دیہاتوں میں مسلمان قلیل تعداد میں ہیں، اور آج تک ان بستیوں میں مسجد، مدرسہ، مکتب کی کوئی شکل نہیں، جس کی وجہ سے مسلمانوں میں ارتداد یا ارتداد جیسا ماحول تھا اور اب بھی ہے، مسلمانوں کے گھروں میں بت اور محلوں میں بت کدہ بنے ہوئے ہیں اور بعض جگہ اب بھی یہ صورت حال ہے، اور مسلمان غیر مسلموں جیسا شعار، لباس، وضع قطع اپنائے ہوئے ہیں، نام بھی غیر مسلموں جیسے ہیں، غیر مسلموں کے تہواروں کو ذوق وشوق سے مناتے ہیں، اسلامی تہواروں کا بہت سوں کو پتہ تک

نہیں ہیں، بعضوں نے قرآن کا لفظ تک نہیں سنا ہے، شہروں کے اطراف میں نئی نئی کالونیاں اور جھونپڑے بڑی مقدار میں آباد ہو رہے ہیں، ان جگہوں پر بھی مکتب، عبادت گاہ نہ ہونے کی وجہ سے مسلمانوں میں گمراہی اور فتنے گھس آئے ہیں، قادیانی اور عیسائی مشنری ان جگہوں کو خاص نشان بنا رہے ہیں۔

ان علاقوں میں بسنے والے ۹۰ / فیصد مسلمان غریب اور مزدور پیشہ ہیں، جن کے لیے اپنی آمدنی سے اپنی ضروریات زندگی کی تکمیل مشکل ہوتی ہے، ان میں بہت ہی کم متوسط درجے کے ہیں جو اپنی آمدنی سے اپنی ضروریات زندگی پوری کر لیتے ہیں۔

ایسے علاقوں میں اللہ تعالیٰ کے فضل سے مکاتب کا سلسلہ شروع کیا ہے، بحمد اللہ جہاں کچھ مدت سے کام ہو رہا ہے، وہاں سے مکتب سے تکمیل کے بعد حافظ، عالم بنانے کے لیے بڑے اداروں میں بچوں کو بھیجنے کی کوشش بھی ہو رہی ہے اور نتائج سامنے آرہے ہیں اور مزید اچھے نتائج کی امید ہے۔ ان شاء اللہ۔

اس قسم کی کئی آبادیوں سے مکاتب شروع کرنے کی درخواستیں آئی ہوئی ہیں، اس کے علاوہ مخلصین فکر مند علماء اور دعوت وتبلیغ کے ساتھیوں کی سروے رپورٹ میں چند ڈرانے والے اور چونکانے والے اعداد وشمار سامنے آرہے ہیں۔

ایسے چھوٹے اور دور افتادہ علاقوں میں قیام وطعام کا نظم نہ ہونے کی وجہ سے معلمین حضرات روزانہ سائیکل، موٹر سائیکل، پیدل، بس، آٹو رکشہ غرض جو میسر آتا ہے، اس کے ذریعہ آمد و رفت کرتے ہیں، بعض معلمین روزانہ ۸۰ / کیلومیٹر تک کا سفر کرتے ہیں۔

اس پس منظر میں ہماری کچھ الجھنیں ہیں، اس کا شرعی حل مطلوب ہے، اس طرح

کی آبادیوں میں قیام مکاتب اور عبادت گاہ کے لیے مالیات کی بھی بڑی مقدار میں ضرورت پیش آتی ہے، جس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

① معلمین، مدرسین کی ماہانہ متعینہ تنخواہ، جن میں حسب ضرورت اضافے بھی ہوتے رہتے ہیں۔

② معلمین اور نگران حضرات کے مصارف سفر۔

③ اس طرح کی غربت زدہ بستیوں کے پڑھنے والے بچوں بچیوں کو سال میں ایک یا دو مرتبہ کپڑوں کے مصارف۔

④ مدرسین کو سال میں دو مرتبہ راشن اور ایک مرتبہ دیئے جانے والے کپڑوں کے مصارف۔

⑤ امراض کے موقعہ پر مدرسین اور ان کے اہل خانہ کے لیے علاج ومعالجہ کے مصارف۔

⑥ جن مدرسین کی شادی نہیں ہوئی ہے، ان کی شادی کے موقع پر حسب وسعت تعاون کے مصارف۔

⑦ معلمین اور نگران حضرات کی آمدورفت کے لیے سائیکل اور موٹر سائیکل کی خریدی اور اس کے نباہ کے مصارف۔

⑧ بہت سی آبادیوں میں اب تک کھلی زمین پر آسمان کے نیچے یا درخت کے سایہ میں تعلیمی سلسلہ ہے، وہاں عبادت گاہ یا مکتب بقدر ضرورت تعمیر یا ٹین کے شیڈ کے مصارف۔

⑨ بعض آبادیوں میں بعض مرتبہ بچوں کو اور ان کے والیوں کو راشن وغیرہ دینا

بھی ضروری ہوتا ہے، ورنہ گمراہ فرقے اس راہ سے ایمان کا سودا کرتے ہیں، یہ تو ہو گئی مصارف کی تفصیلات۔

اب اس کے مقابلہ میں ہمارے پاس بطور خرچ آنے والی رقوم کی تفصیلات حسب ذیل ہیں:

کچھ آبادیوں میں بچوں اوران کے والیوں پر محنت کی گئی، سمجھایا گیا تو اپنی غربت کے باوجود ۱۰/۲۰ روپئے فیس کے عنوان سے کچھ والیوں نے دینے پر رضامندی کا اظہار کیا ہے اور کچھ حضرات اپنی رقم حسبِ وسعت جمع کرواتے ہیں، بعض جگہوں پر دین کے متعلق غفلت کی وجہ سے غربت کی بناء پر بسا اوقات دس بیس روپئے فیس کے خاطر بچوں کو مکتب میں بھیجنا بند کردیتے ہیں۔ اس کے علاوہ مصارف کی تکمیل کے لیے مسلمانوں کو اپیل کی جاتی ہے، چندہ کیا جاتا ہے، حالات دکھائے جاتے ہیں، حالات سے واقف کیا جاتا ہے، تعلقات کو بھی استعمال کیا جارہا ہے، دعائیں کرتے بھی ہیں اور کرواتے بھی ہیں، اس کے باوجود مصارف کی تکمیل کے لیے فیس اور عطیات کی (ﷲ) رقم نہایت قلیل مقدار میں حاصل ہوتی ہے، جس سے مجموعی بجٹ کا ۲۰/ فیصد بھی پورا کرنا مشکل ہوتا ہے، زیادہ تر مسلمان زکوۃ، صدقات کی رقم پیش کرنے کی بات کرتے ہیں۔

مذکورہ بالا حالات کے پیش نظر آں محترم ہماری رہبری فرمائیں کہ صدقہ، زکوۃ کی رقم ان کاموں کے لیے وصول کی جائے یا نہ کی جائے اوران کو مذکورۂ بالا ضروریات کی تکمیل میں استعمال کرنے کا کیا طریقہ ہوگا، جس میں معطین کی زکوۃ صحیح طریقے سے ادا بھی ہوجاوے اور ان کے اجر میں کوئی کمی نہ آوے۔

امید ہے کہ کوئی آسان شکل جس میں بڑی دشواری کا سامنا بھی نہ کرنا پڑے اور لوگوں کو بھی اپنی دی ہوئی زکوۃ کی ادائیگی کے سلسلہ میں کامل یقین، کامل اعتماد اور بھروسہ رہے بتلا کر ممنون فرمائیں، اور اس طرح کے کاموں کے لیے بھی اگر زکوۃ کی رقم دی جاتی ہے اور آپ کے بتلائے ہوئے طریقہ پر عمل کیا جاوے تو مزید اجر کے مستحق ہو ایسی کوئی فضیلت آپ کے ذہن میں ہو تو اس کو بھی ضرور تحریر فرمائیں؛ تاکہ چندہ دہندگان پوری رضاء ورغبت کے ساتھ ہمارا تعاون فرمائیں۔

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

مالداروں کو اپنے مال میں سے جو زکوۃ نکالنے کا حکم دیا گیا ہے، یہ فقراء کا ایک حق ہے، اس حق کی ادائیگی اسی وقت تام ہوگی جب زکوۃ اپنے مصرف میں صرف ہو، خود اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں زکوۃ کے آٹھ مصارف متعین فرمادیے ہیں، ﴿إنما الصدقات للفقراء والمسکین﴾(التوبة:٦٠) صدقات تو دراصل حق ہے فقیروں کا، مسکینوں کا۔

لہٰذا صاحب مال کی شرعی ذمہ داری ہے کہ اپنا مالِ زکوۃ صحیح مصرف میں صرف کرے، آج کل جہاں زکوۃ کی ادائیگی میں کوتاہی عام ہے وہیں صحیح مصرف کی جستجو میں لاپرواہی بڑھتی جاتی ہے۔

زکوۃ وصدقات ادا کرنے سے مقصود محتاج کی حاجت پورا کرنا ہے، صاحب مال کو تو فرصت نہیں کہ مصرف کی تلاش کرنے میں ہر ممکن کوشش کرے، اللہ تعالے کے کچھ بندے ایسے ہیں جو تن، من اور دل وجان سے اپنا قیمتی وقت فارغ کرکے، صحیح مصرف تلاش کرکے اہل مال کی توجہ مبذول کراتے ہیں، درحقیقت اہل مال ان کے

احسان مند ہیں، حاجت مند کی ضرورت پوری کرنے میں بہت ثواب ہے، یہ حاجت جس درجہ کی ہوگی، اسی قدر اس پر ثواب مرتب ہوگا، مصیبت زدہ اور حاجتمندوں کی ضرورت پورے کرنے پر بے شمار فضائل احادیث میں وارد ہوئے ہیں۔

چند احادیث نقل کی جاتی ہیں:

ابن عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے: والله يحب اغاثة اللهفان. (فضائل صدقات ۱/۱۲۵) اللہ تعالی مصیبت زدہ لوگوں کی مدد کو محبوب رکھتا ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ مسلمانوں کا بہترین گھر وہ ہے جس میں کوئی یتیم ہو، اور اس کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا جاتا ہو، اور بدترین گھر وہ ہے جس میں کوئی یتیم ہو اور اس کے ساتھ برا برتاؤ کیا جاتا ہو۔

ایک حدیث میں ہے: جو شخص میری امت میں سے کسی شخص کی حاجت پوری کرے؛ تاکہ اس کو خوشی ہو اس نے مجھ کو خوش کیا، اور جس نے مجھے خوش کیا اس نے اللہ جل شانہ کو خوش کیا، اور جو شخص حق تعالی شانہ کو خوش کرتا ہے وہ اس کو جنت میں داخل فرمادیتا ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ جو شخص کسی مصیبت زدہ آدمی کی مدد کرتا ہے اس کے لیے تہتر ۷۳/ درجے مغفرت کے لکھے جاتے ہیں، جن میں سے ایک درجہ سے تو اس کی درستگی ہوتی ہے (یعنی لغزشوں کا بدلہ ہو جاتا ہے) باقی بہتر/ ۷۲ درجے رفع درجات کا سبب ہوتے ہیں۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ مخلوق ساری کی ساری اللہ تعالی کی عیال ہے، آدمیوں میں سب سے زیادہ محبوب اللہ جل شانہ کے نزدیک وہ ہے جو اس کی عیال کے ساتھ

اچھا برتاؤ کرے۔ مخلوق ساری کی ساری اللہ تعالی کی عیال ہے مشہور حدیث ہے۔

(فضائل صدقات ۱/ ۱۲۸، ۱۲۹)

قرآن شریف میں نیک لوگوں کے اوصاف عالیہ ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ویطعمون الطعام علی حبه مسکینا ویتیما واسیرا﴾(الدھر) اور وہ اللہ تعالی کی محبت کے خاطر مسکینوں، یتیموں اور قیدیوں کو کھانا کھلاتے ہیں۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کی تفسیر میں تحریر فرماتے ہیں:

یعنی اہل جنت کے یہ انعامات اس سبب سے بھی ہیں کہ وہ دنیا میں مسکینوں، یتیموں اور قیدیوں کو کھانا کھلاتے تھے، حرف علی بمعنی مع ہے، مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ ایسی حالت میں بھی غریبوں کو کھانا کھلاتے جب کہ وہ کھانا خود اپنے لیے بھی ان کو محبوب اور پسند ہے، یہی نہیں کہ اپنے سے زائد فالتو کھانا غریبوں کو دیدیں، مسکین اور یتیم کو کھانا کھلانے کا عبادت اور ثواب ہونا تو ظاہر ہے۔ قیدی سے مراد ظاہر ہے کہ وہ قیدی ہے جس کو اصول شرعیہ کے مطابق قید میں رکھا گیا ہے خواہ وہ کافر ہو یا مسلمان مجرم؛ مگر بہر حال اس کو کھانا کھلانا حکومت اسلامی کی ذمہ داری ہے، جو شخص اس کو کھانا کھلاتا ہے وہ گویا حکومت اور بیت المال کی اعانت کرتا ہے اس لیے قیدی چاہے کافر بھی ہو اس کو کھانا کھلانا ثواب ہوگا، خصوصاً ابتدائے اسلام میں تو قیدیوں کا کھانا پینا اور ان کی حفاظت عام مسلمانوں میں تقسیم کر کے ان کے ذمہ کر دی جاتی تھی جیسے غزوۂ بدر کے قیدیوں کے ساتھ معاملہ کیا گیا۔ (معارف القرآن ۸/ ۶۳۸)

حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب اللہ جل شانہ نے ان آیات میں قیدی کے ساتھ احسان کرنے کا حکم فرمایا ہے، حالاں کہ اس وقت قیدی مشرک تھے تو مسلمان

قیدی کا حق تجھ پر اور بھی زیادہ ہو گیا۔ (فضائل صدقات ۱/ ۴۵)

غور کرنے کا مقام ہے کہ مسلمان بھائیوں کو قید کرنے والے کافر، قیدیوں کو جسمانی تکلیف پہنچا سکتے ہیں، بہت بہت تو قتل کر دیں گے؛ لیکن ایمان سلب کر کے ان کو کافر بنانے کی ان میں قدرت نہیں، بایں ہمہ وہ قیدی قابل رحم ہیں، قرآن واحادیث میں ان پر انفاق مال کی مستقل فضیلت ہے، ان کی خبر گیری اہل ایمان کی ذمہ داری ہے، تو بھلا ہمارے جو مسلمان بھائی گمراہ فرقوں کی زد میں ہیں، قادیانی اور عیسائی مشنریاں ان کو مرتد بنانے کی فکر میں ہیں، ایسے مسلمان ان قیدیوں سے زیادہ قابل رحم ہیں، ان کا ایمان بچانا اور دینی تعلیم سے ان کو روشناس کرانا ہمارا اسلامی فریضہ ہے۔

وما يتعلق به سعادة ابدية ونجا ة عقباوية وهى من اجل المنافع.

(هدايه۱/ ٦٠٧)

آپ نے استفتاء میں للہ رقم سے مصارف پورے نہ ہونے کا شکوہ کیا ہے، یہ واقعۃً صحیح ہے۔ مال کی محبت اس قدر غالب ہے کہ مقدار واجب (چالیسواں حصہ) بھی ادا کرنا بڑا بوجھ لگتا ہے، حالاں کہ مالداروں پر زکوۃ کے علاوہ بھی مالی حقوق ہیں۔ فضائل صدقات میں ہے:

بعض تابعین جیسا کہ امام نخعی رحمۃ اللہ علیہ وشعبی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ حضرات اس طرف گئے ہیں کہ مال میں زکوۃ کے علاوہ بھی حقوق واجب ہیں، ان حضرات کے نزدیک مالدار کے ذمہ واجب ہے کہ جہاں کہیں ضرورت مند کو دیکھے تو زکوۃ سے زائد سے بھی اس کی حاجت کو پورا کرے؛ لیکن فقہ کے اعتبار سے صحیح یہ ہے کہ اگر کہیں کوئی شخص اضطرار

کے درجہ کو پہنچ گیا ہو تو اس کی ضرورت کا پورا کرنا فرض کفایہ ہے۔ (فضائل صدقات ۱/ ۲۶۲)

ہمارے اسلاف نے مسئلۂ اضطرار کو خوب سمجھا اور عمل کر کے بتلایا، ان کی زندگی ہمارے لیے اسوہ ہے، جو مالدار ہر سال عمرہ اور نفلی حج کرتے ہیں، ان کے لیے حسب ذیل واقعہ میں بڑا اسبق ہے:

حضرت عبد اللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ بڑے عالم باعمل محدث ومفسر ہونے کے ساتھ ساتھ مجاہد وقت تھے، ایک سال درس حدیث دیتے، ایک سال تجارت کرتے اور ایک سال جہاد کرتے، حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے جلیل القدر شاگرد تھے، اس لیے ہم حنفیوں کے امام ومقتداء ہیں، ان کا واقعہ ہے۔

حضرت مولانا مفتی محمد تقی صاحب عثمانی دامت برکاتہم ہر سال حج کرنے والے مالداروں کو حدود شرعیہ اور دین کے ہر حکم کو اس کے مقام پر رکھنے کی دعوت دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

حضرت عبد اللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ ایک مرتبہ حج پر تشریف لے جارہے تھے، ایک قافلہ بھی ساتھ تھا، راستہ میں ایک قافلہ والوں کی ایک مرغی مرگئی، قافلے والوں نے وہ مرغی کوڑے کے ڈھیر میں پھینک دی، حضرت عبد اللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ قافلہ والوں سے کچھ پیچھے تھے، انہوں نے دیکھا کہ قافلے والے تو اس مرغی کو پھینک کر چلے گئے، اتنے میں قریب کی بستی سے ایک لڑکی نکلی، وہ تیزی سے اس مردہ مرغی پر جھپٹی، اور اس کو اٹھا کر ایک کپڑے میں لپیٹا، اور جلدی سے بھاگ کر اپنے گھر چلی گئی، حضرت عبد اللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ یہ سب دیکھ رہے تھے، بہت حیران ہوئے کہ اس مردہ مرغی کو اس طرح رغبت کے ساتھ اٹھا کر لیجانے والی لڑکی کون ہے؟ چناں چہ

حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ بستی میں اس لڑکی کے گھر گئے، اور پوچھا کہ وہ کون ہے؟ اور اس طرح وہ مردہ مرغی اٹھا کر کیوں لائی ہے؟ جب بہت اصرار کیا تو اس لڑکی نے بتایا کہ بات دراصل یہ ہے کہ میرے والد صاحب کا انتقال ہوگیا ہے، جو ہمارے گھر میں واحد کمانے والے تھے، میری والدہ بیوہ ہیں، میں تنہا ہوں، اور لڑکی ذات ہوں، اور گھر میں کھانے کو کچھ نہیں ہے، ہم کئی روز سے اس حالت میں ہیں جس میں شریعت نے مردار کھانے کی اجازت دی ہے، چناں چہ اس کوڑے میں جو کوئی مردار پھینک دیتا ہے، ہم اس کو کھا کر گزارہ کر لیتے ہیں، یہ سن کر حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کے دل پر چوٹ لگی، انہوں نے سوچا کہ یہ اللہ تعالی کے بندے تو اس حالت میں زندگی گزار رہے ہیں، کہ مردار کھا کھا کر گزارہ کر رہے ہیں، اور میں حج پر جا رہا ہوں، چناں چہ اپنے معاون سے پوچھا کہ تمہارے پاس کتنے پیسے ہیں؟ اس نے بتایا کہ ہمارے پاس دو ہزار دینار ہیں، آپ نے فرمایا کہ ہمیں واپس گھر جانے کے لیے جتنے دینار کی ضرورت ہے، تقریباً بیس دینار، وہ رکھ لو، باقی سب اس لڑکی کو دے دو، اور ان دینار سے اس کے گھر والوں کو جو فائدہ ہوگا، اللہ تعالی کی رحمت سے امید ہے کہ اللہ تعالی حج سے زیادہ ثواب عطا فرمائیں گے، یہ کہہ کر آپ گھر کی طرف واپس لوٹ گئے۔ (خطبات عثمانی ۳/۱۷۷، ۱۷۸)

گمراہ فرقے قادیانی اور عیسائی مشنریاں متحد ہو کر پسماندہ اور دین سے دور قوم کو لقمۂ تر بنانے کے درپے ہیں، طاغوتی طاقتیں جن کی ڈور باہر کے شیاطین کے ہاتھ میں ہے، اسلام اور مسلمانوں پر کاری ضرب لگانے کی فکر میں ہیں، ایسے قابل رحم غربا اجتماعی طور پر حالت اضطرار سے کم نہیں۔

اس لیے دینی مکاتب زکوۃ وخیرات کا بہترین مصرف ہیں، اس میں دینی نشر واشاعت کا ثواب بھی ہے، حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ دائماً اپنی زکوۃ وخیرات اہل علم پر ہی خرچ کرتے تھے، اور فرماتے تھے کہ میں درجۂ نبوت کے بعد علماء کے درجہ سے افضل کسی کا مرتبہ نہیں دیکھتا ہوں، اگر اہل علم تنگ دست ہو گئے تو دینی خدمت نہ ہو سکے گی، نتیجۃً امور دینیہ میں نقص آجائے گا، لہذا علمی خدمت کے لیے ان کو فارغ و بے فکر کر دینا سب سے بہتر ہے۔

وكان ابن المبارك يخصص بمعروفه أهل العلم، فقيل له لو عممت، فقال: إني لاأعرف بعد مقام النبوة أفضل من مقام العلماء، فإذا اشتغل قلب أحدهم بحاجة لم يتفرغ للعلم ولم يقبل على التعلم فتفريغهم للعلم أفضل.

(احياء العلوم، الوظيفة الثامنة،باب أن يطلب لصدقتة من تزكو به الصدقة الخ ١/ ١٩٧)

زکوۃ ادا کرنے میں ایک کوتاہی یہ بھی دن بدن بڑھتی جارہی ہے کہ سال پورا ہونے کے باوجود اہلِ مال زکوۃ ادا نہیں کرتے اور رمضان کا انتظار کرتے ہیں؛ تا کہ ثواب زیادہ حاصل ہو، حالاں کہ فوری تقاضے سامنے ہیں، مصرف کے اہم مواقع موجود ہیں، زکوۃ وصول کر کے صحیح مصرف میں لگانے والے بے چین ہیں، پھر بھی اہل مال کو ان کی ضروریات پورا کرنے اور زکوۃ کا اہم فریضہ ادا کرنے کی فرصت نہیں، یہ طریقہ بھی قابل اصلاح ہے۔

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم فرماتے ہیں:

بعض اوقات لوگ یہ کرتے ہیں کہ مثلاً زکوۃ تو یکم رجب کو فرض ہوگئی؛ لیکن ابھی

زکوۃ ادا نہیں کر رہے ہیں، بلکہ اس انتظار میں بیٹھے ہیں کہ جب رمضان المبارک آئے گا، اس وقت زکوۃ نکالیں گے، کیوں؟ اس لیے کہ رمضان المبارک میں زکوۃ نکالنے سے ستّر گنا ثواب زیادہ ملے گا، ارے بھائی! اگر آپ پر یکم رجب کو زکوۃ واجب ہو چکی ہے، اور ایک آدمی بے چارہ بھوکا ہے، اس کو تو فوری کھانے کی ضرورت ہے، اور تم رمضان کے انتظار میں بیٹھے ہو کہ جب رمضان آئے گا تو زکوۃ نکالیں گے، یہ بات سمجھ لیں کہ بیشک رمضان میں زکوۃ نکالنے سے ثواب زیادہ ہوگا؛ لیکن اس سے زیادہ ثواب اس میں ہے کہ ایک مسلمان کی کوئی فوری ضرورت ہے، تو اس فوری ضرورت کی تکمیل کے لیے آپ زکوۃ دے دیں گے، تو انشاء اللہ اس پر زیادہ ثواب ملنے کی توقع ہے؛ لہٰذا زکوۃ کی ادائیگی کے لیے رمضان کے انتظار میں بیٹھے رہنا یہ بھی کوئی ضروری نہیں؛ بلکہ اگر پہلے بھی ضرورت کا موقع سامنے آئے تو رمضان سے پہلے زکوۃ دے دینا بہتر ہے۔ (خطبات عثمانی ۲/۲۴۹)

سال کے متفرق اوقات میں زکوۃ کی ادائیگی میں جانبین کے لیے سہولت ہونے کے ساتھ ساتھ چند مصالح بھی ہیں، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب نور اللہ مرقدہ کا وقیع مشورہ غور سے پڑھئے، فرماتے ہیں:

اگر ساری زکوۃ ایک ہی وقت ادا کرنا مقصود ہو تو اس کی اچھی صورت یہ ہے کہ کوئی سا ایک مہینہ زکوۃ ادا کرنے کا معین کرلے اور بہتر یہ ہے کہ افضل مہینوں میں سے مقرر کرے؛ تاکہ اس میں خرچ کرنے سے ثواب میں زیادتی ہو، جیسا کہ مثلاً محرم کا مہینہ ہے کہ وہ سال کا شروع مہینہ ہونے کے علاوہ اشہر حرم میں سے ہے اور اس میں ایک دن یعنی عاشورہ کا ایسا ہے کہ اس میں صدقہ کرنے کی اور اہل وعیال پر خرچ میں وسعت

کی فضیلت آئی ہے، لہذا اس مہینہ میں اگر ادا کرے تو بہتر یہ ہے کہ دسویں تاریخ کو ادا کرے، یا مثلاً رمضان المبارک کا مہینہ ہے، احادیث میں آیا ہے کہ حضور اقدس ﷺ جود و بخشش میں تمام آدمیوں سے بڑھ کر تھے، اور ماہ رمضان میں تو آپ کی بخشش اور جود ایسی تیزی سے چلتی تھی جیسا کہ تیز ہوا؛ نیز اس مہینہ میں لیلۃ القدر ہے جو ہزار مہینوں سے افضل ہے؛ نیز اللہ تعالی کی نعمتیں بھی اس مہینہ میں اپنے بندوں پر روز افزوں ہوتی ہیں، اسی طرح ذوالحجہ کا مہینہ بھی بڑی فضیلت والے مہینوں میں ہے، اس میں حج ہوتا ہے، اس میں ''ایام معلومات'' ہیں یعنی عشرہ ذی الحجہ، اور ''ایام معدودات'' ہیں: یعنی ایام تشریق، اور ان دونوں میں اللہ تعالی کی یاد کی ترغیب قرآن پاک میں آئی ہے، پس اگر کوئی رمضان کو متعین کرے تو اس کا عشرۂ آخر مناسب ہے، اور ذی الحجہ کو مقرر کرے، تو اس کا عشرۂ اول بہتر ہے، بندۂ ناکارہ زکریا کا مشورہ یہ ہے کہ ہر شخص کو اپنی زکوۃ کا تقریبی اندازہ تو ہوتا ہی ہے اس لیے سال کے شروع ہی سے ضرورت کے مواقع پر اس انداز کی رعایت رکھتے ہوئے تھوڑا تھوڑا دیتا رہے اور جب سال وجوب کا ختم ہو اس وقت اپنے مال کا اور اپنی زکوۃ کا پورا حساب لگالے، اگر کچھ کمی رہ گئی ہو تو اس وقت پوری کردے اور کچھ زیادہ ادا ہو گیا تو اللہ تعالی کا شکر ادا کرے کہ اسی کی توفیق تھی کہ واجب سے بھی زیادہ ادا ہو گیا۔

اس میں تین مصلحتیں ہیں:

اول: تو یہ ہے کہ پوری رقم اگر مقدار میں زیادہ ہوئی تو بڑی رقم کا بیک وقت خرچ کرنا اکثر طبیعت پر بار ہو جاتا ہے اور زکوۃ کے ادا کرنے میں طیب نفس سے خرچ کرنے کو بہت زیادہ اہمیت ہے۔

دوسری مصلحت: یہ ہے کہ ضرورت کے مواقع ہر وقت میسر نہیں ہوتے، اس طرح ادا کرنے میں ضرورت کے مواقع پر خرچ ہوتا رہے گا، اور اگر سال کے ختم پر حساب کر کے اس خیال سے اس کو علیحدہ رکھے گا کہ وقتاً فوقتاً خرچ کرتا رہوں گا تو اس میں ایک تو ہر دن تاخیر ہوتی رہے گی۔ دوسرے اس کا اطمینان نہیں کہ ادائیگی سے پہلے کوئی حادثہ جانی یا مالی پیش نہ آجائے اور زکوۃ واجب ہوجانے کے بعد ادا نہ ہونے میں سب کے نزدیک گناہ ہے۔

تیسری مصلحت: یہ ہے کہ وقتاً فوقتاً ادا کرتے رہنے میں اگر آدمی کے بخل نے زیادہ زور نہ کیا تو امید یہ ہے کہ مقدار واجب سے کچھ زیادہ اکثر ادا ہوجایا کرے گا جو مرغوب چیز ہے، اور بیک وقت حساب لگا کر اس پر اضافہ کرنا بہت سے لوگوں کو دشوار ہوگا۔ (فضائل صدقات ۱/ ۲۶۴،۲۶۵)

اس تمہید وتحریض کے بعد استفتاء کا جواب ملاحظہ کیجیے:

زکوۃ وصدقات واجبہ کے لیے تملیک ضروری ہے، یعنی مستحق زکوۃ کو مال کا مالک بنانا رکن ہے۔

ہدایہ میں ہے: ولا يكفن بها ميت لإنعدام التمليك وهو الركن.

(هدایه۱/ ۲۲۲، باب من يجوز دفع الصدقات)

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

قرآن کریم میں زکوۃ کو صدقہ کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے، ﴿إنما الصدقات للفقراء﴾ اور صدقہ کے معنی حقیقی یہی ہیں کہ کسی فقیر حاجت مند کو اس کا مالک بنا دیا جائے، کسی کو کھانا دینا یا رفاہ عام کے کاموں میں خرچ کر دینا حقیقی معنی کے اعتبار سے

صدقہ نہیں کہلاتا۔

شیخ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ نے فتح القدیر میں فرمایا: کہ حقیقت صدقہ کی بھی یہی ہے کہ کسی فقیر کو اس مال کا مالک بنا دیا جائے، اسی طرح امام جصاص رحمۃ اللہ علیہ نے ''احکام القرآن'' میں فرمایا کہ لفظ صدقہ تملیک کا نام ہے۔ (جصاص ۲/ ۱۵۲ بحوالہ معارف القرآن ۴/ ۴۱۱)

دیگر یہ کہ ادائیگیٔ زکوۃ کے لیے ضروری ہے کہ زکوۃ کے عوض کوئی منفعت حاصل نہ کی جائے۔

قطع المنفعة عن المملك من كل وجه لله تعالى.

(تنویر الابصار مع در مختار شامی ۳/ ۱۷۳)

اسی وجہ سے تدریس کے عوض اجرت میں زکوۃ دینا جائز نہیں؛ لہذا صورت مسئولہ میں واجب التملیک رقم کی تملیک کے بغیر معلمین، مدرسین کی ماہانہ تنخواہ میں دینا جائز نہیں، اس کے علاوہ دیگر ضروریات مثلاً مدرسین کے مصارف سفر، آمدورفت کے لیے سائیکل، موٹر سائیکل، راشن وکپڑوں کے مصارف، شادی کے موقع کی ضروریات میں زکوۃ وصدقاتِ واجبہ کی رقم تملیکاً دینا جائز ہے، بشرطیکہ جن کو رقم زکوۃ دی جارہی ہے وہ مصرف زکوۃ ہوں، مالک بن جانے کے بعد وہ حضرات اپنی ضروریات میں صرف کر سکتے ہیں، مصرف زکوۃ وہ شخص ہے جس کی ملک میں چھ سو بارہ گرام اور تین سو پچاس ملی گرام چاندی یا اتنا نقد روپیہ یا اتنی قیمت کا مال اور حوائج اصلیہ سے زائد سامان نہ ہو۔ مگر یہ یاد رہے مذکورہ صورت میں سائیکل اور موٹر سائیکل کے معلمین خود مالک ہیں، آئندہ تدریس سے مستعفی ہو جائیں تو ان سے سائیکل اور موٹر سائیکل واپس نہیں لے سکتے۔

اسی طرح اس مد سے بچوں کو کپڑے اور ان کے والیوں کو راشن دینا بھی درست ہے اگر وہ مستحق زکوۃ ہوں۔ بصورت دیگر شرعی حیلہ کے بعد دیں، شرعی حیلہ یہ ہے کہ مستحق زکوۃ کو کہا جائے کہ کسی کے پاس سے قرض لے کر فلاں کار خیر میں تو اپنی طرف سے صرف کر دے، ہم تیرے قرض کی ادائیگی کا انتظام کر دیں گے، وہ قرض لے کر اس کارِ خیر میں دے دے، پھر زکوۃ کی رقم کا اس کو مالک بنا دیا جائے، اس سے وہ اپنا قرض ادا کر دے۔ (ماخوذ از فتاویٰ سنگرہ جدید ۳/ ۲۶۳)

اگر قرض والا حیلہ کسی وجہ سے مشکل ہو تو مکتب کے ذمہ داران میں مستحق، سمجھ دار، مسائل سے واقف شخص کو مالک بنا کر مصرف میں صرف کرنے کی ترغیب دے سکتے ہیں۔ حیلہ مذکورہ کے بعد تنخواہ، تعمیر، ٹین کے شیڈ وغیرہ میں استعمال کرنے میں حرج نہیں۔

فتاویٰ محمودیہ میں ہے: زکوۃ اور چرم قربانی کو تعمیر یا تنخواہ میں یا وقفی کتب و قرآن شریف خریدنے میں صرف کرنا جائز نہیں؛ البتہ مستحق طلبہ کے وظائف میں صرف کرنا درست ہے کہ ان طلباء کے کپڑے وغیرہ بنا دیے جائیں، اگر متولیٔ مکتب یا مہتمم غریب اور مستحق ہو اور مالکان، زکوۃ یا قیمت چرم قربانی ان کو دیدیں اور مالک بنا دیں تو اس کو از خود تنخواہ یا تعمیر وغیرہ میں صرف کرنا درست ہوگا۔ اسی طرح اگر کسی غریب مستحق کو دے کر قبضہ کرا دیں اور وہ اپنی طرف سے مکتب کے لیے دے دے، تب بھی مکتب کی جمیع ضروریات میں صرف کرنا درست ہے، یہ حکم ہے زکوۃ اور قیمت چرم قربانی کا۔

(فتاویٰ محمودیہ کراچی ۹/ ۵۹۵،۵۹۶)

ایسی صورت میں زکوۃ دینے والے کو زکوۃ ادا کرنے کا ثواب اور مستحق کو مکتب میں دینے کا ثواب ملے گا یعنی دونوں اجر عظیم کے مستحق ہوں گے۔

درمختار میں ہے:وقدمنا أن الحيلة أن يتصدق على الفقير ثم يأمره بفعل هذا الأشياء، قوله:(ثم يأمره الخ) ويكون له ثواب الزكاة وللفقير ثواب هذه القرب بحر (شامی، کتاب الزکاۃ، باب المصرف ۳ /۲۹۳)

اگر معلمین مستحق ہیں تو تنخواہ کے علاوہ ان کو زکوۃ دی جاسکتی ہے، جس کی صورت یہ ہے کہ ان کے تقرر کے وقت تنخواہ کی ایک مقدار بحیثیت اجرت مقرر کرلی جائے، وہ تو ان کو مقررہ وقت پر ملتی رہے گی؛ لیکن ہنگامی ضرورت مثلاً شادی کے مصارف، ان کے یا ان کے اہل وعیال کے علاج ومعالجہ کے مصارف وغیرہ کے لیے زکوۃ کی رقم براہ راست بھی دے سکتے ہیں۔

ایک شکل یہ بھی ہے کہ معلم صاحب سے اجارہ کا معاملہ ہی نہ کیا جائے، وہ لوجہ اللہ بچوں کو پڑھائیں، امامت کرائیں، حسب موقع اور حسب ضرورت ان کی تمام ضروریات زکوۃ کی رقم سے پوری کردی جائے۔

حضرت مولانا مفتی محمد تقی صاحب عثمانی دامت برکاتہم کے فتاوی ''فتاوی عثمانی'' سے ایک سوال وجواب نقل کیا جاتا ہے:

سوال: بچوں کو دینی تعلیم دینے کے لیے ایک مولوی صاحب مقرر ہیں، محلے کے بچے ایک دو گھنٹہ قرآن پڑھ کر اپنے گھروں کو چلے جاتے ہیں، مدرسہ کی جانب سے طعام وقیام کا انتظام نہیں ہے، کیا عوام انہیں زکوۃ، فطرہ، چرم قربانی کی رقم سے تنخواہ دے سکتے ہیں؟ ایسی صورت میں زکوۃ وغیرہ ادا ہوجائے گی۔

جواب: زکوۃ سے مذکور معلم صاحب کی تنخواہ شرعاً نہیں دی جاسکتی، ہاں اگر وہ مستحق زکوۃ ہوں یعنی ان کی ملکیت میں ساڑھے باون تولہ چاندی یا اس کی قیمت کا زائد از

ضرورت سامان نہ ہو تو تنخواہ کے علاوہ ان کو زکوۃ دی جا سکتی ہے، یعنی تنخواہ الگ مقرر ہو اور زکوۃ اس کے علاوہ دی جائے، یا پھر معلم صاحب کی کوئی تنخواہ مقرر نہ ہو وہ توجہ سے پڑھائیں، پھر جس شخص کو جتنی زکوۃ دینے کا موقع ملے انہیں دے دیا کرے؛ لیکن مقررہ نہیں ہوگی۔ (فتاوی عثمانی ۲/ ۱۴۴) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: عبد القیوم راجکوٹی، ۱۵/ رجب ۱۴۳۴ھ

الجواب صحیح: العبد احمد عفی عنہ خانپوری　　　الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ

کیا سفرائے مدارس عاملین یا ابن السبیل میں داخل ہیں؟

سوال: (۱) حیلۂ تملیک کے لیے مندرجۂ ذیل کی صورت میں شرعی کیا حکم ہے؟ سفرائے مدرسہ سفر کی حالت میں جو چندہ مدرسہ کے لیے وصول کرتے ہیں، ان سے اگر مہتمم مدرسہ یہ کہہ دے کہ آپ چندہ وصول کرنے کے بعد اپنی تملیک میں لے کر اپنے ہی جانب سے اس رقم کو مدرسہ میں داخل کر دیں، کیا یہ حیلہ درست ہے؟ اور اس حیلہ کے بعد ضروریات مدرسہ وطلباء کے لیے صرف کرنا درست ہوگا یا نہیں؟ اس لیے کہ کتب فقہ میں ہے: "فیکون الثواب لهما كذا في بناء المسجد" اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ مزکی کی زکوٰۃ ادا ہو کر اور حیلۂ تملیک کے بعد، معطی اور مزکی دونوں کو ثواب ملتا ہے، اور اس طرح کے حیلہ کے بعد تعمیر مسجد و مدرسہ اور تکفین میت میں اس رقم کا استعمال کرنا جائز ہے، تو کیا یہ مسئلہ درست ہے؟ مدلل و مفصل جواب مرحمت فرمائیں۔

(۲) مہتمِ مدرسہ و ناظمِ مدرسہ جو کہ خود صاحب زکوٰۃ و نصاب ہوں تو یہ حضرات

خود چندہ کی غرض سے شرعی مسافت طے کر کے شرعی مسافر ہو کر ابن السبیل کے تحت خود مال زکوٰۃ (چندہ) کو اپنی تملیک میں لے کر مدرسہ کے تمام ضروریات میں صرف کر سکتے ہیں یا نہیں؟ کیوں کہ بہ نص قطعی ابن السبیل مصارف زکوٰۃ میں سے ایک مصرف ہے، اس لحاظ سے کیا یہ حیلہ تملیک کا مسئلہ درست ہوگا یا نہیں؟ شرعاً اس کا کیا حکم ہے؟ مدلل و مفصل جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً

① حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ ''تفسیر معارف القرآن'' ۳۹۹/۴ پر تحریر فرماتے ہیں: تفصیلِ مذکور سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ آج کل جو اسلامی مدارس اور انجمنوں کے مہتمم یا ان کی طرف سے بھیجے ہوئے سفیر صدقات، زکوٰۃ وغیرہ مدارس اور انجمنوں کے لیے وصول کرتے ہیں، ان کا وہ حکم نہیں جو عاملینِ صدقہ کا اس آیت میں مذکور ہے.......... وجہ یہ کہ یہ لوگ (مہتمم اور سفراء) فقراء کے وکیل نہیں، بلکہ اصحاب زکوٰۃ مالداروں کے وکیل ہیں، ان کی طرف سے مالِ زکوٰۃ کو مصرف پر لگانے کا ان کو اختیار دیا گیا ہے، اسی لیے ان کا قبضہ ہو جانے کے بعد بھی زکوٰۃ اس وقت تک ادا نہیں ہوگی جب تک یہ حضرات اس کو مصرف پر خرچ نہ کر دیں.......... اور جب تک یہ اس مال کو مصرف پر خرچ نہ کر دیں ان کا قبضہ ایسا ہی ہے جیسا کہ زکوٰۃ کی رقم خود مال والے کے پاس رکھی ہو۔

مندرجۂ بالا عبارت سے معلوم ہوا کہ سفراء اربابِ اموال کے وکیل ہیں، تو ان کا ذمہ یہ ہے کہ وہ کسی حقدار کو اس کا مالک بنائیں، نہ یہ کہ خود مالک بن بیٹھیں، اس

لیے مہتمم کا ان کو یہ ہدایت صادر کرنا کہ خود اپنی تملیک میں لے کر اپنی جانب سے مدرسہ میں داخل فرمادیں، درست نہیں ہے۔

(۲) جواب نمبر ا؍ میں مہتمم کی حیثیت واضح ہو چکی ہے، اس لیے اس کا بھی وہی حکم ہے۔ مزید براں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ ابن السبیل کے متعلق فقہاء نے تصریح کی ہے، اگر اس کو اپنی ضرورت کے بقدر قرض مل جاتا ہے تو زکوٰۃ نہ لینا مناسب ہے، اور زکوٰۃ لینے والی صورت میں بھی صرف اتنی مقدار لینا جائز ہے جس سے اس کی ضرورت پوری ہو کر وہ اپنے وطن تک پہنچ جائے۔

وقال في الفتح ايضا ولا يحل له أى لا بن السبيل أن يأخذ أكثر من حاجته، والاولى له أن يستقرض إن قدر ولا يلزمه ذلك (شامی۲/ ۶۷)

البتہ اگر مہتمم یا سفیر غریب ومحتاج ہیں، اور صاحب مال ان کو یہ کہہ کر زکوٰۃ دیتا ہے کہ میں آپ کو دے رہا ہوں آپ جس طرح چاہیں کر سکتے ہیں، مثلاً تعمیرِ مسجد میں، البتہ اس صورت میں صاحبِ مال کو زکوٰۃ دینے کا ثواب ملے گا اور مہتمم یا سفیر کو مسجد میں لگانے کا۔

ويكون له ثواب الزكوٰة وللفقير ثواب هذه القرب (شامي ۲/۶۹) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: احمد عفی عنہ خانپوری، ۶؍ ذوالقعدہ ۱۴۱۴ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

حیلۂ زکوٰۃ میں مصرف پر دباؤ ڈالنا صحیح نہیں

سوال: حیلۂ زکوٰۃ میں زکوٰۃ کی رقم دیتے ہوئے اگر یہ شرط لگائی جائے کہ

روپیہ ہمیں واپس لوٹا دینا، اگر لوٹاؤ گے نہیں تو سزا دی جائے گی، یا واپس نہ کرنے پر جرمانہ عائد کیا جائے گا، تو کیا اِس طرح شرط لگانا درست ہے؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

من عليه الزكوٰة لو أراد صرفها إلى بناء المسجد والقنطرة لا يجوز، فإن أراد الحيلة فالحيلة أن يتصدق به المتولي على الفقراء، ثم الفقراء يدفعونه إلى المتولي، ثم المتولي يصرف إلى ذلك كذا في الذخيرة (عالمگیری)

کسی مصرف کو مجبور کرنا اور اُس پر دباؤ ڈالنا درست نہیں۔ (فتاوی محمودیہ ۳/۳۰) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: احمد عفی عنہ خانپوری

مدارس میں رائج حیلۂ زکوۃ کا حکم

سوال: ایک مدرسہ ہے جس میں دورۂ حدیث تک کی تعلیم ہے، اُس میں بالغ و نابالغ طلباء زیر تعلیم ہیں، یہ طلباء جب مدرسہ میں داخل ہوتے ہیں تو اُن سے خوراکی فیس کہہ کر کھانے کی فیس متعینہ مثلاً: تین سو روپیہ ماہانہ وصول کی جاتی ہے، اگر طالبِ علم کی حیثیت کمزور ہوتی ہے اور وہ خوراکی فیس مکمل نہیں ادا کرسکتا ہے، اور وہ مستحقِ زکوۃ ہے، تو اُس کو مُدِ زکاۃ سے رقم تملیکاً دے کر بقیہ خوراکی فیس وصول کی جاتی ہے، اور بچوں کو خوراکی فیس کے عوض مطبخ میں بٹھا کر کھلایا جاتا ہے، کسی بچے کو کھانا مطبخ سے باہر لے جانے کی بالکل اجازت نہیں ہے، ایک روٹی بھی باہر نہیں لے جاسکتا۔ اب سوال یہ ہے کہ خوراکی فیس کے عوض مذکورہ طریقہ سے کھلانے میں شرعاً کوئی حرج

ہے یا نہیں؟ نیز ہر جمعہ کو تقریباً ایک تہائی بچے ایک دن یا زیادہ کھانا نہیں کھاتے، بعض بچے بیماری وغیرہ کی وجہ سے کم وبیش ایام کھانا نہیں کھاتے، اِس کے باوجود خوراکی فیس میں کوئی کمی نہیں ہوتی تو شرعاً اِس کا کیا حکم ہے؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

خوراکی فیس کا مطلب تو یہی ہے کہ پورا مہینہ جو کھانا فیس ادا کرنے والے طالب علم کو دیا جاتا ہے وہ قیمتاً دیا جارہا ہے، اور خوراکی فیس کے نام سے جو رقم اُس سے وصول کی گئی وہ اُس کھانے کی قیمت ہے؛ اِس لیے اگر کوئی طالب علم اپنا کھانا کمرہ پر لے جانا چاہے تو اُس کو اِس کا حق حاصل ہونا چاہیے؛ نیز اگر مہینہ میں ایک دن یا اِس سے زیادہ کھانا نہیں کھایا تو اِس حساب سے رقم واپس لینے کا اُس کو اختیار ہوگا۔

ہمارے مدارس میں جو طریقہ رائج ہے جس کی تفصیل آپ نے سوال میں لکھی ہے، وہ شرعی اعتبار سے درست نہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: احمد عفی عنہ خانپوری

داخلہ فارم میں توکیل بالصرف کا کالم پُر کرواکر حیلۂ تملیک سے نجات درست نہیں

سوال: مدارس میں صدقاتِ واجبہ، زکوۃ کی جو رقوم آتی ہیں اُس کے خرچ کے لیے مختلف حیلے اختیار کیے جاتے ہیں، تو اگر مندرجۂ ذیل طریقہ اختیار کیا جائے تو شرعاً اِس میں کوئی حرج ہے یا نہیں؟

وہ طریقہ یہ ہے کہ: تمام بالغ ونابالغ طلباء مہتمم مدرسہ کو زکوۃ کی رقم اپنے جملہ مصارف میں خرچ کرنے کا وکیل بنادیں، پس مہتمم جس طرح طلباء کی طرف سے زکوۃ وغیرہ صدقاتِ واجبہ پر قبضہ کرنے کا وکیل ہے۔ (بقول حضرت مفتی شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ) اِسی طرح وہ طلباء کی جانب سے جملہ مصارفِ مدرسین وملازمین کی تنخواہیں، تعمیرات، خرید کتب، لائٹ بل وغیرہ میں بن جائے، جس کی صورت یہ ہو کہ داخلہ کے وقت داخلہ فارم میں ایک کالَم پُر کروایا جائے جس میں طالبِ علم مہتممِ مدرسہ کو صراحۃً وکیل بناوے۔

اب سوال یہ ہے کہ: کیا اِس طرح داخلہ فارم میں کالَم پُر کروانے سے مہتمم، طلبہ کی جانب سے خرچ کرنے کا وکیل بن جائے گا؟ اور کیا مہتمم کو صدقاتِ واجبہ کی رقوم مدرسہ کے اخراجات میں بلا حیلۂ تملیک صَرف کرنے کا اختیار ہوگا؟

(الجواب): حامداً ومصلیاً ومسلماً

سوال میں مذکور طریقہ جس میں طالبِ علم مہتممِ مدرسہ کو صراحۃً اپنے مصارف میں صَرف کرنے کا وکیل بنائے، اِس صورت میں طالبِ علم کی وہ ضروریات جن میں وہ چیز اُس کے حوالہ کردی جاتی ہے، مثلاً: کھانا (جہاں کمرہ پر دیا جاتا ہے)، لباس وغیرہ؛ اِن کی تکمیل میں جو صَرف ہوا اُس میں زکوٰۃ کی ادائیگی کا حکم لگانا قابلِ اشکال نہیں؛ لیکن جو رقم خریداریٔ کتب میں صَرف ہوئی یا تعمیر میں صَرف ہوئی، وہاں پر اشکال یہ ہے کہ اِن کی رقم سے خریدی ہوئی کتابیں مالک بنا کر اُن کے حوالہ نہیں کردی جاتیں؛ بلکہ عاریۃً دی جاتی ہیں، جو سال ختم ہونے پر واپس وصول کرلی جاتی ہیں، جب اِن کتابوں کو اِن کی رقوم سے خریدا گیا تو گویا وہ طلباء مشترکہ طور پر اِس کے

مالک بنے، اب یہ کتابیں اُن سے واپس لے کر مدرسہ میں رکھ لینا کیا معنی رکھتا ہے؟ تعمیرات میں خرچ ہونے والی رقوم کا بھی یہی حال ہے۔

بہر حال داخلہ فارم میں توکیل بالصرف کا کالم پُر کروا کر حیلۂ تملیک سے مکمل طور پر نجات مل جانا سمجھ میں نہیں آتا۔

نیز ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ''لا یحل مال امرء مسلم إلا بطیبة نفس منه'' کی وجہ سے بھی اشکال پیدا ہوتا ہے کہ، یہ خانہ پُری اپنے داخلہ کی ضرورت کی وجہ سے بدرجۂ مجبوری نہ کی جا رہی ہو؛ اِس لیے کہ اِس کو معلوم ہے کہ اگر مَیں یہ خانہ پُری کر کے منتظمِ مدرسہ کو وکیل بالصَّرف نہیں بناؤں گا تو میرا داخلہ نہیں ہوگا۔

پھر مدرسہ میں موجود طلباء کی طرف سے وکیل بالصرف ماننے کی صورت میں حسبِ ضابطہ یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ، ہر ایک کی طرف سے یکساں طور پر وکیل بالصرف ہے، جس کا مطلب یہ ہوا کہ مذکورہ رقوم میں سے جتنی رقم خرچ ہوئی وہ اِن طلباء پر تقسیم مان کر ہر ایک کے حصہ میں جتنی آتی ہے، گویا اُس نے اُتنی مقدار کے صرف کا مہتمم کو وکیل بنایا؛ حالاں کہ تمام طلباء کی ضروریات یکساں نہیں، مثلاً دورۂ حدیث میں پڑھنے والے طالبِ علم کو پڑھانے والے اساتذہ کو جو تنخواہ دی جاتی ہے، اُس کی مقدار ابتدائی درجات میں پڑھنے والے طلباء کے اساتذہ کو دی جانے والی تنخواہ کی مقدار سے زیادہ ہے، یا مثلاً اِس سال مدرسہ میں جو تعمیرات ہوئیں وہ اِس سال میں پڑھنے والے طلباء کی رقوم سے ہوئیں، اب جب وہ مدرسہ چھوڑ کر جا رہے ہیں اور اِن کی مملوکہ چیز یہیں محبوس ہے، اُن کو اِس کا کوئی معاوضہ بھی نہیں دیا جا رہا ہے، اور اُن سے یہ بھی نہیں درخواست کی جاتی کہ اِن تعمیرات میں آپ کا جو حصہ ہے وہ آپ مدرسہ کو ہبہ کر دیں،

توتوکیل کے اِس مضمون سے مسئلہ کیسے حل ہوگا؟ بلکہ یہاں تو یہ اشکال ہوگا کہ ایک کے مال کو دوسرے کی ضروریات میں خرچ کردیا گیا، جب کہ قدیم زمانہ کے حیلۂ تملیک میں یہ اشکالات پیش نہیں آتے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

املاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۷/ رجب المرجب ۱۴۲۵ھ
الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ

زکوٰۃ سے تنخواہ دینا

(سوال): اُدھنا پریم نگر جھونپڑ پٹی میں مکتب کی شکل میں مدرسہ شروع کیا ہے، مسلمانوں کے ۳۰/ گھر ہیں، سب غریب اور مزدور طلبہ ہیں، چار سو روپیہ مہینے کا پڑھانے کے لیے معلم رکھا ہے، ایک کارخانے والے صاحب نے معلم کی تنخواہ دینے کے لیے کہا ہے، لیکن پیسے زکوٰۃ کے ہیں، تو کیا زکوٰۃ کے پیسے میں سے معلم کی پگار دے سکتے ہیں یا نہیں؟

(الجواب): حامداً ومصلیاً ومسلماً

زکوٰۃ کی رقم کسی معلم کی تنخواہ میں دینا درست نہیں ہے، اگر دیں گے تو زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی؛ البتہ اگر وہ معلم غریب ہے، تو اس کو ویسے ہی بغیر کسی عوض کے اس رقم کا مالک بنایا جاسکتا ہے؛ مگر اس کے عوض اس سے کسی قسم کی خدمت لینا جائز نہیں ہے۔ (شامی ۲/ ۳۴۴) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۳/ ربیع الاول ۱۴۱۱ھ
الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

تنخواہ میں زکوۃ کی رقم بلا تملیک صرف کرنا

سوال: زکوۃ وصدقات کی رقم کو مدرسہ میں استاذ کی تنخواہوں میں اور ملازمین کی تنخواہوں میں نیز مہمان نوازی اور دیگر ضروریات جیسے تعمیر، پکوان کے لیے گیس یا لکڑی کے لیے بغیر تملیک کے استعمال کرنا کیسا ہے؟ ایسے مدارس کو زکوۃ یا صدقات دینا چاہیے یا نہیں؟ مفصل جواب تحریر کریں۔

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

زکوۃ وصدقات کی رقم براہ راست (بلا تملیک شرعی) اساتذہ کی تنخواہوں، مہمان نوازی وغیرہ میں استعمال کرنا درست نہیں ہے ایسا کرنے سے زکوۃ ادا نہیں ہوئی جس ادارہ کے متعلق معلوم ہو کہ وہاں ایسا معاملہ ہوتا ہے وہاں اپنے زکوۃ وصدقات دینے سے بچنا ضروری ہے۔ اگر دیں گے تو زکوۃ ادا نہ ہوگی۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۰ / ربیع الاول ۱۴۱۴ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

مدرسہ کے طلبہ کو زکوٰۃ دی جائے؟

سوال: مدرسہ میں جو رقم بطور زکوٰۃ کے دی جاتی ہے، اس کے حیلہ کے لیے غریب طلباء کو دینا ہی ضروری ہے یا مالدار کو بھی دے کر کے حیلہ کر سکتے ہیں؟ نیز جو رقم للہ دی گئی ہے، اس رقم کے ذریعہ سے مدرسہ کی بلڈنگ وغیرہ باندھ سکتے ہیں یا بلڈنگ کے لیے مستقل چندہ کرنا ضروری ہے؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

وہ رقم جس طالب علم کو دی جارہی ہے اس کا مستحقِ زکوٰۃ ہونا ضروری ہے، اب اگر وہ طالبِ علم بالغ ہے، تو اتنا کافی ہے کہ خود اس کی ملکیت میں بقدرِ نصاب کچھ نہ ہو، چاہے اس کا باپ مالدار ہی کیوں نہ ہو، اور اگر وہ طالب علم نابالغ ہے تو اس صورت میں اگر اس کا باپ مالدار (مالکِ نصاب) ہے تو زکوٰۃ ادا نہ ہوگی۔

ولا إلى طفله بخلاف ولده الكبير (درمختار) (قوله ولا إلى طفله) أي الغني، فيصرف إلى البالغ ولو ذكرا صحيحا، قهستاني فأفاد أن المراد بالطفل غير البالغ ذكرا كان أو انثىٰ في عيال أبيه أو لا على الاصح (شامی ۲/۷۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

اسکول کے غیر مستطیع طلبہ کے لیے زکوۃ صدقات لینا

سوال: واپی میں ایک اردو میڈیم اسکول ہے جس میں دینی دنیوی دونوں تعلیم ہوتی ہے پونے تین سو طلبہ زیر تعلیم ہیں مستطیع طلبہ سے سو روپیہ فیس وصول کی جاتی ہے اور فیس سے ہی اساتذہ کی تنخواہیں لائٹ بل وغیرہ بہ مشکل پوری ہوتی ہے اور غیر مستطیع بچوں سے کوئی فیس نہیں ہے؛ بلکہ انتظامیہ کتاب وغیرہ کا بھی حتی الامکان انتظام کرتی ہے۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ مذکورہ بچوں کی فیس قلم کاغذ وغیرہ میں صدقات زکوۃ وغیرہ رقوم استعمال کر سکتے ہیں یا نہیں؟ بہر صورت تفصیلاً جواب درکار ہے۔

نوٹ: اسکول میں قیام وطعام کا انتظام نہیں ہے۔

(الجواب): حامداً ومصلیاً ومسلماً

جب اس ادارہ میں مقیم طلبہ موجود نہیں ہیں تو ان کے لیے زکوۃ وصدقات کی وصولیابی درست نہیں، ارباب اموال کو غیر مستطیع طلبہ کی امداد کی طرف متوجہ کیا جائے کہ وہ لوگ بہ راہ راست ان طلبہ یا ان کے اولیاء کی امداد زکوۃ وصدقات کی رقوم سے کریں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

أملاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۸؍رمضان المبارک ۱۴۲۲ھ
الجواب صحیح: عباس داود بسم اللہ

چندہ کی رقم ملکیت کی صورت میں مہتمم استعمال کرسکتا ہے؟

(سوال): مدرسہ کی چندہ کی رقومات کا مالک مہتمم کو بنا دینے کی صورت میں کیا مہتمم ان رقومات کو اپنی ذاتی استعمال کے لیے اسکوٹر، موٹر کار یا ان رقومات کو پاور لوم میں استعمال کرسکتا ہے؟

(الجواب): حامداً ومصلیاً ومسلماً

اگر زکوٰۃ دینے والے نے مہتممِ مدرسہ کو یہ کہہ کر مال زکوٰۃ دیا کہ میں آپ کو زکوٰۃ کا مالک بنا رہا ہوں، آپ جہاں چاہیں استعمال کرسکتے ہیں، تو اس صورت میں مہتمم اپنی مرضی سے جہاں خرچ کرنا چاہے اس کو اختیار ہے، اور اگر مہتمم کو یہ رقم طلبہ کی خدمات میں خرچ کرنے کے لیے دی گئی ہے، تو اس صورت میں مہتمم اس رقم کو امورِ مذکورہ فی السوال میں خرچ نہیں کرسکتا۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

سفرائے مدارس کو زکوۃ دینے کی مقدار

سوال: بفضلہٖ تعالیٰ ہمارے یہاں سالانہ زکوۃ کی رقم بہت زیادہ ہوتی ہے، ہم لوگ بہت سارے مدارس کے سفیروں (چندہ کرنے والوں) کو سالانہ خرچ کے اعتبار سے مختلف (۵۰۰، ۴۰۰، ۲۰۰) روپئے دیتے ہیں؛ لیکن بہت سے ہمارے (پڑوسی) اعتراض کرتے ہیں کہ بہت سوں کو دینے سے کیا فائدہ؟ بلکہ کم کو زیادہ رقم عطا کرو؛ تاکہ ان کا فائدہ ہو، حالاں کہ اس زمانہ میں سفراء پر اعتبار کم ہوتا ہے؛ لہٰذا اس صورت میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ مشورہ سے مطلع فرمائیں۔

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں: مسئلہ: اگر کسی شخص نے کسی شخص کو اپنے گمان کے مطابق مستحق اور مصرف زکوۃ سمجھ کر زکوۃ دیدی، بعد میں معلوم ہوا کہ وہ اسی کا غلام یا کافر تھا، تو زکوۃ ادا نہیں ہوگی، دوبارہ دینی چاہیے؛ کیوں کہ غلام کی ملکیت تو آقا ہی کی ملکیت ہوتی ہے، وہ اس کی ملک سے نکلا ہی نہیں، اس لیے زکوۃ ادا نہیں ہوئی، اور کافر زکوۃ کا مصرف نہیں ہے۔

اس کے علاوہ اگر بعد میں یہ ثابت ہو کہ جس کو زکوۃ دی گئی ہے، وہ مالدار یا سید ہاشمی یا اپنا باپ یا بیٹا یا بیوی یا شوہر ہے، تو زکوۃ کے اعادہ کی ضرورت نہیں؛ کیوں کہ رقم زکوۃ اس کی ملک سے نکل کر محل ثواب میں پہنچ چکی ہے، اور تعین مصرف میں جو غلطی کسی اندھیرے یا مغالطہ کی وجہ سے ہوگئی وہ معاف ہے۔ (درمختار) (معارف القرآن ۴/ ۴۱۳)

"آپ کے مسائل اور ان کا حل" میں ہے: زکوۃ ادا کرتے وقت اگر گمان

غالب تھا کہ یہ شخص زکوۃ کا مستحق ہے تو زکوۃ ادا ہوگئی۔ (آپ کے مسائل اور ان کا حل ۳/ ۳۹۸)

اس لیے سفراء کے متعلق جب تک ان کے صحیح ہونے کا یقین یا غالب گمان نہ ہو، ان کو زکوۃ نہ دی جائے۔

رہا مشورہ دینے والوں کا آپ حضرات کو یہ مشورہ دینا کہ مختلف جگہ پر تھوڑا تھوڑا دینے کے بجائے ایک جگہ پر زیادہ دیا جائے، یہ ان کی ایک سوچ ہے، اگر آپ کو ان کا یہ مشورہ ٹھیک معلوم ہوتا ہے، تو عمل کر سکتے ہیں، کوئی ضروری نہیں، ویسے بھی آپ تنہا ان کو زکوۃ کی رقم نہیں دے رہے ہیں؛ بلکہ اور حضرات بھی دیتے ہیں، اور اسی طرح وہ بھی تنہا آپ سے زکوۃ وصول نہیں کر رہے ہیں؛ بلکہ اور لوگوں کے پاس بھی جاتے ہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

املاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۶/ رجب المرجب ۱۴۳۰ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ   الجواب صحیح: عبد القیوم راجکوٹی

کس مدرسہ میں زکوۃ دی جائے؟

سوال: جس مدرسہ میں حافظ، قاری، مولوی، مفتی بنتے ہوں، اس مدرسہ میں زکوۃ کی رقم استعمال کرنا جائز ہے؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

جہاں غریب ومحتاج طلبہ کے قیام وطعام کا نظم ہو، وہاں زکوۃ کی رقم دی جا سکتی ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

معلموں کو زکوۃ دینا

سوال: معلموں کو زکوۃ اور خیرات کی رقم حیلہ کر کے تنخواہ دی جا سکتی ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً

اگر معلم حضرات محتاج ہوں اور بقدر نصاب مال کے مالک نہ ہوں تو زکوٰۃ کی رقم براہِ راست بطور زکوۃ (نہ کہ بطور تنخواہ) دی جا سکتی ہے، حیلہ کس قسم کا ہے، یہ معلوم ہونے پر اس کا حکم بتلایا جا سکتا ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۸ / جمادی الاخریٰ ۱۴۱۲ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

زکوۃ کا استعمال کس نوع کے طالب علم کے لیے درست ہے؟

سوال: زید کہتا ہے کہ بیت المال (زکوۃ) کا روپیہ مدرسہ میں تعلیم حاصل کرنے والوں میں سے وہی لڑکے کھا سکتے ہیں جو بالکل نادار اور مفلس ہوں، اور جن کے والدین نہ ہو، اور جن کے والدین زندہ ہیں اور وہ حیثیت والے ہیں اور وہ لوگ اب لڑکوں کو تعلیم کے لیے مدرسہ میں داخل کر دے تو ان لڑکوں کے لیے زکوۃ کا پیسہ کھانا بالکل ناجائز اور حرام ہے، اور ان کے والدین کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنی اولاد کو زکوۃ کا پیسہ کھلاوے، لہٰذا ان کے والدین سے ان لڑکوں کی فیس طعام وصول کی جائے گی، اگر فیس ادا نہ کرے گا تو گویا وہ اپنے لڑکوں کو ناجائز پیسہ کھلا رہا ہے جو گناہ کا سبب ہے، اور اس کے بالمقابل عمر کہتا ہے کہ مدرسہ میں داخل ہونے والے ہر لڑکے کے لیے

بلا کراہت مدرسہ کا کھانا پینا بالکل جائز ہے، کوئی گناہ والی بات نہیں ہے؛ کیوں کہ مدرسہ میں آنے کے بعد سب بچے برابر ہیں چاہے غریب کا لڑکا ہو یا لاکھ پتی، کروڑ پتی کا لڑکا ہو، سب کھا سکتے ہیں، ہاں اگر ان کے والدین بخوشی بچوں کا خرچہ دینا چاہیں تو ایک سے لاکھ تک مدرسہ میں دے سکتے ہیں، مدرسہ ان کے اوپر زبردستی نہیں کرے گا کہ آپ کو اپنے بچوں کی فیس ادا کرنی ہوگی، نہیں تو آپ کے بچوں کے لیے مدرسہ میں کھانا وغیرہ بالکل ناجائز ہے، اب ان میں کونسی بات درست ہے؟

(الجواب): حامداً ومصلیاً ومسلماً

جو طالب علم بالغ ہونے کے ساتھ خود صاحب نصاب نہیں ہے، تو اس کے لیے زکوۃ لینا درست ہے، چاہے اس کا باپ غنی ہو اور صاحب نصاب کیوں نہ ہو؛ البتہ اگر وہ طالب علم بالغ نہیں ہے؛ بلکہ نابالغ ہے اور اس کا باپ غنی اور صاحب نصاب ہے تو اس کو زکوۃ دینا درست نہیں ہے۔

درمختار میں ہے: ولا إلى طفله (أي الغني) بخلاف ولده الكبير وأبيه وامرأته الفقراء وطفل الغنية، فيجوز لانتفاء المانع (درمختار۲/ ۷۲)

اس کی شرح کرتے ہوئے علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ رقمطراز ہیں: (قوله: ولا إلى طفله) أي الغني فيصرف إلى البالغ لو ذكرا صحيحا قهستاني فأفاد أن المراد بالطفل غير بالغ ذكرا كان أو أنثى، في عيال أبيه أو لا، على الأصح؛ لما أنه يعد غنيا بغناه نهر (قوله: بخلاف ولده الكبير) أي البالغ كما مر الخ. (شامی۲ /۷۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری ۱۹/ محرم الحرام ۱۴۱۳ھ
الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

مقسِّمِ زکوۃ ادارہ کے مصارف میں زکوۃ استعمال کرنا

سوال: ایک ادارہ ضرورت مند افراد میں تقسیم کرنے کے لیے سالانہ زکوۃ کی مد میں تقریباً ڈیڑھ، دولاکھ روپئے جمع کرتا ہے، اس تمام رقم کے حساب، کتاب کے لیے اس کو قوانین کے مطابق چیریٹی کمشنر (انکم ٹیکس ڈپارٹمنٹ) دفتر میں آڈیٹ کرواکے پیش کرنا پڑتا ہے، ان تمام کاموں میں تقریباً دس سے پندرہ ہزار روپے خرچ ہوتے ہیں، اور ان اخراجات کے لیے اس زکوۃ کی رقم کے علاوہ اور کوئی رقم نہیں ہوتی ہے، اس صورت میں ان اخراجات کے لیے زکوۃ کی رقم استعمال کرنے کا شرعی طریقہ تحریر فرمائیے، اس کے لیے حیلہ کی کیا صورت ہوگی؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

کوشش تو یہی ہونی چاہیے کہ دفتری کاموں کے مصارف کے لیے عطیات مل جائیں، اتنا بڑا ادارہ جو سالانہ دولاکھ کی رقم بمد زکوۃ جمع کر کے غرباء میں تقسیم کرتا ہے، اس کے دفتری مصارف کے لیے دس، پندرہ ہزار کی رقم بمد عطیات آسانی سے حاصل ہوسکتی ہے؛ البتہ کوشش ضروری ہے، لیکن اگر اس کے باوجود ایسی رقم حاصل نہ ہو تو پھر کسی ایسے مستحقِ زکوۃ کو جو ادارہ کے کام سے دل چسپی رکھتا ہے اور اس کی مالی امداد کرنا چاہتا ہے؛ لیکن مالی حیثیت نہ ہونے کی وجہ سے عاجز ہے اس کو بطورِ قرض کوئی آدمی دس، پندرہ ہزار دے اور وہ غریب قرض لی ہوئی اس رقم کو برضاورغبت ادارہ کو بطور عطیہ دے، اس کے بعد اس غریب مقروض کو بمد زکوۃ دس، پندرہ ہزار دیے

جائیں اور وہ اس سے اپنا قرض ادا کردے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۳/ ربیع الثانی ۱۴۱۸ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

نابالغ بچوں کے ذریعہ تملیک زکوۃ

سوال: نابالغ بچوں کی تملیک کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ کیا ان کی تملیک کا اعتبار ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً

نابالغ بچوں کا باپ اگر غنی (صاحب نصاب) ہے تو ان کو زکوۃ دینا درست نہیں ہے، اور اگر ان کے باپ فقراء و مساکین ہیں تو ان کو مالک بنانے سے زکوۃ ادا ہوجائے گی۔ (درمختار شامی ۲/ ۷۲)

لیکن اس کے بعد وہ رقم ان نابالغ بچوں سے فیس کے طور پر تو وصول کی جاسکتی ہے؛ لیکن ان کی طرف سے بطورِ عطیہ مدرسہ میں جمع نہیں کی جاسکتی، اس لیے کہ نابالغ بچہ کا یہ تصرف درست نہیں۔ (کما ھو مصرح فی کتاب الحجر والمأذون من الفقہ) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

محصّل چندہ نے خود ہی تملیک کر کے تنخواہ وصول کر لی

سوال: (۱) ایک استاذ نے - جو خود مستحقِ زکوۃ و چرمِ قربانی ہے - مدرسہ کی رسید پر زکوۃ و چرم قربانی کا پیسہ وصول کیا اور بجائے اس کے کہ مدرسہ کے ذمہ دار کو دیتا اور

وہ تملیک کرا کر اس کو تنخواہ دیتے، اس نے خود اپنے ہاتھ سے تملیک کر کے اپنی تنخواہ میں شامل کرلیا بایں طور کہ چندہ کر کے لایا اور مصرفِ زکوۃ و چرم قربانی ہونے کی وجہ سے پیسہ پر بلا واسطہ خود قبضہ کرلیا اور اس کے بعد دل میں ارادہ کرلیا کہ روپیہ میں نے مدرسہ میں دے دیا اور اس کے بعد اس کو تنخواہ میں شامل کرلیا، سوال یہ ہے کہ اس طرح کی تملیک کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ آیا یہ تملیک کافی ہے یا ذمہ دار کے حوالہ کرنا پڑے گا اور وہ تملیک کرا کر دے گا تب تنخواہ میں لینا درست ہوگا؟ مکمل و مدلل تحریر فرمائیں۔

(۲) اگر کوئی استاذ مدرسہ کی رسید پر چرم قربانی وزکوۃ کا پیسہ لایا اور کسی بچہ کے ہاتھ سے تملیک کرا کے تنخواہ میں لے لیا تو یہ جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

(۱) ذمہ دار کو دینا ضروری ہے، خود ہی تملیک کر کے اپنی تنخواہ میں رکھنا درست نہیں ہے، ذمہ دار نے اس مدرس کو صرف اس کام میں اپنا وکیل بنایا ہے کہ وہ اربابِ اموال سے اس کی طرف سے زکوۃ وصول کرے۔

(۲) نہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

مکتب کے منتظمین دینی تعلیم حاصل کرنے والے بچوں کے والدین کو زکوۃ کی رقوم دے کر فیس وصول کرسکتے ہیں؟

سوال: ایک تنظیم ایک غریب علاقہ میں ایک مکتب چلاتی ہے، وہ للہ رقوم سے

لیکن اس علاقہ میں چار پانچ جگہیں ایسی ہیں کہ جہاں مکتب کی خاص ضروت ہے، اس گاؤں میں اکثر غریب ہیں، اور علاقہ میں کوئی خاص پیش امام بھی نہیں ہے، اور بچوں کی دینی تعلیم کی طرف کوئی توجہ بھی نہیں ہے؛ بلکہ وہاں مکتب کی تعلیم ہوتی ہی نہیں، در اصل تنظیم والوں کے پاس فی الحال للہ رقوم زیادہ نہیں ہے، اکثر رقوم زکوۃ وغیرہ کی ہوتی ہے، اگر مکتب کے بچوں کے والیوں کو جو صاحبِ نصاب نہ ہو کچھ رقم زکوۃ کی دی جائے اور ان کو مالک بنا کر پھر ان سے یہ کہا جائے کہ آپ اپنے بچے کی اس سے فیس ادا کر دیں، پھر وہ رقم جمع کر کے پیش امام صاحب کی (جو مکتب کے بچے پڑھاتا ہے) اس سے اس کی تنخواہ دی جاسکتی ہے؟ یا پوری رقم کو جو کوئی صاحب نصاب نہ ہو اس سے صحیح طریقہ سے حیلہ کرائیں اور وہ رقوم مسجد میں جمع کر کے پیش امام صاحب کی تنخواہ اس سے دی جاسکتی ہے یا نہیں؟ یہ عارضی طور پر ہے، اگر بعد میں للہ رقم ان شاء اللہ آ گئی تو للہ رقوم سے تنخواہ دیں گے۔

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

زکوۃ اور صدقاتِ واجبہ کی رقوم کے حقدار فقراء اور مساکین ہیں، ایسی رقوم ان کو بطورِ تملیک دے دی جائیں، وہ حضرات مالک بننے کے بعد اپنی مرضی اور اختیار سے جہاں چاہیں خرچ کر سکتے ہیں، اپنی ضروریات میں استعمال کریں، کسی کو ہدیہ دیں، مسجد یا مدرسہ میں بطورِ عطیہ دیں، ان کو اختیار ہے۔

زکوۃ اور صدقاتِ واجبہ کی رقوم کو مسجد یا مدرسہ ومکتب کے مدرسین کی تنخواہ میں استعمال کرنا جائز نہیں، اگر براہِ راست استعمال کیا گیا تو زکوۃ ادا نہ ہوگی، ایسے مدارس

جہاں دارالاقامہ میں غریب طلبہ قیام پذیر ہوتے ہیں، ان کے کھانے، پینے اور دیگر ضروریات میں اس قسم کی رقوم استعمال کی جاسکتی ہیں۔

مسلمان بچوں کی ابتدائی دینی تعلیم کا انتظام ان کے والدین اور جماعتِ مسلمین کی ذمہ داری ہے، جس طرح ان کی دیگر ضروریات کا انتظام والدین کرتے ہیں اسی طرح دینی بنیادی تعلیم کا نظم بھی ان کو کرنا چاہیے، اس کے لیے اگر مصارف برداشت کرنا پڑیں تو وہ بھی کریں، اب اگر والدین غریب اور محتاج ہونے کی وجہ سے مستحقِ زکوۃ ہونے کی صورت میں زکوۃ اور صدقات واجبہ کی رقوم سے ان کی اور ان کی اولاد کی دیگر ضروریات کو پورا کرنے کے لیے جس طرح ان کی امداد کی جاتی ہے اسی طرح ان کی اولاد کی تعلیمی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے بھی اس نوع کی رقوم سے والدین کی امداد کی جائے، اور مالک بننے کے بعد وہ اپنی رضامندی اور اختیار سے یہ رقم مکتب کے مدرسین کی تنخواہ میں دینا چاہیں تو دے سکتے ہیں۔

رہی حیلہ کرا کر دینے کی صورت تو اس سلسلہ میں حضرت مولانا مفتی اسماعیل صاحب بسم اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے ایک مطبوعہ فتوے کی نقل اس جواب کے ہمراہ منسلک کی جارہی ہے، اس کا بغور مطالعہ فرماویں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

املاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۹ / جمادی الآخرۃ ۱۴۲۲ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ

مکتب میں زکوۃ وغیرہ دینے کے بعد تلافی بہ ذریعۂ معافی

سوال: ایک مکتب جس میں کھانے والے طلبہ نہیں ہیں، کے نام سے زکوۃ وغیرہ

کی رقم مدیر مکتب وصول کرتے ہیں، جس کی مجموعی رقم لاکھوں ہوتی ہے۔ متعدد سفرائے کرام چندہ وصولی پر مقرر ہیں۔

① تو کیا اس مکتب میں زکوۃ، صدقات، فطرہ، امداد وغیرہ کی رقم دینا جائز ہے؟

② جن لوگوں نے زکوۃ کی رقم دی ہے، ان کی زکوۃ شرعاً ادا سمجھی جائے گی یا نہیں؟

③ صاحب مکتب زکوۃ دینے والوں سے معافی مانگ رہا ہے کہ میری غلطی ہے؛ لیکن زکوۃ حیلہ کر کے خرچ کی ہے، تو زکوۃ دینے والے حضرات بری الذمہ ہوں گے یا نہیں؟

④ یہ ذمہ دار مکتب عالم اور مفتی بھی ہے، لوگوں کو کہتا ہے کہ: تمھاری زکوۃ ادا ہوگئی، یہ کہنا جائز ہے یعنی صحیح ہے؟

⑤ اور کمال یہ ہے کہ یہ مفتی و عالم امامت کے فرائض بھی ادا کرتے ہیں اور مفسر بھی ہیں، تو کیا ان کی امامت و لوگوں کی تفسیر سنانا صحیح ہے یا ناجائز ہے؟

⑥ یہ صاحب دوسرے مدرسے کے بھی ذمہ دار ہیں ان کو ذمہ دار بنانا صحیح ہے؟

⑦ کچھ حضرات اس عالم و مفتی کی حمایت کرتے ہیں، ان کی حمایت صحیح ہے؟

نوٹ: ادا کنندہ حضرات کی زکوۃ اگر ادا نہیں ہوئی، تو اس کا اعادہ ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً

① ② مکتب کے مدیر اس مکتب کے لیے زکوۃ و صدقات کی رقم کیا کہہ کر وصول کرتے ہیں؟ اس کی تفصیل آپ نے سوال میں تحریر نہیں فرمائی، اگر ان کے سفرا لوگوں کو یہ بتلاتے ہوں کہ: اس مدرسہ میں کھانے والے مقیم غریب طلبہ موجود ہیں، ان کے

مصارف کے لیے زکوۃ وصدقات دیے جائیں، اور ان کی اس اپیل پر لوگ زکوۃ وصدقات کی رقم ان کو دیتے ہیں، یہ سمجھ کر کہ یہ رقم ان طلبہ کی ضروریات میں خرچ ہوگی، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ دینے والوں نے ان سفراء اور ان کے واسطے سے مدرسہ کے مدیر کو اس بات کا وکیل بنایا، کہ مالکانِ اموال کے زکوۃ وصدقات کے رقوم ان طلبہ پر خرچ کریں۔ اب جب کہ اس مدرسے میں ایسے طلبہ ہی موجود نہیں ہے، تو مدرسہ کے مدیر کو جس چیز کا وکیل بنایا گیا تھا اس کے نہ ہونے کی وجہ سے وکالت درست نہیں ہوئی، اور مدیر مدرسہ کی وکالت چوں کہ مقید تھی (یعنی جس مدرسہ کے نام سے چندہ کیا جارہا ہے اس کے طلبہ پر خرچ کرنے کا وکیل بنایا گیا تھا)، مطلقہ نہیں تھی (یعنی مدیر کو یہ کہہ کر رقم نہیں دی گئی تھی کہ وہ اپنی صواب دید سے کسی بھی مصرفِ زکوۃ میں یہ رقم خرچ کرے) اس لیے جب یہ رقوم مالکانِ اموال نے جہاں (یعنی اس مدرسہ کے کھانے والے غریب طلبہ) خرچ کرنے کا مدیر کو وکیل بنایا تھا وہاں خرچ نہ ہوئی، تو مدیر کا یہ تصرف غیر ماذون فیہ ہونے کی وجہ سے مالکان اموال کی زکوۃ ادا نہیں ہوئی، اور مدیرِ مدرسہ ان رقوم کو ایسی جگہ خرچ کرنے کی وجہ سے جہاں خرچ کرنے کا اس کو وکیل نہیں بنایا گیا تھا، ضامن ہوا۔

③ جیسا کہ اوپر بتلایا جاچکا زکوۃ ادا نہیں ہوئی؛ اس لیے مالکانِ اموال بری الذمہ نہیں ہوئے، ان پر اس کی ادائیگی باقی ہے۔ مدیرِ مکتب زکوۃ دینے والوں سے معافی مانگے اور زکوۃ دینے والے معاف کردیں، تب بھی زکوۃ کی ادائیگی مالکان کے ذمہ پر باقی ہے۔ مالکانِ اموال کے معافی دینے کا مطلب یہ ہوا کہ بے جا تصرف کی وجہ سے مدیرِ مکتب پر جو ضمان واجب ہوا وہ معاف کردیا گیا، تو اس معافی کا صرف اتنا اثر ہوگا

کہ مدیرِ مکتب کے ذمہ سے ضمان ساقط ہو جائے گا۔

④ مدیر مکتب کا لوگوں کو یہ کہنا کہ: تمھاری زکوۃ ادا ہوگئی، درست نہیں؛ اس لیے کہ لوگوں نے اس کو مطلق وکیل نہیں بنایا تھا، جیسا کہ اوپر تفصیل آچکی، لوگوں کو اس کی اس بات کے دھوکے میں نہیں رہنا چاہیے۔

⑤ مسئلہ سے واقفیت کے باوجود اس نے یہ سب حرکت کی ہے تب تو اس کے اس اقدام کا صریح معصیت ہونا ظاہر ہے، اور اس صورت میں اس کی امامت بھی مکروہ ہے، اور اگر مسئلہ سے ناواقفیت کی وجہ سے یہ سب کچھ کیا ہے تو اب جب کہ مسئلہ بتلایا جارہا ہے اس کے مطابق عمل کر لینے سے امامت پر باقی رکھے جاسکتے ہیں۔ وہ جو تفسیر سناتے ہیں وہ مستند اور معتبر تفاسیر کے حوالے سے ہے، تو ان کا یہ تفسیر سنانا درست ہے؛ ورنہ نہیں۔

⑥ دوسرے مدرسہ کی ذمہ داری صحیح طریقہ سے انجام دیتے ہیں تو ٹھیک ہے؛ البتہ اس میں مالیات کا شعبہ بھی داخل ہے، تو احتیاط ضروری ہے۔

⑦ حمایت کرنے والے حضرات بر بنائے دلیل ان کی حمایت کرتے ہیں تو بتلایا جائے، کہ وہ دلیل کیا ہے؟ ان عالم صاحب کی اس کوتاہی کو جانتے اور سمجھتے ہوئے بھی وہ حمایتی حضرات اس معاملے میں ان کو بے قصور گردانتے ہوں، تو ان کی یہ حمایت عصبیت محضہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

املاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۱/ ذوالقعدہ ۱۴۲۱ھ

الجواب صحیح: عباس داود بسم اللہ

سادات کے لیے زکوۃ لینا جائز نہیں

سوال: مَیں نسبی طور پر سید ہوں، ایک گاؤں کی مسجد میں اذان وغیرہ کی خدمت انجام دیتا ہوں، میرے اہل وعیال زیادہ ہونے کی وجہ سے موجودہ آمدنی سے گھر کا خرچ نہیں چل پاتا جس کی بناء پر مَیں بہت پریشان ہوں، تو کیا ایسی صورت میں مَیں زکوۃ اور صدقۂ فطر وغیرہ لے سکتا ہوں یا نہیں؟ اِسی طرح مسجد کی روٹی لے سکتا ہوں یا نہیں؟ اِسی طرح مجھے اپنا گھر بنانے کے لیے رقم کی ضرورت تھی تو مَیں نے چند حضرات کو خط لکھا، تو اُن لوگوں نے کچھ رقم میرے لیے بھیجی، تو کیا مَیں اُس رقم کا حیلہ کر کے اپنے گھر میں استعمال کر سکتا ہوں؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

سادات کے لیے زکوۃ جائز نہیں ہے، اِسی طرح صدقاتِ واجبہ بھی جائز نہیں ہیں۔

ولا إلى بني هاشم -إلى أن قال- وجازت التطوعات من الصدقات (درمختار) (قوله: جازت التطوعات إلخ) قيد بها ليخرج بقية الواجبات.

(شامي ۲/ ۷۳،۷۲)

صدقاتِ نافلہ جائز ہیں، مسجد کی روٹی اگر صدقاتِ نافلہ کے قبیل سے ہے تو لے سکتے ہیں، صدقۂ فطر چوں کہ صدقاتِ واجبہ میں سے ہے؛ اِس لیے زکوۃ کی طرح اِس کا بھی لینا جائز نہیں ہے، اگر کوئی سید عیال دار اور محتاج ہے تو لوگوں پر خصوصاً صاحبِ حیثیت اور اہلِ خیر حضرات کو لازم ہے کہ، وہ حضرات للہ رقوم سے سادات کی امداد کریں، اور اِن کو مصیبت وتکلیف سے نجات دلائیں، کہ بڑے اجر وثواب کا کام ہے، اور

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ صحیح محبت کی دلیل ہے؛ ورنہ مواخذہ کا اندیشہ ہے۔ (فتاویٰ رحیمیہ)

اگر حیلہ کر کے سید کو زکوۃ دی جائے تو مضائقہ نہیں، حیلہ کی صورت یہ ہے کہ کسی غیر سید غریب کو یہ کہہ کر دے دیا جائے کہ: فلاں سید کو دینا تھا؛ مگر وہ سید ہے، اُس کے لیے زکوۃ جائز نہیں؛ لہٰذا تم کو دیتے ہیں، اگر تم یہ کل یا بعض اُس کو اپنی طرف سے دے دو تو بہتر ہے، اور وہ لے کر دے دے تو سید کے لیے جائز ہے۔ (کفایت المفتی ۴/ ۲۷۲)

اگر آپ کی بیوی سادات میں سے نہیں ہے تو مناسب صورت یہ ہے کہ لوگ اُس کو زکوۃ دے دیں، پھر وہ خود آپ کے گھریلو مصارف میں استعمال کرے یا آپ کو مالک بنا دے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

سادات کو زکوٰۃ وصدقات دینا

سوال: سید خاندان کے یتیم، مسکین، بیواؤں کو بیت المال میں سے ماہانہ وظیفہ دیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ جب کہ بیت المال میں زکوٰۃ، فطرہ، صدقہ، ہدایا؛ جمع کئے جاتے ہیں، قرآن وحدیث سے جواب دیجئے؛ نیز امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اس مسئلہ میں کیا فرماتے ہیں؟ جواب دیجئے۔

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

احناف کے نزدیک زکوٰۃ اور صدقات واجبہ سادات کو نہیں دے سکتے؛ البتہ ہدیہ اور صدقاتِ نافلہ دینا جائز ہے، اس لیے بیت المال میں جو رقم ہدیہ یا صدقۂ نافلہ کے طور پر جمع ہوئی ہو، اس میں سے سادات کا وظیفہ مقرر کیا جائے۔

ولا يدفع إلى بني هاشم (هدايه)

فجروا على موجب ذلك في الواجبة الخ (فتح القدير ۲/ ۲۷۳)

وأما الصدقة النافلة فقال في النهاية: ويجوز النفل بالإجماع (ایضاً)

امام شافعیؒ کے نزدیک بھی زکوۃ کی رقم سادات کو دینا درست نہیں ہے۔

ولا يجوز دفع الزكوٰة إلى هاشمي لقولها: نحن أهل بيت لا تحل لنا الصدقة أما فالزكوٰة حرام على بني هاشم، وبني المطلب بلاخلاف الخ.

(شرح المهذب ٦ /٢٢٧)

صدقاتِ نافلہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک بھی سادات کو دینا درست ہے۔

وتحل صدقة التطوع للاغنياء، ولبني هاشم الخ (شرح المهذب٦/ ٢٣٨)

فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۵/شوال ۱۴۰۹ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

زکوۃ کی رقم سے بیوہ عورت کی لڑکیوں کا نکاح کرنا

سوال: زکوۃ کی رقم سے بیوہ عورتوں کی لڑکیوں کی شادی کرنا درست ہے یا نہیں؟ اور اِس صورت میں زکوۃ ادا ہوگی یا نہیں؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

مالک یا اُس کا وکیل زکوۃ کی رقم براہِ راست شادی کرانے میں استعمال نہیں کر سکتے، اگر کریں گے تو زکوۃ ادا نہ ہوگی؛ البتہ بیوہ عورت اگر مستحقِ زکوۃ ہے تو اُس کو مالک بنا دے، اِس کے بعد وہ عورت اپنی لڑکی کے نکاح یا دوسرے کام میں اپنی مرضی سے

خرچ کر سکتی ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

صاحب نصاب بیوہ کی زکوۃ کی ادائیگی کا طریقہ

سوال: اسماء ایک بیوہ عورت ہے، اس کے شوہر کو گزرے ہوئے ایک سال کا عرصہ ہو گیا، اسماء کی تین لڑکیاں بالغہ اور ایک نابالغ لڑکا ہے، سب کے نام سے بہت کچھ رقم جمع ہے، اس کے ساتھ سونا چاندی بھی ہے جو نصاب تک پہنچتا ہے، مرحوم کے گزرنے کے بعد مرحوم کے بھائی اسماء اور اس کے بچوں کو کھانے پینے کا سامان دیتے ہیں، دیگر اخراجات کے لیے پیسہ بہت اصرار کرنے پر کبھی کبھی دے دیتے ہیں، اور اسماء کے پاس آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں ہے، اس کے شوہر کی دولت کی جو آمدنی ہوتی ہے اس میں سے اسماء کو کچھ بھی نہیں دیا جاتا۔ دریافت طلب امر یہ کہ صورت مسئولہ میں اسماء پر اس کے بچوں کے نام سے جمع روپیوں پر اور اس کے ذاتی سونے چاندی میں زکوۃ ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

اسماء کے پاس موجود سونا چاندی نصاب تک پہنچتا ہے، تو اس پر اس سونے چاندی نیز نقد رقوم کی زکوۃ واجب ہے۔ بچوں کو اپنے والد کے ترکہ میں سے جو رقم یا سونا چاندی یا مالِ تجارت میں سے ملنے والا حصۂ وراثت نصاب تک پہنچتا ہے، تو نابالغ کو چھوڑ کر بالغہ لڑکیوں پر بھی زکوۃ واجب ہے۔ مرحوم کے بھائیوں کو چاہیے کہ ان تمام کی زکوۃ کی ادائیگی کے لیے ان کے مال میں سے پیسہ ان کو دیں؛ تاکہ یہ زکوۃ

ادا کر سکے، یا اسماء اور اس کے بچے مرحوم کے بھائیوں کو اپنی زکوۃ کی ادائیگی کے لیے وکیل بنا دیں، اس کے بعد وہ ان کے مال کی زکوۃ نکال لیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری ۲۴ رمضان المبارک ۱۴۱۹ھ

زکوۃ کی رقم تعمیری کام میں براہِ راست استعمال کرنا جائز نہیں

سوال: مہاراشٹر صوبہ میں ''بُدنیرہ'' ایک مقام ہے، جس کی مسلم آبادی تقریباً پانچ ہزار ہے، یہاں دینی تعلیم کا معقول نظم نہ ہونے کی وجہ سے آبادی کا اکثر حصہ دین سے ناواقف ہے؛ لہٰذا بڑی جدوجہد سے ایک انتظامیہ کمیٹی تشکیل پائی، جس کے تحت ایک مکتب کا قیام عمل میں آیا، مکتب میں تقریباً سو طلبہ زیرِ تعلیم ہیں، مکتب کے لیے ایک بہت پرانی عمارت تھی جو پہلے سے مکتب کے لیے وقف کی گئی تھی، جو نہایت شکستہ حالت میں تھی، انتظامیہ نے باہمی چندہ کر کے عمارت کی مَرمّت کی؛ لیکن سرمایہ کی کمی کی وجہ سے فرش کی تکمیل نہ ہو سکی، معلمین کی تنخواہ کا نظم بھی چندہ ہی سے ہوتا ہے، مکتب میں پندرہ فیصد طلبہ غرباء کے ہیں، انتظامیہ کے پاس صدقات کی رقم جمع ہے جس سے غریب طلبہ کی مدد کی جا رہی ہے، انتظامیہ یہ چاہتی ہے کہ صدقات کی رقم سے مکتب کا فرش پختہ کر دیا جائے تو کیا یہ درست ہے؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

زکوۃ کی رقم کو تعمیری کام میں براہِ راست استعمال کرنا درست نہیں ہے؛ اِس لیے کہ اِس میں تملیک ضروری ہے، آپ ایسا کر سکتے ہیں کہ جن غرباء کے بچے اِس میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں اُن میں سے چند دین دار حضرات کو یہ کہہ کر زکوۃ کی رقم دیں

کہ: یہ رقم زکوۃ کی ہے، ہم آپ کو اِس کا مالک بناتے ہیں، آپ اِس رقم کو اپنی ملک میں لینے کے بعد مدرسہ کی تعمیری ضروریات کے لیے ہمیں اپنی مرضی سے عطا فرمائیں، اب اگر وہ اِس طرح اپنی ملک میں لینے کے بعد اپنی رضامندی واختیار سے اِس کام کے لیے دیں تو اِس کا استعمال درست ہے؛ لیکن اِس معاملہ میں اُن پر جبر نہیں ہوسکتا، اگر وہ حضرات اپنی ملک میں لانے کے بعد اپنی دیگر ضروریات میں استعمال کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

زکوۃ کی رقم سے تعمیراتی کام درست ہے یا نہیں؟

سوال: زکوۃ کی رقم سے بیرونی طلبہ کے لیے دار الاقامہ کی تعمیر درست ہے یا غیر درست؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

زکوۃ کی رقم براہِ راست بغیر تملیکِ شرعی، دار الاقامہ یا کسی اَور تعمیراتی کام میں استعمال کرنا درست نہیں۔ (شامی ۲/ ۶۸) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

زکوۃ کی رقم تعمیراتی کام میں لگائی گئی تو اِس کا ذمہ دار کون؟

سوال: زکوۃ کی رقم سے بیرونی طلبہ کے لیے دار الاقامہ کی تعمیرِ نو کی گئی؛ لیکن پلان کے تحت اب تک مدرسہ جاری نہ ہوسکا، اور مستحقین طلبہ وہاں تعلیم حاصل کر رہے

ہیں، تو اِس تعمیر شدہ دار الاقامہ کو کرایہ سے دینا اور اُس کی آمدنی سے مسجد کے امام کی یا مکتب کے معلم کی تنخواہ دینا جائز ہے یا نہیں؟ نیز مسجد کی کمیٹی کا یہ فعل درست ہے یا غیر درست؟ نیز دہندگانِ زکوۃ کی زکوۃ ادا ہوئی یا نہیں؟ ادا نہ ہوئی ہو تو اُس کی ادائیگی کی صورت کیا ہوگی؟ جب کہ زکوۃ دہندگان کو زکوۃ ادا کیے ہوئے کافی عرصہ گزر گیا ہے، اور اُن کو اندرونی معاملات کی اطلاع بھی نہیں؛ لہٰذا اِس زکوۃ کی عدمِ ادائیگی کا ذمہ دار کون ہوگا؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

اگر براہِ راست بغیر تملیکِ شرعی زکوۃ کی رقم سے عمارت تعمیر کی گئی تو مالکین کی زکوۃ ادا نہیں ہوئی، جس کی ذمہ داری حضراتِ منتظمین پر عائد ہوتی ہے، اُن پر اِتنی رقم کا ضمان واجب ہے، جس کو وہ مالکین کی خدمت میں ادا کریں؛ اور مالکین ازسرِ نو زکوۃ ادا کریں، منتظمین پر لازم ہے کہ وہ مالکین کو صورتِ حال سے باخبر کریں؛ ورنہ پورا گناہ اُن پر ہوگا، حضراتِ منتظمین جب مالکین کو ضمان ادا کر دیں گے تو عمارت کی ملکیت منتظمین کی ہوگی، اور اُس کی آمدنی کو جہاں چاہیں خرچ کریں بشرطیکہ یہ عمارت اُن کی اپنی زمین میں بنائی ہو؛ لیکن ضمان کی ادائیگی سے قبل اِس آمدنی کو خرچ کرنا بھی درست نہیں۔ كما هو مقتضى الأصول والكتب الفقهية. فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

زکوۃ کی رقم سے اشیائے ضروریہ خرید کر فقیر کو دینا درست ہے

سوال: ہمارے یہاں ایک ٹرسٹ ہے جو لوگوں سے زکوۃ کی رقم وصول

کرتا ہے اور فقیروں، حاجت مندوں کی ضروریات میں صَرف کرتا ہے، اُس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ مریضوں کی دوائیاں خرید کر اُن کو دی جاتی ہیں، اِسی طرح علاج معالجہ کی فیس ٹرسٹ ادا کرتا ہے، یا مکان کی تعمیری اشیاء خرید کر غریبوں کو دیتا ہے، یا اپنی ماتحتی میں گھر کا پورا کام کرواتا ہے، اور مزدور کی مزدوری بھی زکوۃ کی رقم سے دیتا ہے، تو کیا اِس طرح زکوۃ ادا ہو جائے گی؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً

زکوۃ کی رقم سے دوائی یا اَور کوئی چیز جو فقیر کی ضرورت کی ہے خرید کر فقیر کو دینے سے بھی زکوۃ ادا ہو جاتی ہے۔ (شامی ۲/ ۲۴)

اِسی طرح اُس کے علاج معالجہ کا بِل مریض کے کہنے سے ادا کیا گیا تو زکوۃ ادا ہوگی؛ ورنہ نہیں۔ (شامی ۲/ ٦٨)

اِس لیے بہتر یہ ہے کہ معالجہ کے بِل کی رقم اُس کے ہاتھ میں دے کر یہ کہا جائے کہ: تُو اِس رقم سے یہ بِل ادا کر دے، مکان کی مَرَمّت میں جو سامان وغیرہ خریدا جاتا ہے اُس کا حکم دوائی کی طرح ہے، اور معمار وغیرہ کی مزدوری دی جاتی ہے اُس کا حکم معالجہ کے بِل کی طرح ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

زکوۃ کی رقم سے برتن خرید کر کرائے پر دینا

سوال: ایک چھوٹا دیہات ہے اس کے قریب ایک دیہات ہے، یہ چھوٹے قریہ والے پڑوس قریہ کی مسجد سے جو برتن مسجد میں کرایہ پر دیے جاتے ہیں وہ لیتے تھے پھر

کچھ معاملہ درپیش ہونے پر اس گاؤں والوں نے مسجد کے برتن کرایہ پر دینے سے انکار کیا، اب یہ گاؤں والے غریب لوگ ہیں، وہ اللہ پیسے سے خرید کر اپنی مسجد میں نہیں رکھ سکتے تو کچھ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ زکوۃ کے پیسہ کا حیلہ کر کے اس مسجد کے لیے برتن خرید کر مسجد میں رکھ دیے جائیں تو کیا یہ درست ہیں پھر گاؤں والے اس کو کرایہ پر چلائے؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

زکوۃ کی رقم سے برتن خرید کر کرایہ پر دینے کے لیے مسجد میں رکھنا درست نہیں ایسا کرنے سے زکوۃ ادا نہیں ہوگی البتہ اگر کسی غریب مستحق زکوۃ کو زکوۃ کی وہ رقم بہ طور تملیک دے دی جائے اور اس کو بتلا دیا جائے کہ تو اس رقم کا مالک ہے اب اپنے اختیار اور مرضی سے اگر اپنی طرف سے یہ رقم مسجد کو برتن خریدنے کے لیے دے دے یا خود برتن خرید کر اس مقصد کے لیے مسجد کو دے دے تو لوگوں کی یہ ضرورت پوری ہو جائے اور وہ آدمی یہ سن کر بہ رضا و رغبت ایسا کر لے تو درست ہے اور یہی شرعی حیلہ ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

املاہ: العبد احمد خانپوری، ۲۹/ذی قعدہ ۱۴۲۳ھ

زکوۃ کی رقم سے اشیائے خورد و نوش خرید کر تقسیم کرنا

سوال: ہمارے یہاں ایک تنظیم جس کے نام اہل ثروت حضرات کی طرف سے کثیر مقدار میں زکوۃ کی رقم آئی ہے تنظیم کا زکوۃ کی نقد رقم کے بہ جائے اشیائے خورد و نوش مستحقین پر تقسیم کرنا جائز ہے یا ناجائز؟ تنظیم اگر نقد رقم دیتی ہے تو اشیائے خورد و نوش پر خرچ ہونے کے بہ جائے شراب نوشی فلم بینی جوا وغیرہ غلط کاموں پر خرچ ہوتی ہے

ایسی حالت میں تنظیم کا نقد رقم کی بہ جائے اشیائے خورد و نوش تقسیم کرنا جائز ہے یا ناجائز؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً

اگر ارباب اموال نے ذمہ داران تنظیم کو اشیائے خورد و نوش خرید کر بہ طور زکوۃ تقسیم کرنے کا مجاز بنایا ہے تو تنظیم کے لیے ایسا کرنا جائز ہے ورنہ جائز نہیں ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

أملاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۱؍صفر ۱۴۲۳ھ

الجواب صحیح: عباس داود بسم اللہ

فلاحی ادارے میں زکوۃ دینا کیسا ہے؟

سوال: کسی خدمتی ادارہ یا کوئی وقف ٹرسٹ یا فاؤنڈیشن کو زکوۃ دینے سے کیا زکوۃ ادا ہو جاتی ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً

جو فلاحی ادارے زکوۃ جمع کرتے ہیں وہ زکوۃ کی رقم کے مالک نہیں ہوئے؛ بلکہ زکوۃ دہندگان کے وکیل اور نمائندے ہوئے ہیں، جب تک اُن کے پاس زکوۃ کا پیسہ جمع رہے گا وہ بدستور زکوۃ دہندگان کی مِلک ہوگا، اگر وہ صحیح مصرف پر خرچ کریں گے تو زکوۃ دہندگان کی زکوۃ ادا ہوگی؛ ورنہ نہیں۔ (آپ کے مسائل اور اُن کا حل ۳/ ۴۰۳) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

مکان بنانے کے لیے زکوۃ کی رقم دینا کیسا ہے؟

سوال: ایک شخص (زید) اپنی بیوی اور چند نابالغ بچوں کو چھوڑ کر تقریباً دس سال سے غائب ہے، تمام رشتہ داروں، متعلقین اور دیگر ذرائع کے ذریعہ تلاش کیا؛ لیکن کہیں پتہ نہ چل سکا، اور اب امید کی کوئی کرن بھی نظر نہیں آتی، زید کی بیوی گھریلو کام کاج کر کے اپنا اور بچوں کا پیٹ بھرتی ہے، میکے والوں کی بھی اِتنی حیثیت نہیں کہ مالی تعاون کر سکے، گاؤں کے اہلِ خیر حضرات زکوۃ، فطرہ سے امداد کرتے ہیں، عورت نے اُسی رقم سے تھوڑا تھوڑا جمع کر کے ۲۵ / ہزار کی رقم جمع کی، اور ایک شخص کے کاروبار میں لگائی؛ البتہ اِس سے بھی جو منافع آتے ہیں وہ اِخراجات کے لیے ناکافی ہوتے ہیں، اور اِس عورت کے پاس ذاتی مکان بھی نہیں ہے، اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ: اُس عورت کو زکوۃ، فطرہ کے ذریعہ امداد کرنا اور مکان بنا کر دینا کیا درست ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً

چوں کہ وہ عورت مالِ تجارت کی مالک ہے جس کی مقدار نصاب جتنی ہے؛ اِس لیے زکوۃ، فطرہ اُس کو دینا درست نہیں ہے؛ البتہ اُس کی اولاد میں جو بالغ ہو اُس کو زکوۃ، فطرہ کی رقم دی جاسکتی ہے، اگر اُس کو مکان کی ضرورت ہے تو مکان بنانے کے لیے اُس کو بطورِ قرض رقم دی جائے، اور بعد میں اُس قرض کی ادائیگی کے لیے زکوۃ یا فطرہ کی رقم دی جاسکتی ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

مکان بنانے کے لیے زکوۃ لینے کی صورت

سوال: احقر کا مدار معاشی اعتبار سے تنخواہ پر ہے، ۸ ۱۴ ۲ / ماہانہ ہے، سلائی وتجارت سے سالانہ اوسطاً ۳۵۰۰ / کا اندازہ ہے، گھر پر سالانہ ۵۰۰۰ / والد صاحب کو دیتا ہوں، دو مکان ہیں، جس میں ایک تو رہنے کے قابل نہیں ہے، ۳ / بھائی، ۳ / بہن ہیں، والد صاحب ۲۰۰۰۰ / کے مقروض ہیں، زمین کی آمدنی اوسطاً سالانہ آٹھ ہزار کا اندازہ ہے، بندہ کو اپنا مکان بنانا ہے، ابھی اس کے پلاٹ کی بات کی ہے ۳۰۰۰۰ / قیمت ہے، اس کے بعد پورے مکان کا خرچ ہے، پس اندازاً قریب ۳۰۰۰۰ / ہے، اہل وعیال کے جملہ مصارف (جو ۴ / نفر میرے ساتھ ملا کر ہوتے ہیں) میرے ذمہ ہیں، ان حالات میں میرے لیے زکوۃ لینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

اس وقت آپ کے لیے زکوۃ لینا جائز نہیں، اولاً آپ پلاٹ خرید کر اس میں پس انداز رقم صرف کر دیجئے، اس کے بعد قرض لے کر تعمیری کام شروع کیجیے، آپ جب مقروض بن جائیں اور اس قرض کی ادائیگی کے لیے رقم موجود نہیں ہے تو اب آپ اس کی بقدر اور اس کے اوپر اتنی مقدار جو نصابِ زکوۃ سے کم ہو لے سکتے ہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

زکوۃ کے مال سے مستحق کے مکان کا کرایہ ادا کرنا

سوال: ایک شخص کے یہاں ایک عورت گھر میں کام کرتی ہے اور وہ بیوہ ہے،

گھر پر اس کا کوئی نہیں، اس عورت نے کوئی مکان کرایہ پر لے رکھا ہے، صاحبِ مکان نے اس سے کہا کہ: تم مکان کا کرایہ مجھ سے لے لینا، صاحبِ مکان سے مراد جس شخص کے یہاں یہ عورت کام کرتی ہے وہ ہے، اور اس جملہ کے بعد وہ شخص اس عورت کو تنخواہ کے علاوہ کچھ رقم کرایہ ادا کرنے کے لیے دیتا ہے، تو اس شخص کا اس رقم کو زکوۃ میں سے دینا صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

اگر مکان کا کرایہ تنخواہ کے ایک جزء کے طور پر دیا جا رہا ہے تو زکوۃ سے دینا درست نہیں ہے، اور اگر کرایہ کے متعلق یہ صفائی کر دی گئی ہے کہ یہ تنخواہ کے جزء کے طور پر نہیں؛ بلکہ مالک کی طرف سے دیا جا رہا ہے تو دے سکتے ہیں؛ لیکن چوں کہ وہ عورت اس کے گھر میں کام کرتی ہے اس لیے معاوضہ کا شبہ تو ہے؛ اس لیے احتیاط اس میں ہے کہ: خالص مال سے دیا جائے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۵ر جمادی الاخری ۱۴۱۶ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

مستحق کو زکوۃ میں پنکھا دے کر وقف کروانا

سوال: ایک آدمی نے کہا، ہم تینوں بھائیوں کی جانب سے مدرسہ میں پنکھا وقف کریں گے، پھر انھوں نے اپنے زکوۃ کے پیسوں سے دو پنکھے لا کر ایک شخص کو دیے، جو مستحقِ زکوۃ تھا اور اس کو کہا کہ ایک پنکھا اپنے پاس رکھ اور ایک پنکھا اپنی جانب سے مدرسہ میں وقف کر دے، اس نے وقف کر دیا، تو آیا زکوۃ ادا ہوگی یا ادا نہ

ہوگی؟اور اگر زکوٰۃ ادا ہو تو پنکھا کا وقف کرنا کس کی جانب سے ہوگا؟ اگر جس کو دیا اس کی جانب سے وقف کرنا ہو، تو جس نے کہا ہے وقف کروں گا اس پر وقف کا قرضہ باقی رہے گا یا نہیں؟ شرعاً مفصل ومدلل جواب عنایت فرمائیں مع حوالہ۔

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

صورتِ مسئولہ میں جس کو وہ پنکھے دیے گئے تھے، اس نے اپنے آپ کو مالک سمجھتے ہوئے ان میں سے ایک پنکھا مسجد میں وقف کیا، تو زکوٰۃ ادا ہوگئی اور یہ پنکھا اسی کی طرف سے وقف ہوا اور اگر اس نے اپنے آپ کو وکیل سمجھتے ہوئے یہ پنکھا اپنی طرف سے نہیں؛ بلکہ دینے والے کی طرف سے وقف کیا تو اتنی زکوٰۃ ادا نہیں ہوئی اور یہ پنکھا دینے والے کی طرف سے وقف ہوا، صورتِ اولیٰ میں بھی ان پر کوئی ذمہ باقی نہیں ہے، اس لیے کہ انھوں نے جو الفاظ کہے تھے، وہ نذر ہی نہیں ہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۳/ ذوالحجہ ۱۴۱۰ھ

زکوۃ کی رقم پر مالکانہ قبضہ شرط ہے جمہور فقہاء کا اتفاق

اسکول کی فیس میں زکوۃ کی رقم صرف کرنا

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرعِ متین مسئلہ ذیل کے بارے میں کہ تنظیمیں اجتماعی شکل میں زکوۃ جمع کرتی ہیں، اور اسے مذہب وتعلیم کے نام پر مختلف امور میں تقسیم کرتی ہیں مثلاً:

(۱) زکوۃ کی رقم سے بڑی بڑی کانفرسوں کا انعقاد کرنا، جن میں بے جا اسراف کیا

جاتا ہے۔

(۲) زکوۃ کی رقم سے ٹی-وی چینل چلانا۔

(۳) زکوۃ کی رقم سے عوامی پروگراموں کا انعقاد کرنا۔

(۴) زکوۃ کی رقم سے صاحب نصاب آدمی کا سفر کرنا۔

(۵) زکوۃ کی رقم سے سی-ڈی، ڈی-وی-ڈی تیار کرنا۔

(۶) زکوۃ کی رقم سے بین المذاہب پروگرام کا منعقد کرنا۔

(۷) زکوۃ کی رقم سے اسلامک اسکول چلانا۔

جواب طلب امر یہ ہے کہ کیا مذکورہ بالا امور زکوۃ کے مصرف ہو سکتے ہیں؟

اور ایک اسکول کی فیس مثلاً دس ہزار روپے ماہانہ ہے، اور بچہ پانچ ہزار ماہانہ ادا کر رہا ہے تو کیا مابقیہ فیس زکوۃ کی رقم سے ادا کرنا شرعاً درست ہے؟

جن لوگوں نے ایسے آرگنائزیشن (تنظیموں) کو زکوۃ دی جب کہ انہیں مذکورہ بالا مصرف کا علم تھا، تو ایسے لوگوں کی زکوۃ کا کیا حکم ہے؟ ادا ہوئی یا نہیں؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

آپ کے سوالات کے جوابات سے پہلے ایک بات اصولی طور پر یہ سمجھ لیں کہ زکوۃ کی رقم کا کسی مستحق کو مالک وقابض بنا کر دینا ضروری ہے۔

درمختار مع الشامی میں ہے: ویشترط ان یکون الصرف تملیکاً لا اباحة کما مر، لایصرف الی بناء نحومسجد، ولاالی کفن میت الخ (درمختار)

(قوله: تملیکاً) فلایکفی فیه الاطعام الابطریق التملیك، ولو اطعمه عنده ناویا الزکوة لاتکفی ط الخ (قوله نحومسجد) کبناء القناطیر،

والسقايات، واصلاح الطرقات، وكرى الانهار، والحج والجهاد وكل ما لاتمليك فيه زيلعي (درمختارمع الشامی ۲/ ٦٨)

نیز درمختار میں ہے: هى لغة الطهارة والنماء، وشرعاً (تمليك) خرج الاباحة، فلواطعم يتيماً ناوياً الزكوة لايجزيه الا إذا دفع اليه المطعوم.

(درمختار مع الشامی ۲/ ۲۰۳)

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں: جمہور فقہاء اس پر متفق ہیں کہ زکوۃ کے معینہ آٹھ مصارف میں بھی زکوۃ کی ادائیگی کے لیے یہ شرط ہے کہ ان مصارف میں سے کسی مستحق کو مال زکوۃ پر مالکانہ قبضہ دیدیا جائے، بغیر مالکانہ قبضہ دئے اگر کوئی مال ان ہی لوگوں کے فائدے کے لیے خرچ کردیا گیا تو زکوۃ ادا نہیں ہوگی، اسی وجہ سے ائمہ اربعہ اور جمہور فقہاء امت اس پر متفق ہیں کہ رقم زکوۃ کو مساجد یا مدارس یا شفاخانے، یتیم خانے کی تعمیر میں یا ان کی دوسری ضروریات میں صرف کرنا جائز نہیں؛ اگرچہ ان تمام چیزوں سے فائدہ ان فقراء اور دوسرے حضرات کو پہنچتا ہے جو مصرف زکوۃ ہیں؛ مگر ان کا مالکانہ قبضہ ان چیزوں پر نہ ہونے کے سبب زکوۃ اس سے ادا نہیں ہوتی۔ (معارف القرآن ۴/ ۴۰۹)

آپ نے اپنے سوال میں جن سات صورتوں کے متعلق دریافت فرمایا ہے، ان میں سے کسی میں بھی مستحق زکوۃ کو مالکانہ قبضہ دے کر اس کا مالک نہیں بنایا جاتا، اس لیے ان تمام صورتوں میں زکوۃ کی رقم خرچ کرنے سے زکوۃ ادا نہ ہوگی۔

اسکول کی فیس کی ادائیگی کے متعلق آپ نے جو دریافت کیا ہے اس میں تفصیل یہ ہے کہ اسکول میں پڑھنے والا وہ بچہ اگر بالغ ہے، اور وہ مستحق زکوۃ ہے، یعنی اس کے

پاس ساڑھے باون تولہ چاندی (۶۱۲،۳۵۰ گرام) کی قیمت، یا اس قیمت کا زائد از ضرورت سامان نہ ہو تو اس کو بقیہ فیس کی ادائیگی کے لیے زکوۃ کی رقم دی جائے، تو درست ہے۔ اور اگر وہ نابالغ ہے اور اس کا باپ؛ نیز خود اس کی ملکیت میں مقدار نصاب مال زائد از ضرورت موجود نہیں تو اس کو بھی زکوۃ کی رقم دی جا سکتی ہے۔

سوال میں دریافت کردہ تنظیموں کو جنہوں نے زکوۃ کی رقم دی، اور انہوں نے سوال میں ذکر کردہ مصارف میں اس کو استعمال کیا تو دینے والوں کی زکوۃ ادا نہیں ہوئی، اور وہ اپنے ذمہ سے سبک دوش نہیں ہوئے، ان کو چاہیے کہ دوبارہ شروع جواب میں بتلائے ہوئے طریقہ کے مطابق زکوۃ ادا کریں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

أملاہ: احمد خانپوری، ۸/محرم الحرام ۱۴۳۰ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ   الجواب صحیح عبد القیوم راجکوٹی

قیدی پر زکوۃ کی رقم صرف کرنا

سوال: کیا میں اپنی زکوۃ وغیرہ کی رقم ایک قیدی کی رہائی کے لیے دے سکتا ہوں؟ جو مقدمۂ قتل میں سزا بھگت رہا ہے، اور اس سے قتل خطأً ہوا ہے عمداً نہیں، اور وہ قیدی ان پیسوں کو جو زکوۃ کے ہیں اپنی رہائی اور اہل وعیال کے خرچہ میں لا سکتا ہے کہ نہیں؟ اور اوپر والی ضروریات میں کیا سود کی رقم استعمال کر سکتا ہے؟ اور قتل مسلمان کا ہے، اور دوسرے مقدمات میں سزا بھگتنے والے کو کیا زکوۃ وغیرہ کی امداد کر سکتے ہیں یا نہیں؟ ہمیں جواب سے ممنون فرمائیں، اور ہمارے لیے دعا فرمائیں کہ اللہ ہمیں ہدایت دیوے اور قید خانے سے رہائی مقدر فرماوے۔

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

اگر وہ قیدی مستحق زکوۃ ہے تو آپ اپنی زکوۃ کی رقم اس کو دے سکتے ہیں، اس کے بعد وہ اس رقم کو اپنی تمام ضروریات (جس میں اس کی رہائی یا اہل وعیال کے مصارف بھی شامل ہیں) میں اس کو صرف کرسکتا ہے، بینک سود کی رقم بھی اس میں دی جاسکتی ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

زکوۃ کو غیر مصرف میں استعمال کیا تو تلافی کی کیا صورت ہے؟

سوال: (۱) زید کو کسی نے زکوۃ وصدقہ کی رقم دی؛ تاکہ زید یہ رقم اپنے گاؤں کے دینی ادارے پر لگائے اور اس مدرسہ میں صرف حفظ وناظرہ کی تعلیم بچوں کو دی جاتی ہے، اب زید وہ رقم وصول کر کے مدرسہ پر لگاتا رہا اور بقیہ رقم مقامی بینک میں جمع کرادی، اب کچھ عرصہ کے بعد زید نے وہ جمع شدہ رقم بینک سے نکال کر خود اپنے نام کی زمین خرید لی، اور اپنے لڑکے عابد کو کہا کہ جب میرے پاس رقم ہوگی تو میں مدرسہ کو ادا کردوں گا، اب کچھ دنوں کے بعد زید کا انتقال ہوگیا اور زید کی وفات کے بعد زید کے لڑکے عابد نے مدرسہ کی ذمہ داری سنبھالی، اور برابر اس کو بھی زکوۃ کی رقم مدرسہ کے لیے ملتی رہی اور کچھ عرصہ تک عابد بھی یہ زکوۃ کی رقم اپنی ضروریات کے لیے استعمال کرتا رہا، اب عابد کہتا ہے کہ میں اپنا اور اپنے مرحوم والد کا جو مدرسہ کے ذمہ قرضہ تھا وہ سب ادا کرنا چاہتا ہوں، اب عابد کس طرح یہ قرضہ ادا کرے؛ تاکہ دونوں باپ بیٹے کی طرف سے ادا ہوجائے؟

اس مدرسہ میں صرف اسی گاؤں کے بچے حفظ وناظرہ قرآن پاک کرتے ہیں، کھانا اور رہائش ان کی اپنے گھروں میں ہے، صرف تعلیم کے لیے آتے ہیں، اور جوان کا استاد ہے وہ دوسرے گاؤں کا ہے ان کو بطور تنخواہ یہ رقم ادا کی جاتی ہے، اب اس مدرسہ پر زکوۃ کی رقم لگ سکتی ہے یا نہیں؟ اور جنہوں نے زکوۃ دی ہے ان کی زکوۃ ادا ہوئی یا نہیں؟

② اگر ان دینے والوں کی زکوۃ ادا نہیں ہوئی تو عابد کسی سخت مجبوری کی وجہ سے ان کو بتا بھی نہیں سکتا کہ آپ کی زکوۃ ادا نہیں ہوئی، تو اس بارے میں کیا کیا جائے؟

③ اب چوں کہ زید نے زمین خرید لی اور اس کی وفات سے لے کر آج تک تقریباً ۱۰/سال ہوئے ہیں، اب زمین کی قیمت بھی زیادہ ہوگئی اور زکوۃ کی رقم بھی ۱۰/سال تک زمین کی وجہ سے بند پڑی رہی، اب جتنی رقم مدرسہ سے لی گئی تھی اتنی ہی مدرسہ کو واپس کرنی ہوگی یا زمین کی اب جو قیمت ہے اس قیمت کے حساب سے ادا کرنی ہوگی؟

④ جس مدرسہ کا یہ قرضہ تھا اسی مدرسہ کو واپس کرنا ہوگا یا علاقے کے اندر اور بھی مدارس ہیں جن میں بیرونی طلباء مقیم ہیں ان کو بھی دیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

① زکوۃ کی رقم کی ادائیگی میں تملیک بلاعوض لازم ہے یعنی فقراء ومساکین کو بغیر کسی معاوضہ کے مالک بنا کر رقم زکوۃ دی جائے، مدرسہ میں پڑھانے والے مدرسین اور اساتذہ کو تنخواہ بطورِ عقدِ اجارہ دی جاتی ہے جو تملیک بلاعوض نہیں ہے؛ اس لیے

زکوۃ کی جو رقم مدرس کی تنخواہ میں دی گئی اس سے زکوۃ ادا نہیں ہوئی، زید اور عابد کو زکوۃ کی ادائیگی کا وکیل بنایا گیا تھا اور انہوں نے وہ رقم تنخواہ میں صرف کی جس کے نتیجہ میں زکوۃ ادا نہیں ہوئی، اس لیے یہ دونوں حضرات اتنی رقم کے ضامن ہوئے، ان کے لیے ضروری ہے کہ جس آدمی نے زکوۃ کی یہ رقم انہیں مصرف زکوۃ میں صرف کرنے کے لیے دی تھی اس آدمی کو اتنی رقم اپنے پاس سے واپس ادا کریں۔

(۲) عابد کی وہ مجبوری کیا ہے؟ سوال میں اس کو ظاہر کیجیے؛ تا کہ اس کا حل پیش کیا جاوے، یہ یاد رہے کہ دنیوی بدنامی یا اس کا ڈر یہ کوئی مجبوری نہیں ہے، آخرت کا عذاب اس سے زیادہ سخت ہے، اخروی مواخذہ اور عذاب کے مقابلے میں دنیوی بدنامی یا اس کے ڈر کو ملحوظ رکھنا اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے۔

(۳) زید نے زکوۃ کی بقیہ رقم سے زمین خریدی تو اس کے ایسا کرنے سے بھی زکوۃ ادا نہیں ہوئی، اور زکوۃ کی جتنی رقم اس نے زمین خریدنے میں استعمال کی وہ اتنی رقم کا بھی ضامن ہے، اس کو چاہیے کہ اتنی رقم مالک کو لوٹا دے اور اس کو بتلا دے کہ آپ نے جو رقم زکوۃ ادا کرنے کے لیے مجھے حوالہ کی تھی میں نے اس کو اپنی ضرورت میں استعمال کر لیا تھا، اور ایسا کرنے سے مجھ پر اتنا ضمان واجب ہوا تھا، میں وہی ضمان ادا کر رہا ہوں۔

(۴) جب زید نے وہ رقم زکوۃ میں ادا کرنے کے بجائے اپنے استعمال میں لے لی، اسی وقت وہ اس کا ضامن بنا اور اس کی وکالت ختم ہوگئی، اب وہ یہ رقم کسی بھی مدرسہ یا فقراء پر صرف نہیں کر سکتا؛ بلکہ مالک کو لوٹانا ضروری ہے، اگر کسی مدرسہ (چاہے اس میں بیرونی طلبہ مقیم ہوں اس) میں صرف کرے گا تب بھی اس کا ذمہ بری نہیں ہوگا

جب تک کہ مالک کو لوٹا نہ دے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۳/ محرم ۱۴۱۹ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ

مستحق کو رقم دینے کے بعد زکوۃ کی نیت کب تک معتبر ہے؟

سوال: مَیں سرکاری ملازم ہوں، سرکار کی طرف سے وطن آنے جانے کا کرایہ ملتا ہے، مَیں نے بھی کرایہ لیا، صرف ٹکٹ دِکھانا پڑتا ہے، ایک مرتبہ ٹکٹ منسوخ کر کے اُس کا جو روپیہ بنتا ہے وہ لے لیا، اور ہمارے محکمہ کو دِکھایا کہ مَیں اِسی ٹرین سے وطن سے آیا؛ پھر کچھ عرصہ بعد مجھے گناہ کا احساس ہوا اور جتنے روپے میرے وہ ٹکٹ کی قیمت سے بنتے ہیں، وہ مَیں نے ایک غریب مستحق کو بغیر ثواب کی نیت کے دے دیے؛ لیکن اب احساس ہو رہا ہے کہ وہ روپے تو سرکاری محکمہ میں جانا چاہیے اور مَیں نے غریب کو دے دیا، پھر مَیں نے سوچا کہ اب اگلی بار جب وطن جانا نصیب ہو، تو ٹکٹ کے لیے سرکار سے روپے لینے کے بجائے مَیں دوں گا اور اپنے خرچ پر وطن جاؤں گا، اور جو روپے بغیر ثواب کی نیت کے غریب کو دیے تھے اُس میں زکوۃ کی نیت کروں، تو کیا یہ درست ہے؟ زکوۃ ادا ہوگی؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً

زکوۃ ادا کرنے کی شرط یہ ہے کہ زکوۃ دیتے وقت متصل ہی زکوۃ دینے کی نیت کرے، یا جو کچھ زکوۃ اُس کے ذمہ واجب ہے اُس کو اپنے مال سے نکال کر علاحدہ کرتے وقت متصل ہی زکوۃ دینے کی نیت کرے، ادا کرتے وقت یا علاحدہ کرتے

وقت نیت کا متصل ہونا خواہ حکمی ہو تب بھی ادا ہو جائے گی۔ مثال کے طور پر اگر زکوۃ کسی فقیر کو بغیر نیت کے دے دی، پھر اُس مال کو زکوۃ میں دینے کی نیت کرلی، تو اگر جس وقت زکوۃ کی نیت کی جارہی ہے اُس وقت تک وہ مال فقیر کے قبضہ میں موجود ہے یعنی ابھی اُس نے اُس کو خرچ نہیں کیا تو یہ زکوۃ ادا ہو جائے گی، اور اگر فقیر اُس کو خرچ کر چکا ہے تو زکوۃ ادا نہ ہوگی۔ (عمدۃ الفقہ ۲/ ۴۹، ۵۰ ملخصاً)

لہٰذا آپ جس غریب مستحق کو ایک مدت پہلے وہ رقم دے چکے ہیں، اور جس وقت رقم دی گئی تھی اُس وقت آپ نے ادائے زکوۃ کی نیت نہیں کی تھی، اور اب اُس پر ایک مدت گزرنے کے بعد آپ اُس رقم کو ادائے زکوۃ میں دینے کی نیت کر رہے ہیں، تو اگر وہ رقم بعینہٖ ہُو بہُو اُس غریب کے پاس موجود ہے، اور ابھی تک اُس نے اُس کو خرچ نہیں کیا ہے تب تو آپ کی یہ نیت درست ہو کر آپ کی زکوۃ ادا ہو جائے گی؛ ورنہ نہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

املاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۷/ رجب ۱۴۲۷ھ
الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ

مستحقِ زکوۃ، رقم زکاۃ کا مالک بن جانے کے بعد تصرف میں آزاد ہے

سوال: میرے ایک قریبی رشتے دار ہیں جو کئی سالوں سے مجھے رمضان میں اپنی زکوۃ کی خطیر رقم مصارفِ زکوۃ میں مستحقین تک پہنچانے کے لیے دیتے ہیں، میں اس کی کوشش کرتا ہوں کہ وہ رقم صحیح جگہ استعمال ہو جائے، اس سال بھی انھوں نے

مجھے اپنی زکوۃ کی رقم دی، تو میں نے ان سے کہا کہ: اس مرتبہ آپ مجھے اس رقم کا مالک بنا دیجیے، اس سے آپ کی زکوۃ بھی ادا ہو جائے گی اور میں اس رقم کو اپنی ضرورتوں میں بھی استعمال کر سکوں گا، تو انھوں نے مجھے اس کا مالک بنا دیا، صورت مسئلہ کو مدنظر رکھتے ہوئے مندرجۂ ذیل سوالات کے جوابات تحریر فرمائیں:

① یہ میرے لیے طیب حلال ہے یا حرام؟

② یہ رقم میں اپنے قرض کی ادائیگی میں صرف کر سکتا ہوں کہ نہیں؟

③ ہر سال میں اپنی اہلیہ کی زکوۃ اپنے مال میں سے نکالتا ہوں، اس سال میں چوں کہ خود مقروض ہوں؛ اس لیے ابھی تک زکوۃ نہیں نکال سکا ہوں، کیا اس رقم سے میں ان کی زکوۃ نکال سکتا ہوں؟

④ زندگی میں دو مرتبہ بیت اللہ کی حاضری کی سعادت نصیب ہوئی ہے، امسال بھی حاضری کی تمنا اور خواہش ہے، کیا اس رقم کو اس کار خیر میں صرف کر سکتا ہوں؟

⑤ کیا اس رقم کو اپنے نابالغ اولاد پر خرچ کر سکتا ہوں؟ اگر ہاں، تو اس کی شکل کیا اختیار کی جائے؟

⑥ میرے والدین مقروض ہیں، کیا یہ رقم ان پر خرچ کی جا سکتی ہے؟

⑦ میرے بھائی مدرسہ میں پڑھاتے ہیں اور شادی شدہ ہیں؛ لیکن خرچ میں تنگی رہتی ہے، کیا یہ رقم ان کو دی جا سکتی ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً

① شرعاً نصاب کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ جس کی وجہ سے زکوۃ واجب ہوتی ہے،

یہ وہ نصاب ہے جو بڑھنے والا اور دَین سے خالی ہو۔ دوسری قسم: وہ نصاب ہے جس کی وجہ سے زکوۃ حرام ہوتی ہے، یہ وہ نصاب ہے جو بڑھنے والا نہ ہو اور اس کی ضرورتوں سے زائد ہو، اس صورت میں اس پر زکوۃ واجب تو نہیں؛ لیکن زکوۃ لینا اس کے لیے حرام ہے؛ بلکہ زکوۃ کے علاوہ اور حقوق یعنی صدقۃ الفطر قربانی وغیرہ اس پر واجب ہے، اور اگر وہ نصاب بڑھنے والا نہیں ساتھ ہی اس کی ضرورتوں میں مشغول ہے، تو اس کے لیے زکوۃ لینا مباح اور جائز ہے؛ لیکن اگر اس کے پاس اپنے اور اپنے ماتحتوں کے کھانے پینے اور لباس وغیرہ ضرورتوں کے مقدار موجود ہے، تو اس کے لیے سوال کرنا حلال نہیں۔ صورت مسئولہ میں اگر آپ اس آخری قسم میں داخل ہیں تو آپ کے لیے زکوۃ لینا جائز ہونے کے باوجود سوال کرنا درست نہیں تھا۔

(۲) اگر آپ مصرف زکوۃ ہوتے ہوئے یہ رقم آپ نے وصول کی ہے، تو اس کا استعمال آپ کے لیے جائز ہے۔ اپنے قرض کی ادائیگی اور دیگر ضروریات میں استعمال کر سکتے ہیں۔

(۳) اہلیہ کے آپ کو وکیل بنانے کی صورت میں اس کی زکوۃ بھی اس مال سے ادا کر سکتے ہیں۔

(۴) جی ہاں۔

(۵) نابالغ اولاد پر بھی جیسے اپنی رقم خرچ کرتے ہیں اس کو بھی خرچ کر سکتے ہیں۔

(۶) والدین کو ان کا قرض ادا کرنے کے لیے یہ رقم دے سکتے ہیں، اور خود بھی اس رقم سے ان کا قرض ادا کر سکتے ہیں۔

(۷) ان کو بھی یہ رقم دے سکتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ جب آپ اس رقم کے مالک بن چکے، تو ایک مالک جس قسم کے تصرفات اپنی ملکیت میں کرتا ہے اس نوع کے تمام تصرفات اس رقم میں کرنے کا آپ کو بھی اختیار ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

أملاه: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۰ر ذوالقعدہ ۱۴۲۱ھ
الجواب صحیح: عباس داود بسم اللہ

ناجائز امور کے مرتکب مستحقین کو زکوۃ دینے کا طریقہ

سوال : کچھ لوگ زکوۃ کے مستحق ہیں؛ لیکن زکوۃ کی رقم سے غیر شرعی فائدہ اٹھاتے ہیں، مثلاً ٹی وی، ریڈیو لانا، شراب پینا اور جوا کھیلنا؛ لیکن ان کے بیوی بچے پریشان رہتے ہیں، تو ایسی حالت میں زکوۃ دینے کی کیا سبیل اختیار کی جائے جب کہ بیوی مستحق زکوۃ نہیں؟

الجواب : حامداً ومصلیاً ومسلماً

بیوی مستحق زکوۃ نہیں ہے؛ لیکن بچے ہیں، تو بچوں کو زکوۃ کی رقم دی جاسکتی ہے، یہ بھی کرسکتے ہیں کہ ان کی ضرورت کی اشیاء دکان دار کو کہہ کر انھیں ادھار دلوادی جائیں، اور پھر ان کی اجازت سے ان کا قرض زکوۃ کی رقم سے ادا کردیا جائے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۸ر شوال المکرم ۱۴۲۰ھ
الجواب صحیح: عباس داود بسم اللہ

خوش حال باعزت شخص کو زکوۃ دینا

سوال : ایک شخص ہے جو صاحب نصاب نہیں ہے؛ لیکن کماتا کھاتا ہے باعزت

طور سے، تو کیا ایسے شخص کو زکوۃ کا روپیہ دینا درست ہے یا اس کا لینا درست ہے؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

اس کو زکوۃ دے سکتے ہیں اور اس کے لیے لینا بھی درست ہے؛ البتہ سوال کرنا جائز نہیں ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۹/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۰ھ

الجواب صحیح: عباس داود بسم اللہ

مستحق کو زکوۃ کتنی دے؟

سوال: زکوۃ کس کو اور کتنی دے؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

مصارف زکوۃ کی تفصیلات کتاب الزکوۃ کے باب المصرف میں دیکھی جا سکتی ہے۔ کسی بھی مصرف کو یک مشت اتنی رقم نہ دے کہ وہ اس کے ہاتھ میں آتے ہی صاحبِ نصاب بن جائے، یہ مکروہ ہے۔

ویکرہ لمن علیه الزکوة أن یعطي فقیرا مائتي درهم أو أکثر، ولو أعطیٰ جاز وسقط عنه الزکاة إلخ (بدائع ۲/۴۸) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۴/ محرم الحرام ۱۴۲۰ھ

مستحق کو نصاب سے زائد رقم دینا

سوال: مستحق زکوۃ کو نصاب سے زائد زکوۃ دینے کا کیا حکم ہے۔ کسی خاص ضرورت کے تحت یا اپنے قریبی رشتہ دار ہونے کی صورت میں نصاب سے زائد زکوۃ

ادا کرنے کی گنجائش ہے؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

بیک وقت زکوۃ کی اتنی مقدار اس کو دینا کہ وہ خود مالک نصاب بن جائے مکروہ ہے اگر چہ زکوۃ ادا ہو جاتی ہے۔ البتہ اگر وہ شخص اتنا مقروض ہے کہ اس مقدار میں سے قرض ادا کرنے کی صورت میں اس کے پاس بقدر نصاب رقم بچتی نہیں ہے تو پھر مکروہ بھی نہیں ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۷/ رجب المرجب ۱۴۱۴ھ
الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

کمیٹی جب تک زکوۃ کی رقم مستحق کو نہ دے، ذمہ بری نہ ہوگا

سوال: زکوۃ دینے والا زکوۃ بیت المال میں جمع کرنے سے بری الذمہ ہو جائے گا یا نہیں؟ بیت المال زکوۃ کی رقم کو کسی مصلحت سے روکے رکھے مثلاً کوئی صحیح مصرف سامنے نہیں آیا ہے، تو شرعاً کیسا ہے؟ زیادہ سے زیادہ کتنے دنوں تک روک سکتے ہیں؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

صورت مسئولہ میں منتظمینِ بیت المال، اربابِ اموال کے وکیل ہیں؛ اس لیے زکوۃ کی رقم بیت المال میں دینے سے براءت ذمہ نہیں ہوگی، جب تک بیت المال اس کو مصرف میں صرف نہ کرے، دوسرا سال آنے سے پہلے رقم خرچ ہو جانی چاہیے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری
الجواب صحیح: عباس داود بسم اللہ

مستحقِ زکوۃ کی کوئی چیز استعمال کرنا

سوال: ایک مفتی صاحب کے سامنے بیٹھ کر مسائل سنائے جارہے تھے، اس میں ایک مسئلہ یہ آیا کہ مستحق زکوٰۃ کو اگر مدز کوٰۃ میں لوٹا ملا، اور اس کے یہاں کوئی غیر مستحق مہمان آیا، تو اس مہمان کو لوٹا استعمال کرنے کی اجازت نہیں، چاہے مستحق میزبان اجازت دے دے، ہاں! اگر اس کو مالک بنادے تو اس کا جواب دوسرا ہے، تو اس میں سوال یہ ہے کہ فقیر جب لوٹے کا مالک ہوگیا، تو پھر اس کا کسی کو استعمال کرنے کی اجازت دینا بیکار کیوں ہے؟ نیز اس ضمن میں یہ مسئلہ بھی تھا کہ: طالب علم کو کھانا مدرسہ سے ملتا ہے، اس میں سے وہ کسی مہمان کو بغیر مالک بنائے نہیں کھلاسکتا۔ تو اس کو اچھی طرح سمجھا کر ممنون فرماویں۔

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

جس کو وہ چیز زکوٰۃ میں ملی ہے، بطور زکوٰۃ اس کا مالک بنا ہے، اور جب تک وہ چیز اس کے ملک میں ہے، اس وقت تک اس کی زکوٰۃ والی حیثیت قائم ہے، اور غیر مستحق کے لیے زکوٰۃ سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں، چاہے مالک اجازت کیوں نہ دے، البتہ وہ مستحق اس چیز کو اپنی ملک سے نکال کر غیر مستحق کو اس کا مالک بناوے، تو اب اس کی وہ حیثیت قائم نہیں رہی؛ بلکہ تبدلِ ملک کی وجہ سے تبدیلی عین ہوگیا۔

"لقول النبی ﷺ لبریرة هی لها صدقة ولنا هدية". (هدايه۳/۳۳۹)

کھانا جو دوسرے کو کھلایا جاتا ہے، اس کی دو صورتیں ہوسکتی ہیں: ایک بطریق اباحت دوسرے بطریق تملیک۔ پہلی صورت میں کھانے والے کے لیے اس کھانے

کی تناول فرمانے کی اجازت ہوتی ہے، مالک نہیں بنتا؛ بلکہ ملکیت کھلانے والے کی رہتی ہے، جب کہ دوسری صورت میں کھانے والا مالک بن جاتا ہے؛ اس لیے سابقہ اصول کے مطابق پہلی صورت میں تبدلِ عین نہیں ہوتا، اور جب کہ دوسری صورت میں ہوجاتا ہے۔ یہ مسئلہ اصولِ فقہ کا ہے، اب بھی سمجھ میں نہ آوے تو ماننے پر اکتفا فرمالیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۶؍ذوالحجۃ الحرام ۱۴۱۴ھ

غیر مستحق کا زکوۃ لینا اور اس کو دینا

سوال: مدرسہ کے نام پر زکوۃ وغیرہ وصول کرنا جب کہ وہاں مصارفِ زکوۃ کی ظاہری کوئی صورت موجود نہ ہو، کیسا ہے؟ جو لوگ زکوۃ دیتے ہیں وہ کہاں تک درست کررہے ہیں؟ اس میں مواخذہ ذمہ دارِ مدرسہ سے ہوگا یا صاحب مال سے؟ اور یہ عمل کب تک کیا جاسکتا ہے؟ تحقیق کی کب تک ضرورت نہیں ہے؟ کیا ایسے مدرسہ کو امدادی رقم دیا جاسکتا ہے؟ مالِ زکوۃ کو اپنے لیے ہدیہ جان کر بطور معاش اختیار کرنا کیسا ہے؟ وضاحت فرماویں۔

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

جب مدرسہ میں مصارف زکوۃ موجود نہ ہوں تو زکوۃ لینا درست نہیں، وہاں دینا بھی درست نہیں اس طرح زکوۃ ادا نہیں ہوگی، فریضہ ذمہ پر باقی رہ جاوے گا۔ مال زکوۃ کو بطور معاش اختیار کرنے سے آپ کی مراد یہ ہے کہ لوگوں سے زکوۃ مانگ کر اپنی ضرورتیں پورا کرنا، تو اگر کسی آدمی کے پاس اتنی رقم یا سرمایہ موجود ہے جس سے

اس کا دن بھر کا گزارا ہو جاتا ہے تو ایسے آدمی کے لیے سوال کرنا جائز نہیں ہے؛ لیکن اس کے باوجود اس کے سوال پر کسی نے اس کو زکوۃ دے دی تو دینے والے کی زکوۃ ادا ہو جائے گی۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۹ رشوال ۱۴۱۵ھ
الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

مصارف زکوۃ میں فی سبیل اللہ کا مصداق کون؟

سوال: قرآن میں جو مصارفِ زکوۃ بیان ہوئے ہیں، ان میں فی سبیل اللہ کا کیا مصداق ہے؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں کہ فی سبیل اللہ سے مراد غازی اور مجاہد ہے، جس کے پاس اسلحہ اور جنگ کا ضروری سامان خریدنے کے لیے مال نہ ہو، یا وہ شخص جس کے ذمہ حج فرض ہو چکا ہو؛ مگر اس کے پاس اب مال نہیں رہا، جس سے وہ حج فرض ادا کرے، یہ دونوں کام خالص دینی خدمت اور عبادت ہیں؛ اس لیے مالِ زکوۃ کو ان پر خرچ کرنے میں ایک مفلس کی امداد بھی ہے، اور ایک عبادت کی ادائیگی میں تعاون بھی۔ (معارف القرآن ۴/۴۰۶) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۴ رشوال المکرم ۱۴۱۳ھ
الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

باب العشر والخراج

عشری وخراجی زمین کسے کہتے ہیں؟

سوال: عشری اور خراجی زمین کسے کہتے ہیں؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

الأرض العشرية ما فيها عشر أو نصف عشر، و ليس فيها الخراج، وهى: ما أسلم أهله طوعا أو فتح عنوة وقسمت على جيش المسلمين، وإن تركت عند أهلها من الكفرة فهي خراجية الأرض الخراجية وهي التي يوخذ منها الخراج .(قواعد الفقه: ١٦٨) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

ہندوستانی زمین عشری ہے یا خراجی؟

سوال: ہمارے ہندوستان کی سرزمین میں زکوۃ کا کیا مسئلہ ہے؟ آیا اس میں عشر آئے گا یا نہیں؟ اگر عشر دینا ہے تو کس قدر؟ واضح رہے کہ ہماری زمین کی سیرابی سال کے اکثر اوقات میں بورنگ کے پانی سے کی جاتی ہے۔

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

ہندوستان کی زمینوں کے عشری وخراجی ہونے، نہ ہونے میں مفتیانِ کرام کا اختلاف رہا ہے، بعض حضرات قانونِ تنسیخ زمین داری (جو انگریز کے دور حکومت میں جاری

ہوااور آزادی کے بعد بھی اس پر عمل جاری ہے اس) کی وجہ سے اراضی کے ملکِ سرکار ہونے کی بنیاد پر نہ اس کو عشری کہتے ہیں نہ خراجی، اور بعض حضرات دار الحرب ہونے کی بنیاد پر اس کو عشری وخراجی نہیں کہتے، جبکہ محقق علماء کرام اس قانون کے بعد اور دار الحرب کی تقدیر پر بھی ہندی اراضی کو عشری یا خراجی ہی فرماتے ہیں، حضرت اقدس مولانا مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی نور اللہ مرقدہ نے قانونِ تنسیخِ زمین داری کے بعد بھی دلائل کے اعتبار سے اقرب واظہر اسی کو فرمایا ہے کہ ملکِ مالکان ثابت ہے؛ البتہ اس قانون کے مطابق سرکار نے جو زمین زمین داروں سے لے کر کاشتکاروں کو دی ہے وہ خراجی کہی جائیں گی۔ (ماخوذ از فتاویٰ محمودیہ ۱۳/ ۹۲)

اراضیٔ ہند نہ سب عشری ہیں نہ سب خراجی ہیں؛ بلکہ بعض عشری ہیں بعض خراجی ہیں، جو زمینیں اس وقت مسلمانوں کی ملک میں ہیں اور ان کے پاس مسلمانوں ہی کے پاس سے پہنچی ہیں ارثاً وشراءً وهلم جراً وہ زمینیں عشری ہیں، اور جن اراضی کا درمیان میں کوئی کافر مالک ہوا ہے وہ خراجی ہیں، چاہے وہ کافر انفرادی ملکیت سے مالک ہوا ہو یا سرکاری حکومتی اقتدار کی شکل میں مالک ہوا ہو، اور جن زمینوں کے ماضی کے مالکان کی کچھ خبر نہ ہو سکے ان اراضی کو بدلیل استصحاب حال عشری ہی کہا جائے گا۔ (اسلام کا نظام اراضی) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

بناس کانٹھا کی زمین عشری ہے یا خراجی؟

سوال: ہمارے علاقہ یعنی ضلع بناس کانٹھا کہ جہاں کی زمینیں مسلم نواب کی

تھیں، اور ضلع مہسانہ جہاں کی زمینیں غیر مسلم راجہ گائکواڑ کی تھیں، عشری ہیں یا خراجی؟

الجواب: حامداً ومصلياً ومسلماً

موجودہ حالت میں جب کہ زمین ملکِ سرکار ہے، تو نہ وہ عشری ہیں نہ خراجی۔

هذا نوع ثالث لاعشرية ولاخراجية من الأراضي، تسمیٰ أراضی المملكة وأراضی الحوز (شامي) (فتاویٰ محمودیہ ۳/ ۶۸) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

عشر وخراج کی مقدار

سوال: عشر وخراج کی مقداریں کیا ہیں؟ اور خراجِ مقاسمہ وخراج موظّف کی تعریف اور مقدار کیا ہے؟

الجواب: حامداً ومصلياً ومسلماً

جس زمین کی آب پاشی کی جاتی ہے یا محنت کر کے کنویں وغیرہ سے پانی دیا جاتا ہے، اُس کی پیداوار میں نصف عشر واجب ہے، اور جس زمین میں بارش کے پانی سے کھیتی ہوتی ہے اور مستقل پانی دینا نہیں پڑتا، اُس کی پیداوار میں عشر واجب ہوتا ہے۔

(و) تجب في (مسقى سماء) أي مطر وسيح كنهر (و) يجب (نصفه في مسقى غرب) أي دلو كبير (ودالية) أي دولاب؛ لكثرة المؤنة، إلخ.

(درمختار علی هامش الشامي ۲/ ۵۵، ۵۳)

خراج کی دو قسمیں ہیں: ایک خراجِ مقاسمہ، یعنی پیداوار ہی کا ایک حصہ، مثلاً نصف یا رُبع یا ثُلث مقرر کر دیا جائے، اِس صورت میں اُس کی مقدار وہی ہوگی جو

مقرر کی گئی ہے؛ البتہ یہ ضروری ہے کہ وہ نصف سے زیادہ نہ ہو۔ دوسری قسم خراجِ مُوظّف ہے، یعنی پیداوار کا کوئی حصہ متعین نہ ہو؛ بلکہ مالکِ زمین کے ذمہ ڈال دیا گیا ہو، جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کیا تھا، اِس کی مقدار مختلف ہے، ہر جریب (ساٹھ ذراع لمبی اور ساٹھ ذراع چوڑی زمین) پر اگر غلہ ہے تو ایک صاع غلہ اور ایک درہم، اور سبزی ہے تو پانچ درہم، اور انگور و کھجور کا باغ ہے تو دس درہم۔

وهو نوعان: خراج مقاسمة، إن كان الواجب بعض الخارج كالخمس ونحوه، وخراج وظيفة، إن كا ن الواجب شيئا في الذمة. الخ (در مختار علی هامش الشامي ۳/ ۲۸۵،۲۸٤) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

کیا ہندوستان کی زمین میں عشر واجب ہے؟

سوال: ہندوستان میں جو زمین کی پیداوار ہوتی ہے، کیا اس میں سے عشر دینا ہوگا؛ کیوں کہ عشر تو عشری زمین سے دی جاتی ہے، جو اسلامی حکومتوں میں ہوتی ہے۔

الجواب: حامداً ومصلياً ومسلماً

جو اراضیٔ کاشت مسلمانوں کی ملکیت میں اسلامی زمانہ سے اسلامی حکومت کے دینے سے یا خود مسلمان ہو کر اپنی زمین پر مالک برقرار رہنے سے ابتک برابر چلی آرہی ہے؛ حتی کہ خاتمۂ زمینداری کے بعد بھی اپنی ہی ملک میں باقی ہو اور کبھی غیر مسلم کے ملک میں نہ گئی ہو وہ عشری ہے اور اس میں عشر نکالنا واجب ہے، پھر اگر فقط آسمانی یا بارانی پانی سے سیراب ہو کر پیداوار ہوتی ہے یا قدرتی دریاؤں کے سیلابی

پانی سے سیراب ہوکر پیداوار ہوتی ہے، تو ہر فصل کی پیداوار پر پیداوار حاصل ہوتے ہی دسواں حصہ ادا کرنا واجب ہوجائے گا، ورنہ بیسواں حصہ ادا کرنا واجب ہوگا، اور جوزمین مذکورہ بالا قیود وشرائط کے ساتھ مسلمانوں کی ملک میں نہیں ہیں، وہ عشری نہیں ہوں گی، اوراس کی پیداوار سے عشر نکالنا واجب نہ ہوگا کہ اگر نہ نکالے تو گنہگار ہو، البتہ جس زمین کے بارہ میں عشری کا اشتباہ ہو، عشری نہ ہونے کا یقین نہ ہواس کی پیداوار میں سے ہر فصل میں سے عشر کے قاعدے کے مطابق دسواں حصہ یا بیسواں حصہ بلکہ کچھ زائد ہی کر کے احتیاطاً نکالتے ہی رہنا چاہیے کہ باعث خیر وبرکت ہی ہوگا کسی حال میں مضر اور ناجائز نہ ہوگا۔ (نظام الفتاوی ۲/۱۴۱،۳) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۳/محرم الحرام ۱۴۱۴ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

عشر کن چیزوں میں واجب ہوگا؟

سوال: ① اور یہ عشر صرف ان پیداوار سے دینا ہوگا جو لمبی مدت تک باقی رہتی ہیں، جیسے گیہوں وغیرہ یا کم مدت تک رہنے والوں پھلوں میں بھی دینا ہوگا، جیسے آم وغیرہ۔

② پیداوار کی زکوٰۃ میں کتنے کیلو ہوں تو نصاب ہوتا ہے؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

① تمام قسم کی پیداوار میں عشر واجب ہوتا ہے۔

بلا شرط نصاب وبلا شرط بقاءٍ وحولان حول. (درمختار)

②اس میں نصاب بھی مقرر نہیں ہے۔(کمامر) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۳ر محرم الحرام ۱۴۱۴ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

عشر وخراج کے مصارف

سوال: عشر وخراج کے مصارف کیا ہیں؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

عشر کا مصرف وہی ہے جو زکوٰۃ کا ہے۔

باب المصرف أي مصرف الزكوٰة والعشر (درمختار ۲/ ٦٤)

خراج کا مصرف مصالحِ مسلمین ہیں، مثلاً: سرحدوں کی حفاظت، پُل کی تعمیر، مساجد، حوض، رِباط وغیرہ کی تعمیر، نہروں کا بنانا، علماء وقضاۃ وعُمّال حکومت، طلبۂ علم کے وظائف۔

مصرف الجزية والخراج ومال التغلبي وهديتهم للإمام، وما أخذ منهم بلاحرب مصالحنا، كسد ثغور، وبناء قنطرة، وجسر، وكفاية العلماء والقضاة والعمال. (تنوير الأبصار مع الدر المختار على هامش الشامي ۳/ ۳۰۷،۳۰٦) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

عشر میں غلہ یا قیمت؟

سوال: زمین کی پیداوار کا عشر نکالنا ضروری ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو پھر ماء مطر سے کس زمین اور غلہ کی کس نوع میں کتنا ضروری ہے؟

نوٹ: غلہ پر اگر عشر واجب ہے تو عشر میں غلہ ہی واجب ہوگا یا اس کی قیمت بدل بن سکتی ہے؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

اگر عشری زمین ہے تو بارش سے پیدا شدہ پیداوار میں سے دسواں حصہ نکالا جائے، اس کی قیمت بھی ادا کی جا سکتی ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۷/ ربیع الاول ۱۴۱۱ھ

زمین کا محصول ادا کرنے سے عشر ساقط نہیں ہوگا

سوال: آج کل غیر مسلم حکومت ہماری عشری یا خراجی زمین پر جو ٹیکس لیتی ہے، اُس سے خراج اور عشر ادا ہو جائے گا یا الگ سے دوسری رقم اِس کے لیے خرچ کرنی ہوگی؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

اصح قول یہ ہے کہ: محصول مذکور زمینوں کا کرایہ ہے جس کی وجہ سے عشری زمین سے عشر ساقط نہیں ہوگا؛ لیکن جب زمین خراجی ہو تو یہ محصول خراج کے قائم مقام ہوگا۔ کذا فی فتاوی رشیدیہ (فتاویٰ محمودیہ ۳/ ۴۰) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۳/ جمادی الاخریٰ ۱۴۰۹ھ
الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

پالنپور کے اطراف کی زمینیں عشری ہیں یا خراجی؟

سوال: (۱) شمالی گجرات (پالنپور کے اطراف) کی زمینیں عشری ہیں یا خراجی؟

خراجی ہونے کی صورت میں خراج مقاسمہ ادا کرنا ہوگا یا خراج مؤظف؟ اس زمانہ کے اعتبار سے خراج مؤظف کی مقدار کیا ہے؟

عشر وخراج دانے میں واجب ہے یا گھاس میں؟

سوال: ② باجرا، جوار، گیہوں کی پیداوار جس سے مقصود غلہ اور گھاس دونوں ہوتے ہیں تو کیا دونوں میں سے عشر اور خراج مقاسمہ ادا کرنا ہوگا یا صرف غلہ میں سے؟

بار بار بڑھنے والی گھاس پر عشر وخراج

سوال: ③ ایسی گھاس جو ایک مرتبہ بونے پر تین سال تک رہتی ہے اور ہر مہینہ کاٹنے پر وہ بڑھتی رہتی ہے اور اس میں غلہ مقصود نہیں ہوتا تو کیا ہر مہینہ کاٹنے پر اس کا عشر اور خراج ادا کرنا ہوگا؟ یا پورے تین سال کا ایک مرتبہ ادا کرنا کافی ہوگا؟

اولاد کی تعلیم پر خراج صرف کرنا

سوال: ④ اپنی زمین کا خراج اپنی بالغ اور نابالغ اولاد کی تعلیم پر خرچ کر سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

① حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے تاریخی حقائق کی بنیاد پر ہندوستان و پاکستان کی زمینوں کے متعلق جو تجزیہ پیش فرمایا اس میں صوبۂ گجرات و کاٹھیاواڑ کی زمینوں کو خراجی بتلایا ہے؛ اس لیے کہ اولین مسلمان فاتحین نے باشندگان ملک کی زمینوں میں کوئی تصرف نہیں کیا بلکہ بہ دستور ان کی ملک میں باقی رہنے دیا اور

ان پر خراج مقرر فرمادیا۔ (اسلام کا نظام آراضی ص: ۲۳۷)

اب یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ خراج کی کون سی قسم ان زمینوں پر عائد ہے اس پر بحث فرماتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں: اس تفصیل سے علاقہ سندھ کی زمینوں کا خراج تو معلوم ہوگیا کہ عموماً مقاسمہ اور بٹائی کی صورت سے پیداوار کا پانچواں حصہ (خمس) تھا اس زمانہ میں ملتان، بہاولپور، پنجاب کے سب علاقے بھی سندھ میں شامل تھے۔ ان کا بھی یہی حکم ہوگا بلکہ صوبۂ گجرات اور راجپوتانہ بھی محمد بن قاسم کی فتوحات میں داخل سندھ کا جزء قرار دیا گیا تھا اس لیے ان تمام علاقوں کے خراج میں اگر کسی خاص زمین یا کسی خاص علاقہ کے متعلق خراج کی کوئی دوسری صورت کافی ثبوت کے درجے کو پہنچ جائے تو اس پر عمل کیا جائے گا ورنہ خمس پیداوار کو خراج سمجھا جائے گا۔ (ایضا ص ۱۹۱)

۲ مدار قصد اور نیت پر ہے اگر بونے والے کی نیت صرف دانہ کی تھی گھاس مقصود نہیں تھی تو عشر اور خراج مقاسمہ صرف دانہ میں واجب ہوگا گھاس میں نہیں۔ اور اگر دونوں مقصود تھے تو دونوں میں۔

وان المدار علی القصد حتی لو قصد به ذلك وجب العشر (شامی ۲/۵۵)

۳ عشر اور خراج مقاسمہ دونوں کا تعلق پیداوار سے ہے اس لیے جب جب کاٹی جائے ان کا عشر وخراج نکالا جائے۔

قال الخیر رملی خراج المقاسمة کالمؤظف مصرفا و کالعشر مأخذا لافرق فیه بین الرطاب والزرع والکرم والنخل المتصل و غیره فیقسم الجمیع علی حسب ما تطیق الارض من النصف او الثلث او الربع او الخمس و قد تقرر ان خراج المهقاسمة کالعشر لتعلقه بالخارج و لذا

یتکرر بتکرر الخارج فی السنة وانما یفارقه فی المصرف الخ (شامی ۳/ ۳۱۴)

④ خراج کا مصرف عام مصالح اہل اسلام ہیں سرحدوں کی حفاظت، فوج کے اخراجات، اور عمال حکومت اور علماء وطلباء، مفتیوں اور قاضیوں کا گذارہ بقدر کفایت اس مد سے دیا جائے سڑکوں اور پُلوں کی تعمیر ومرمت کا خرچ بھی اس مد سے کیا جائے۔

ومصرف الجزیة و الخراج ومال التغلبی و ھدیته للامام و ما اخذ منھم بلاحرب مصالحنا کسد ثغور و بناء قنطرة وجسر و کفایة العلماء والمتعلمین تجنیس و به یدخل طلبة العلم فتح والقضاة والعمال الخ. (در مختار علی ھامش الشامی ۳۰۶۳، ۳۰۷)

(قوله و کفایة العلماء) ھم اصحاب التفسیر والحدیث و الظاھر ان المراد بھم من یعلم العلوم الشرعیةفیشمل الصرف والنحو وغیرھما حموی عن البرجندی ط وفی التعبیربالکفایة إشعار بانه لا یزاد علیھا و سیأتی بیانه و کذا باشتراط فقرھم لکن فی حظر الخانیة سئل علی الرازی عن بیت المال ھل للاغنیاء فیه نصیب قال لا الا ان یکون عاملا اوقاضیا و لیس للفقھاء فیه نصیب الا فقیه فرغ نفسه لتعلیم الناس الفقه اوالقرآن ١ھ قال فی البحر ای بان صرف غالب اوقاته فی العلم ولیس مراد الرازی الاقتصار علی العامل او القاضی بل اشار بھما الی کل من فرغ نفسه لعمل المسلمین فیدخل فیه المفتی و الجندی فیستحقان الکفایة مع الغنی ١ھ وذکر قبله عن الفتح ان طالب العلم قبل ان یتأھل عامل لنفسه لکن لیعمل بعده للمسلمین (شامی ۳/ ۳۰۷)

عبارت مذکورہ میں طالب علم پر خراج خرچ کرنے کا جواز مصرح ہے البتہ فتح القدیر کے حوالہ سے جوآخری عبارت پیش کی اس سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ اگر اس

طالب علم کی نیت یہ ہے کہ حصول علم کے بعد مصالح اہل اسلام کے لیے کام کروں گا تب وہ حق دار ہے۔ اگر اپنی بالغ اولاد کو طلب علم دین کے لیے اس واسطے فارغ کیا ہے کہ حصول علم کے بعد بھی اسی مشغلہ میں رہے گی تو ان کی دینی تعلیم پر بلاتردد خراج بقدر ضرورت خرچ کیا جا سکتا ہے البتہ مناسب یہ ہے کہ صرف ان ہی پر خرچ کرنے پر اکتفا نہ کرے۔ دیگر مصارف پر بھی خرچ کرے۔ رہی نابالغ اولاد تو چوں کہ اس کا نفقہ خود اس پر واجب ہے اس لیے ان پر خرچ نہ کیا جائے۔ ھذا ما ظھر لی. فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۸/ ربیع الاول ۱۴۱۴ھ
الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

سرکار سے خریدی ہوئی زمین کا حکم

سوال: (۱) زید نے اپنی زمین کی قیمت قسط وار حکومت کو ادا کر دی ہے، ایسی زمین کو ہمارے یہاں ''ہٹ کی زمین'' کہتے ہیں، اور زید اُس کو بیچنے کا مختار ہے، اُس پر عشر یا خراج زمین کی نوعیت کے اعتبار سے آئے گا یا نہیں؟

(۲) زید کے پاس ایک زمین ہے جس کی قیمت زید نے حکومت کو ادا نہیں کی، اور حکومت کی طرف سے زید اُس کے بیچنے کا مختار بھی نہیں ہے، ایسی زمین اگر عشری ہے تو عشر، اور خراجی ہے تو خراج اُس پر واجب ہوگا یا نہیں؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

(۱) (۲) موجودہ حالت میں جب کہ زمین ملکِ سرکار ہے، تو نہ وہ عشری ہیں

نہ خراجی۔

هذا نوع ثالث لاعشرية ولاخراجية من الأراضي، تسمیٰ أراضی المملكة وأراضی الحوز.(بحواله شامي) (فتاویٰ محمودیہ ۳/۶۸) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۳/ جمادی الاخریٰ ۱۴۰۹ھ
الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

ٹریکٹر اور غلہ پر زکوۃ

سوال: ٹریکٹر میں زکوۃ ہے یا نہیں؟ اور اپنا غلہ ہے، بھاؤ کم ہونے کی وجہ سے بیچا نہیں، اس میں اور کھانے کے لیے گیہوں سو من رکھے ہیں، ان میں زکوۃ ہے کہ نہیں؟ زکوۃ صرف سونا، چاندی، پیسے اور تجارتی مال میں ہے یا اور اشیاء میں ہے؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

ٹریکٹر جو اپنی ضرورت کے لیے ہے، اس میں زکوۃ نہیں ہے؛ البتہ اگر اس کی تجارت کرتا ہے تو زکوۃ واجب ہوگی، اپنی زمین میں جو غلہ پیدا ہوا وہ محفوظ رکھا ہے، اس میں زکوۃ نہیں ہے، چاہے بھاؤ بڑھنے پر بیچنے کا ارادہ ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

عشر کی رقم تنخواہ میں دینا

سوال: عشر کی رقم بلا تملیک تنخواہ میں دی جا سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

باعتبارِ مصرف عشر کا بھی وہی حکم ہے جو زکوۃ کا ہے، اس لیے عشر کی رقم بلا تملیک

تنخواہ میں صرف کرنا درست نہیں۔ (درمختار، شامی ۲/ ۶۴) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۳/ صفر ۱۴۱۹ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ

عشر مصارف وضع کیے بغیر ادا کرے

سوال: ① زمین کی پیداوار میں جو عشر نکالا جاتا ہے وہ عشر پیداوار کو جو خرچ لگا وہ نکال کردیں یا پوری پیداوار میں سے؟ مثلاً کسی کو دس بورے جوار ہوئی اور دس بورے جوار کی قیمت مثلاً پانچ ہزار روپیہ ہوئی، اور جوار بونے سے لے کر گھر آنے تک دو ہزار خرچ ہوا، اس حساب سے عشر تین ہزار میں سے نکالے یا پورے پانچ ہزار میں سے؟

② ایسے ہی کسی کو کپاس چالیس ہزار کی ہوئی اور خرچ دس ہزار لگا، تو زکوۃ پورے چالیس پر ہوگی یا تیس ہزار پر؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

① ② زراعت میں جو مصارف آئے ہیں وہ وضع کیے (نکالے) بغیر ادا کریں گے۔

صورت مسئولہ میں جوار میں پورے پانچ ہزار اور کپاس میں پورے چالیس ہزار میں سے عشر نکالا جاوے گا۔ بلا رفع مؤن الزرع (درمختار) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۹/ شوال المکرم ۱۴۲۰ھ

الجواب صحیح: عباس داود بسم اللہ

متفرقات كتاب الزكاة

زکوۃ اور بیت المال الگ الگ نہیں

سوال : کیا بیت المال اور زکوۃ کو علاحدہ علاحدہ فنڈوں میں رکھا جاسکتا ہے؟

الجواب : حامداً ومصلياً ومسلماً

زکوۃ اور بیت المال دونوں الگ الگ نہیں ہے؛ بلکہ زکوۃ بھی بیت المال کا ایک شعبہ اور حصہ ہے، اسلامی حکومت میں جو اموال جمع ہوتے ہیں ان کو جہاں رکھا جاتا ہے اس کو بیت المال کہا جاتا ہے، جمع ہونے والے اموال کی نوعیت کے اعتبار سے بیت المال کے چار شعبے ہیں، اور ہر شعبے کا مصرف بھی متعین ومعلوم ہے، کتب فقہ میں کتاب الزکاۃ اور کتاب السیر میں اس کی تفصیلات مذکور ہیں، آپ کی معلومات کے لیے بدائع الصنائع کی عبارت پیش خدمت ہے:

وأما بيان ما يوضع في بيت المال من الأموال وبيان مصارفها، فأما ما يوضع في بيت المال من الأموال فأربعة أنواع: أحدها: زكاة السوائم والعشور وما أخذه العشار من تجار المسلمين إذا مروا عليهم؛ والثاني: خمس الغنائم، والمعادن، وا لركاز؛ والثا لث: خراج الأراضي وجزية الرءوس وما صولح عليه بنو نجران من الحلل وبنو تغلب من الصدقة المضاعفة، وما أخذه العشار من تجار أهل الذمة والمستأمنين من أهل الحرب؛ والرابع: ما أخذ من تركة الميت الذي مات ولم يترك وارثا أصلا، أو ترك زوجا أو زوجة.

فأما مصارف هذه الأنواع، فأما مصرف النوع الأول فقد ذكرناه.

وأما النوع الثاني وهو خمس الغنائم والمعادن والركاز، فنذكر مصرفه في كتاب السير.

وأما مصرف النوع الثالث من الخراج وأخواته فعمارة الدين، وإصلاح مصالح المسلمين وهو رزق الولاة، والقضاة وأهل الفتوى من العلماء، والمقاتلة، ورصد الطرق، وعمارة المساجد، والرباطات، والقناطر، والجسور، وسد الثغور، وإصلاح الأنهار التي لا ملك لأحد فيها.

وأما النوع الرابع فيصرف إلى دواء الفقراء، والمرضى وعلاجهم، وإلى أكفان الموتى الذين لا مال لهم، وإلى نفقة اللقيط وعقل جنايته، وإلى نفقة من هو عاجز عن الكسب وليس له من تجب عليه نفقته، ونحو ذلك. وعلى الإمام صرف هذه الحقوق إلى مستحقيها والله أعلم.

(بدائع الصنائع ۲/۶۸،۶۹) **فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔**

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۴ محرم الحرام ۱۴۲۰ھ

زکوۃ ادا کرنے میں کتنی تاخیر کر سکتے ہیں؟

سوال: ① سال رواں کی رقم جو زکوۃ کی ہے سال رواں ہی میں ختم ہونا چاہیے؟

② زکوۃ کی رقم کی تقسیم کے لیے جماعت ہی زکوۃ کمیٹی مقرر کرے، اور کچھ رقم بچائے تو جائز ہے؟

③ کیا زکوۃ کی رقم کسی اہم ضرورت کے لیے اس طرح کوئی مجبوری آجائے، تو

اس خیال کے لیے آئندہ سال کے لیے بچا سکتے ہیں؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

① دوسرا سال پورا ہونے سے پہلے ادا کردینی چاہیے، اس سے زیادہ تاخیر میں گناہ ہے۔

وقيل: فوري، أي واجب على الفور، وعليه الفتوىٰ كما في شرح الوهبانية، فيأثم بتأخيرها الفور بأول أوقات الإمكان، وقد يقال: المراد أن لايؤخر إلى العام القابل؛لما في البدائع عن المنتقىٰ بالنون: إذا لم يؤد حتىٰ مضىٰ حولان فقد أساء وأثم فتأمل(شامي ١٤/٢)

② آپ کا سوال سمجھ میں نہیں آیا، اگر بچانے سے مراد یہ ہے کہ دوسرا سال پورا ہونے کے باوجود کچھ رقم بچا کر رکھ لی اور مصارف کو نہیں دی، تو اس کا حکم جواب نمبر ایک میں آچکا ہے۔

③ اس کا جواب اوپر آچکا ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۴/محرم الحرام ۱۴۲۰ھ

زمین میں سے خزانہ نکل آئے تو کیا اُس کا استعمال جائز ہے؟

سوال: اگر کسی زمین سے مدفون خزانہ نکلے تو اُس کا استعمال جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

اگر یہ خزانہ کسی کی مملوک زمین سے درآمد ہوا ہے تو اُس کو دے دیا جاوے؛ ورنہ جس کو ملا ہے وہ اُس کو استعمال کرسکتا ہے بشرطیکہ اُس پر اہلِ اسلام کی علامت نہ ہو،

اگر اہلِ اسلام کی علامت ہے تو وہ لقطہ کے حکم میں ہے جس کا اعلان کر کے مالک تک یا اُس کے وُرثاء تک پہنچانا ضروری ہے۔ (درمختار، شامی ۲/ ۵۱، ۵۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

سونے چاندی کی زکوٰۃ میں یومِ ادا کی قیمت معتبر ہے

سوال: سونا، چاندی اور زیورات کی زکوٰۃ نکالتے ہوئے کس قیمت کا حساب ہوگا، موجودہ قیمت کا یا جس قیمت سے خریدا ہے اُس کا؟ اور کیا زیورات کی صنعت وبناوٹ کی رقم کا حساب زکوٰۃ نکالنے میں شمار کریں گے؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

اُس کی زکوٰۃ ادا کرنے کے دن جو قیمت ہو اُس کا اعتبار کیا جائے گا۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

املاہ: العبد احمد خانپوری، ۲۷/ ذی قعدہ ۱۴۲۴ھ

سونے اور چاندی کی زکوٰۃ کس ریٹ پر دی جائے؟

سوال: سونے کا ریٹ (بھاؤ) ڈلی کا اَور ہے اور بنے ہوئے زیور کا الگ ہے، کس نرخ (ریٹ) پر زکوٰۃ دی جائے؟ کیوں کہ بازار والوں کا دینے کا نرخ اَور ہے اور لینے کا الگ ہے، اگر فقراء کو سونا زکوٰۃ میں دیا جائے تو اُن کا نقصان ہوتا ہے؛ کیوں کہ بازار والے اُن سے کم قیمت سے خریدتے ہیں۔

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

جو نرخ (ریٹ) بازار میں ایسے سونے کا ہے یعنی جس قیمت کو دکان دار فروخت

کرتے ہیں وہ قیمت لگا کر زکوۃ دے، اگر سونا ہی زکوۃ میں دینا ہو تو موجودہ سونے کا چالیسواں حصہ زکوۃ میں دے دے، یہ بھی درست ہے اور زکوۃ ادا ہو جائے گی، اگرچہ فقراء کسی قیمت پر فروخت کر دیں۔ (فتاویٰ دارالعلوم ۶/ ۱۲۴) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

ادائیگیٔ زکوۃ کے لیے رپورٹ میں نام آنا ضروری نہیں

سوال: چندہ والے کو زکوۃ کی رقم دی، اور اُس سے رسید بھی وصول کی؛ مگر رپورٹ بک میں مزکّی کا نام نہیں آیا، تو کیا زکوۃ ادا ہوئی یا دوبارہ ادا کرنا ہوگا؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

زکوۃ کی وہ رقم اگر اپنے مصرف میں خرچ کی گئی ہے تو زکوۃ ادا ہو گئی، رپورٹ میں نام آیا ہو یا نہ آیا ہو۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

مستحقِ زکوۃ کا مزکی کو زکوۃ کی رقم لوٹانے کا حکم

سوال: ایک مستحقِ زکوۃ کو زکوۃ کی رقم دی گئی؛ مگر ایک مدت کے بعد مستحق نے ضرورت نہ ہونے کی بنا پر واپس کر دی، تو مزکی کے لیے لینا کیسا ہے؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

جس کو زکوۃ کی رقم دی گئی اور اُس نے قبول کر لی، اور وہ اگر مستحق زکوۃ ہے تو اُس کے ہاتھ جاتے ہی زکوۃ ادا ہو گئی اور وہ مالک بن گیا، اب اگر وہ واپس کرتا ہے تو

مزکی اُس کو قبول نہ کرے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

شیئرز (حصص) پر زکوٰۃ کونسی قیمت پر ہے؟

سوال: ایک شخص نے تجارتی کمپنی کے حصص خریدے، جب کمپنی شروع ہوئی تھی اُس وقت ایک حصہ پانچ سو روپے کا تھا، اور جس وقت اُس نے حصے خریدے اُس وقت ایک حصہ کی قیمت ایک ہزار تھی، اور اِس وقت ایک حصہ کی قیمت پانچ سو روپے ہے، تو یہ شخص کس قدر زکوٰۃ دے؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

جو قیمت اِس وقت ہے یعنی پانچ سو روپے کی ادا کرے۔ (فتاوی دار العلوم ۶/۱۴۶)

فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

صدقۂ فطر اور زکوٰۃ کی ادائیگی عید کے بعد

سوال: مَیں یہاں نیوزی لینڈ کی مسجد جس کا نام "مسجدِ عمر ماؤنٹ روسکل" ہے، اُس میں پندرہ سال سے ٹرسٹی ہوں، اور ٹرسٹ کے اندر خزانچی کی ذمہ داری ادا کر رہا ہوں، اور الحمد للہ ہمیشہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے فضل وکرم سے اُس کو حاضر ناظر رکھ کر خدمت انجام دے رہا ہوں، اب چند سوال یہ ہیں:

مسلم آبادی کے اعتبار سے سب سے بڑا ایریہ (Area) ماؤنٹ روسکل ہے،

اور کئی مسلم ممالک اور غیر مسلم ممالک کی آبادی یہاں پر ہے، اور ٹرسٹ زکوٰۃ اور فطرہ کی رقم جمع کر کے عالمی پیمانے پر مختلف مسلم برادری کے ذریعہ ہر رمضان میں تقسیم کرتا ہے، شرعی اعتبار سے اِس میں کوئی تفصیل ہو تو مطلع فرمائیں؛ کیوں کہ صدقۃ الفطر نماز عید کے بعد مستحقین تک پہنچتا ہے۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً

''عمدۃ الفقہ'' میں ہے: لوگوں کے لیے مستحب یہ ہے کہ عید الفطر کے روز طلوع فجر کے بعد عید گاہ کو جانے سے پہلے صدقۂ فطر ادا کریں، اور یہ اِس لیے ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد کی تعمیل ہو جائے، اور آپ کے فعل کی پیروی ہو، اور اِس قول و فعل کو ''حاکم'' وغیرہ نے حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عید گاہ تشریف لے جانے سے پہلے صدقۂ فطر نکالتے تھے، اور ہمیں حکم فرماتے تھے کہ ہم نمازِ عید سے پہلے صدقۂ فطر نکالیں، اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مصلیٰ (عید گاہ) کی طرف تشریف لے جانے سے پہلے اِس کو تقسیم فرماتے تھے، اور ارشاد فرماتے تھے کہ: غرباء کو اِس روز در بدر پھرنے سے بے نیاز کر دو، اور صحیحین میں بھی اِس کی اصل موجود ہے، اور یہ غنی کر دینے کا حکم استحباب کے لیے ہے یعنی اَولیٰ ہے۔ (عمدۃ الفقہ ۳/ ۱۶۷، ۱۶۸)

عبارتِ بالا سے معلوم ہوا کہ بہتر یہ ہے کہ صدقۂ فطر کی رقم عید گاہ جانے سے پہلے فقراء کے ہاتھوں میں پہنچا دی جائے؛ لیکن اگر ایسا نہ ہوا؛ بلکہ عید کے بعد وہ رقم مستحقین تک پہنچی تو بھی صدقۂ فطر ادا ہو جائے گا۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

صدقاتِ واجبہ قبل از تقسیم ہلاک ہوجائے تو ضمان آئے گا؟

سوال: کبھی کسی مجبوری کی وجہ سے زکوۃ کی رقم کو محفوظ مقامات تک نہ پہنچایا جائے، مثلاً: اتوار ہے، بینک بند ہے، اور وہ رقم گھر میں محفوظ جگہ پر ہے، اُس میں اگر چوری ہوجائے تو کیا حکم ہے؟ بڑے افسوس کے ساتھ مَیں آپ کو بتاؤں کہ پندرہ سال میں پہلی مرتبہ ایسا ہوا، کہ زکوٰۃ اور فطرہ اور للہ رقم تقریباً ۱۲ یا ۱۴ ہزار ڈالر تھے، اتفاقاً عید اتوار کو تھی اور مَیں اُس کو بینک میں جمع نہیں کرسکا، اور گھر سے ہم لوگ غائب تھے، میری ساس کے مکان پر ملاقات کے لیے گئے ہوئے تھے، اِتنے وقفہ میں (۴۵ منٹ کے وقفہ) چور آئے اور دروازہ توڑ کر اُس روز کا ڈونیشن (زکوٰۃ، فطرہ، للہ) لے گئے، تو جن لوگوں نے زکوٰۃ دی تھی اُن کا فریضہ ساقط ہوا یا نہیں؟ جن لوگوں نے فطرہ دیا اُن کو فطرہ کا ثواب ملا یا نہیں؟ اُن کا ذمہ ساقط ہوا یا نہیں؟ یا اگر ہم ٹرسٹ مل کر اندازاً اِتنی رقم نکال دیں تو ذمہ ساقط ہوجائے گا؟ یاد رہے کہ ابھی تک مَیں اُس کو گن نہیں پایا تھا، عید کی نماز کے بعد ۱۱ر بجے کے قریب مَیں گھر پہنچا، اور یہ واردات پونے ایک سے ڈیڑھ بجے تک میں ہوئی، کیا مجھ پر اِس کی کسی طرح کی ذمہ داری ہے؟ مجھے کیا کرنا چاہیے؟ آپ اِس کا شرعی حل فرمائیں۔

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

آپ ٹرسٹی حضرات لوگوں کے پاس سے جو رقم زکوٰۃ، صدقۃ الفطر اور للہ کے نام سے وصول کر کے اُن رقوم کو حسبِ صواب دید مختلف مصارف پر خرچ کرتے ہیں، اور یہ سلسلہ سالہا سال سے اِسی طرح جاری ہے، عید الفطر کے موقعہ پر لوگ آپ ٹرسٹیان

کو اِس نوع کی رقمیں سپرد کرتے ہیں، آپ ٹرسٹیان کی حیثیت اُن رقوم میں وکیل کی ہے، گویا آپ حضرات مالکانِ اموال کی طرف سے اُن کی زکوٰۃ یا صدقۂ فطر یا عطیات کی رقوم کو اُن کے مصارف تک پہنچانے کا کام کرتے ہیں، آدمی کسی کام کے لیے وکیل بنایا جائے اُس کی انجام دَہی کے لیے جو مال اُس کے حوالہ کیا جاتا ہے وہ مال وکیل کے قبضہ میں امانت کی حیثیت رکھتا ہے، اور شرعاً امانت کا حکم یہ ہے کہ: وکیل نے یا جس کے پاس امانت ہے اُس نے اُس کی حفاظت میں اپنی طرف سے کوئی کوتاہی نہیں کی؛ بلکہ عام طور پر جس طرح اُس کی حفاظت کی جاتی ہے اور آدمی اپنے مال کی حفاظت کرتا ہے، اِسی طرح اُس نے اُس کی حفاظت کی، اِس درمیان وہ مال ضائع ہوگیا، مثلاً: چوری ہوگیا یا آگ لگنے کی وجہ سے جل گیا، تو وہ شخص اُس مال کا ضامن نہیں۔

صورتِ مسئولہ میں عید کی نماز کے وقت زکوٰۃ، صدقۂ فطر اور اللہ کے نام سے جو رقمیں آپ حضرات نے لوگوں سے وصول کیں، اُن میں آپ کی حیثیت وکیل ہونے کی وجہ سے امانت دار کی ہے، اب اُس روز اتوار ہونے کی وجہ سے آپ وہ رقم بینک میں جمع نہ کرا سکے، اور جب تک بینک کھلے وہاں تک کے لیے اپنے گھر میں حفاظت سے رکھا جس طرح اپنے مال کو رکھا جاتا ہے، اور تھوڑے سے وقت کے لیے اپنے سسرال میں ملاقات کے لیے گئے، اِس درمیان چوروں نے آکر اُن رقوم پر ہاتھ صاف کرلیا، تو اِس میں آپ پر کوئی ضمان نہیں، اور آپ گنہ گار بھی نہیں؛ البتہ زکوٰۃ اور صدقۃ الفطر کی وہ رقمیں مستحقین تک نہیں پہنچیں؛ اِس لیے دینے والوں کی زکوٰۃ اور صدقۂ فطر ادا نہیں ہوا، اور یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی آدمی زکوٰۃ کا حساب کرکے زکوٰۃ کی واجب شدہ مقدار الگ کرکے اپنے گھر میں رکھے اور چوری ہوجائے، یا جیب میں لے کر مستحقین

کو دینے کے لیے جارہا تھا اور جیب کٹ جائے؛ بہر حال زکوۃ اور صدقۂ فطر ادانہ ہونے کی وجہ سے اُن لوگوں کو چاہیے کہ وہ اپنی زکوۃ اور صدقۂ فطر دوبارہ نکال کر مستحقین تک پہنچائیں، آپ اِس کا اعلان کردیں اور اوپر جو مسئلہ بتلایا گیا اُس سے لوگوں کو واقف کردیں، آپ کی ذمہ داری پوری ہوجائے گی، اِس کے بعد بھی خدانہ کرے کوئی شخص آپ پر خیانت کا الزام عائد کرے تو صبر اور تحمل سے کام لیں، اُلجھنے کی ضرورت نہیں۔

الأمانة غير مضمونة، يعني على تقدير هلاكها أو ضياعها بدون صنع الأمين وتقصيره، ولا يلزم الضمان يعني إذا هلكت الأما نة أو فقدت أو طرأ نقصان على قيمتها في يد الأمين بدون صنعه وتعديه وتقصيره في الحفظ لايلزم الضمان على الأمين المذكور، سواء أهلكت بسبب ممكن التحرز منه كالسرقة، أم بسبب غير ممكن التحرزمنه كالحريق الغالب، وسواء أهلك مال الأمين مع الأمانة المذكورة أم لم يهلك، وسواء أشرط الضمان أم لم يشرط راجع شرح المادة ٨٣.
(درر الحكام شرح مجلة الاحكام ٢/ ٢٠٢)

الوكالة المال الذي قبضه الوكيل والرسول من جهة الوكالة ومن جهة الرسالة أمانة في يدهما راجع المادة (١٤٦٣) (أيضا ٤/ ٢٠٣)

(المال الذى قبضه الوكيل بالبيع والشراء وإيفاء الدين واستيفائه وقبض العين من جهة الوكالة في حكم الوديعة في يده، فإذا تلف بلا تعد ولاتقصير لا يلزم الضمان، والمال الذي في يد الرسول من جهة الرسالة أيضا في حكم الوديعة) (ايضا ٣/ ٥٨٢) **فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔**

املاہ: العبد احمد خانپوری، ۲۴/شوال المکرم ۱۴۲۵ھ
الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ

زکوۃ کی رقم ضائع ہونے پر ضمان نہیں

سوال: ہمارے شہر میں غریب فنڈ کے نام سے ایک سوسائٹی ہے، اِس میں لوگ اپنی زکوۃ کی رقم جمع کرواتے ہیں، پھر ذمہ دارانِ فنڈ بتدریج غرباء اور مستحقین پر صَرف کرتے ہیں، سوال یہ ہے کہ زکوۃ کا روپیہ فنڈ میں داخل کرتے ہی زکوۃ ادا ہوجائے گی یا غرباء اور مستحقین پر تقسیم کرنے کے بعد ادا ہوگی؟ اگر ثانی صورت ہے تو قبل التقسیم خدانخواستہ کسی آفت یا چوری وغیرہ سے نقصان ہوگیا تو زکوۃ نکالنے والے کے ذمہ سے زکوۃ ساقط ہوگی یا ذمہ دارانِ فنڈ پر ضمان آئے گا؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

فقراء ومساکین میں تقسیم ہونے کے بعد ہی زکوٰۃ ادا ہوگی؛ اِس لیے چوری ہوجانے یا آفت کا شکار ہوجانے کی صورت میں معطیین کی زکوۃ ادا نہیں ہوئی، اگر سوسائٹی کے ذمہ داران نے حفاظت میں غفلت نہیں برتی تو اُن پر ضمان بھی نہیں۔

(احسن الفتاویٰ ۴/۲۸۹، فتاویٰ محمودیہ ۳/۴۷) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

سوال: ذمہ دارانِ فنڈ کسی دوسرے معتمد شخص کو تقسیمِ زکوۃ کے لیے وکیل بنائیں، اور یہ وکیل اپنی ذمہ داری پوری کوشش اور حفاظت کے ساتھ پوری کر رہا ہے، اِس کے باوجود خدانخواستہ کسی آفت یا چوری وغیرہ سے رقم ضائع ہوجائے تو اِس پر ضمان آئے گا یا نہیں؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

صورتِ مسئولہ میں وہ ضامن نہیں ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

زکوۃ کی رقم چوری ہوگئی تو زکوۃ ادا نہ ہوگی

سوال: زکوۃ کی رقم کسی نے نکال کر رکھی اس میں سے کچھ کی ادائیگی کی اور کچھ باقی رہ گئی اور وہ بقیہ رقم چوری ہوگئی، تو ایسی صورت میں زکوۃ ادا ہوگی کہ نہیں؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

جتنی رقم چوری ہوگئی اتنی زکوۃ ادا نہیں ہوئی، اتنی مقدار دوبارہ نکال کر مصرف میں خرچ کرے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۷/ رمضان المبارک ۱۴۱۶ھ

اپنا قرض وصول کرنے کی شرط کے ساتھ زکوۃ دینا

سوال: میں ایک آدمی کا مقروض ہوں، ایک بڑی رقم اُس کی مجھ پر بطورِ قرض واجب الادا ہے، قرض خواہ مجھے یہ کہہ رہے ہیں کہ: مَیں تجھے اپنی زکوۃ کی رقم اِس شرط پر دینے کے لیے تیار ہوں کہ تم اِس رقم سے میرا قرض ادا کردو، اِس وقت میری حیثیت اُس کا قرض ادا کرنے کی بالکل نہیں ہے، میرے پاس کوئی رقم یا جائداد قرض کی ادائیگی کے لیے نہیں، تو سوال یہ ہے کہ: مَیں اپنے اُس قرض خواہ کے پاس سے زکوۃ اِس شرط پر لے سکتا ہوں کہ بعد میں وہ رقم اُنہیں کو اُن کے قرض کی ادائیگی میں لوٹا دوں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً

قرض خواہ کے لیے اِس طرح کی شرط لگانا مناسب نہیں، اِس کو اِس طرح کی شرط لگائے بغیر بھی شرعاً یہ حق حاصل ہے کہ، اپنی زکوۃ کی رقم بنیتِ ادائے زکوۃ آپ کو دے کر آپ سے جبراً وصول کر لے، پھر بھی اگر ایسی شرط کر کے زکوۃ کی رقم آپ کو دی اور اِس سے آپ نے اُس کا قرض ادا کیا، تو یہ بھی درست ہے، اِس طرح اُس کی زکوۃ ادا ہو جائے گی اور آپ کا قرضہ بھی ساقط ہو جائے گا۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

املاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۱/ محرم الحرام ۱۴۲۵ھ
الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ

وکیل کا صدقہ کی رقم کو اپنے استعمال میں لے آنا

سوال: اگر کسی صاحب نے یا گاؤں کے ذمہ داروں نے کچھ رقم جو للہ تھی امام صاحب کو دی، اور وکیل بنایا کہ جہاں ضرورت ہو آپ اِس رقم کو چندہ میں دیتے رہیں، اب امام صاحب خود مقروض ہیں، اور کوئی ذرائعِ آمدنی نہیں ہے، تو کیا وہ للہ رقم کو اپنی ضروریات میں لا سکتے ہیں؟ اور اگر امام صاحب گاؤں والوں کے سامنے ظاہر بھی کریں تو یہ مناسب معلوم نہیں ہوتا۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً

اگر امام صاحب کو صرف اِتنا کہا گیا ہے کہ: آپ یہ رقم مواقعِ ضرورت میں صَرف فرمائیں یا اُس کو اختیار دیا ہے، تو اِس صورت میں اپنے اوپر خرچ کر سکتا ہے؛ لیکن اگر چندہ میں دینے کا لفظ کہا گیا ہے تو اِس صورت میں اپنے اوپر خرچ نہیں کر سکتا؛ اِس

لیے کہ ہمارے عرف میں چندہ میں دینے کا مطلب اپنے اوپر خرچ کرنا نہیں ہے۔

وللوكيل بدفع الزكوة أن يدفعها إلى ولد نفسه كبيرا كان أوصغيرا وإلى امرأته الخ (البحر الرائق ۲/ ۲۲۷) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

زکوٰۃ وغیرہ کے وکیل کا رقم زکوٰۃ کو اپنے استعمال میں لانا

سوال: ایک صاحب نے ایک شخص کو کچھ رقم دے کر وکیل بنایا، جس میں زکوٰۃ وچرم قربانی کی رقم وصدقہ وللہ کی رقم تھی اور وہ وکیل صاحب خود ضرورت مند ہیں تو کیا وہ رقم اور کونسی رقم اپنی ضرورت میں استعمال کرسکتا ہے؟

الجواب: حامداً ومصلياً ومسلماً

جو رقم زکوٰۃ وصدقات وغیرہ کی تقسیم کرنے کے لیے اس کو وکیل بنایا گیا ہے، اس کو وہ خود اپنی ضرورت میں استعمال نہیں کرسکتا، چاہے خود ضرورت مند کیوں نہ ہو۔

وللوكيل أن يدفع لولده الفقير وزوجته لا لنفسه (درمختار ۳/ ۱۸۸ زکریا) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

حاجت مند کے لیے دی ہوئی رقم خود رکھنا

سوال: زید نے عمر سے کہا کہ یہ سو روپیہ کسی حاجت مند کو دینا، اب عمر خود حاجت مند ہے، تو وہ ان روپیوں کا استعمال کرسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً ومصلياً ومسلماً

نہیں۔

وللوكيل أن يدفع لولده الفقير وزوجته لا لنفسه (درمختار/٣ ١٨٨زکریا)
فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

سو روپیہ پر کتنی زکوۃ ہوگی؟

سوال: اِس دور کے سو روپیہ میں کتنے روپیہ بطورِ زکوۃ واجب ہوں گے؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

زکوۃ میں چالیسواں حصہ واجب ہوتا ہے؛ اِس لیے سو روپیہ پر ڈھائی روپیہ نکالے بشرطیکہ مقدارِ نصاب ہو۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

بیوی کا شوہر کے مال میں سے زکوۃ یا قربانی دینا

سوال: کیا بیوی شوہر کی چوری سے زکوۃ اور قربانی دے سکتی ہے؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

بیوی اگر اپنے مال میں سے زکوۃ ادا کر رہی ہے یا قربانی دے رہی ہے تو اِس میں شوہر کی اجازت لینے کی ضرورت نہیں، اِس کا یہ تصرف اپنے مال میں ہونے کی وجہ سے شوہر کی اجازت پر موقوف نہیں؛ البتہ اُس کو بتلا دینا مناسب ہے؛ تاکہ غلط فہمی کا باعث نہ ہو۔ اور اگر شوہر کے مال میں سے دے رہی ہے تو ایسا کرنا جائز نہیں، پھر بھی اُس کی قربانی اور زکوۃ ادا ہو جائے گی، اور شوہر کی اِتنی رقم کا تاوان عورت پر

باقی رہے گا۔فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

صدقہ کو ہدیہ کے نام سے دیا جاسکتا ہے

سوال: صدقہ دیتے وقت سامنے والے کو یہ کہنا لازمی ہے کہ: یہ صدقہ کی رقم ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً

اگر وہ صدقہ کا مصرف ہے تو اُس کو صدقہ دیتے وقت یہ کہنا ضروری نہیں ہے کہ: یہ رقم صدقہ کی ہے؛ بلکہ مصرف ہونے کے باوجود اگر وہ لینے میں شرم محسوس کرتا ہو تو ہدیہ کے نام سے بھی دیا جاسکتا ہے، اپنے دل میں نیت صدقہ کی کرے۔فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

فروخت نہ ہونے والی چیز زکوۃ میں دینا کیسا ہے؟

سوال: ایک دکان دار سے ایک چیز نہیں بکتی، کیا وہ چیز زکوۃ میں دی جاسکتی ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً

رَدِّی، خراب چیز زکوۃ میں دینا اخلاص کے خلاف ہے، تاہم اِس چیز کی جتنی مالیت بازار میں ہو اُس کے دینے سے اُتنی زکوۃ ادا ہو جائے گی۔ (آپ کے مسائل اور اُن کا حل ۳/۳۸۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

شوہر کی اجازت کے بغیر بیوی نے اپنی بہن کو کچھ رقم دی تو اس کی زکوٰۃ کس پر واجب ہے؟

سوال: ہندہ نے پچیس ہزار کی رقم اپنے شوہر کی اجازت کے بغیر اس کے شوہر کی رقم میں سے- جو اس کو خرچ کے لیے دی جاتی تھی- لے جا کر اپنی چھوٹی بہن کو مکان خریدنے کے لیے دی، اب سوال یہ ہے کہ ہندہ کو ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اس کے شوہر کی اجازت کے بغیر اس نے ایسا قدم اٹھایا تو عند اللہ گنہگار ہوگی یا نہیں؟ اس رقم کی زکوٰۃ ہندہ پر عائد ہوگی یا نہیں؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

گھریلو مصارف کے لیے جو رقم شوہر بیوی کو دیتا ہے، اس میں سے بغیر اجازت شوہر کسی کو دینا چاہے تو نہیں دے سکتی، اجازت کبھی تو صریح ہوتی ہے اور کبھی عرف کی وجہ سے حکماً ہوتی ہے، مثلاً: اس رقم میں سے کسی بھکاری کو کچھ دے دینا وغیرہ، صورتِ مسئولہ میں جو رقم ہندہ نے بچائی ہے، وہ شوہر کی ملک ہے، اس لیے جائز نہیں تھا کہ وہ رقم اپنی بہن کو دیتی، اب جب کہ وہ دے چکی ہے، وہ اس کی ضامن ہے، شوہر اس سے واپسی کا مطالبہ کر سکتا ہے؛ نیز اس رقم کی زکوٰۃ ہندہ پر نہیں؛ بلکہ شوہر پر واجب ہے، اس لیے کہ اس کا مالک شوہر ہے، اور اگر وہ رقم شوہر نے ہندہ کو اس کے ذاتی مصارف کے لیے دی تھی، تو اس کی مالک ہندہ ہے، اگر اس نے اس میں سے کچھ بچا کر اپنی بہن کو دیا تو درست ہے؛ البتہ اس کے لیے مناسب تھا کہ اس سلسلہ

میں شوہر سے مشورہ کرتی۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۳/ ربیع الاول سنہ ۱۴۱۱ھ

قرض دی ہوئی رقم میں زکوۃ کی نیت کرنا کیسا ہے؟

سوال: کوئی غریب شخص قرض لی ہوئی رقم کو آج تک واپس نہیں کر سکا اور نہ ہی امید ہے، اب کیا ہم اُس قرض دی ہوئی رقم کو زکوۃ کی نیت کر کے چھوڑ دیں تو زکوۃ ادا ہو جائے گی؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً

جو صورت آپ نے لکھی ہے اُس سے زکوۃ ادا نہیں ہوگی؛ کیوں کہ زکوۃ ادا کرتے وقت نیت کرنا شرط ہے۔ (آپ کے مسائل اور اُن کا حل ۳/ ۳۸۳)

نوٹ: اپنی قرض میں دی ہوئی رقم وُصول کرنے میں یہ صورت اختیار کی جا سکتی ہے کہ مقروض کو زکوۃ کی رقم دے کر مالک بنا دیں، پھر جب وہ مالک ہو جائے اپنا قرض وُصول کر لیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

مقروض نے زکوۃ کی رقم واپس کر دی تو کیا کرے؟

سوال: ایک ضرورت مند نے ایک دوست سے قرض لیا، دینے والے نے زکوۃ کی نیت سے قرض دیا وہ حقیقت میں زکوۃ کا مستحق تھا۔ کچھ مدت کے بعد مقروض نے وہ رقم واپس کی، قرض دینے والے نے کہا میں نے تو ہدیہ دیا تھا، مقروض نے لینے سے

انکار کیا کہ مجھے ہدیہ کی ضرورت نہیں ہے اور وہ رقم چھوڑ کر چلا گیا اب اس رقم کا کیا کرے؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

مقروض کو بتلا دیا جائے کہ جس وقت یہ رقم دی گئی تھی اس وقت ہدیہ دیا گیا تھا۔ اور اس پر آپ کا قبضہ ہو چکا ہے۔ آپ اس کے مالک بن چکے اور آپ نے وہ رقم اپنی ضرورت میں استعمال کر لی اب یہ رقم جو آپ دے رہے ہیں، بعینہ وہ رقم نہیں ہے بلکہ دوسری ہے ہمارے لیے اس کا لینا جائز نہیں ہے۔ یہ رقم آپ کی ملک ہے آپ اسے واپس لے لیجئے اور اگر آپ ہمیں دینا ہی چاہتے ہیں تو واپسی کی نیت سے نہیں (اس لیے کہ اصل رقم خرچ ہو جانے کی وجہ سے واپسی شرعاً ممکن نہیں رہی) بلکہ ہدیہ کے طور پر دیں۔ اگر وہ اپنی طرف سے ہدیہ کے طور پر دیتے ہیں تو آپ کے لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۵/ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۴ھ
الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

کل رقم کے چالیسویں حصہ کی زکوۃ

سوال: تنخواہ کے جو پیسے کھاتہ میں جمع رہتے ہیں یا اور دوسری کمائی کے پیسوں کی زکوۃ بھی ہم رمضان میں ادا کرتے ہیں، تو کتنی زکوۃ ہوگی؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

آپ نے اپنی زکوۃ کے سال کو پورا کرنے کے لیے اگر رمضان کی پہلی تاریخ مقرر کر لی ہے تو اس صورت میں رمضان کی پہلی تاریخ کو آپ کی تنخواہ کی جو رقم اور اس

کے علاوہ دوسری کمائی کی بھی جو رقمیں آپ کے کھاتہ میں جمع ہیں، اور ساتھ ہی آپ کے ہاتھ میں جو نقد رقم موجود ہو ان سب کو ملا کر اس مجموعہ کا چالیسواں حصہ زکوۃ کے طور پر نکالنا ضروری ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

املاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۳۰/ ربیع الاول ۱۴۲۹ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ　　　الجواب صحیح: عبدالقیوم راجکوٹی

شرائط کے ساتھ زکوۃ دینا

سوال: (۱) شرائط کے ساتھ زکوۃ دینا کیسا ہے؟ مثلاً مستحق کو یہ کہہ کر زکوۃ کی رقم دینا کہ اگر آپ نے زکوۃ کی رقم کسی اَور سے لی اور کمیٹی کو معلوم ہو گیا کہ آپ اَور جگہ سے بھی زکوۃ کی رقم لیتے ہیں، جب کہ کمیٹی آپ کا پورا جائز خرچ دیتی ہے، تو ہم آپ کو زکوۃ کی رقم دینا بند کر دیں گے۔

(۲) زکوۃ یا للہ رقم جس مستحق کو بھی دیوے اور اس سے یہ تحریر کروالیں، کہ مجھ کو زکوۃ کی رقم مل گئی ہے، تو ایسا کرنا درست ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً

(۱) ان کو ہدایت کی جاسکتی ہے، شرط نہیں لگائی جاسکتی؛ البتہ معلوم ہونے پر بند بھی کی جاسکتی ہے۔

(۲) کمیٹی اپنا نظم اور حساب ٹھیک رکھنے کے لیے وصولی کی رسید لکھوا سکتی ہے، مناسب یہ ہے کہ اس میں رقم کا ذکر مطلق کیا جائے زکوۃ کی صراحت نہ کی جائے؛

تا کہ لینے والا خِفَّت محسوس نہ کرے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۸ رشوال المکرم ۱۴۲۰ھ

الجواب صحیح: عباس داود بسم اللہ

زکوۃ کی رقم سے تعلیمی مشکل کا حل

سوال: ماں باپ شرعاً زکوۃ کے مستحق نہیں ہے؛ لیکن آج کے دور کے حساب سے دنیوی تعلیم کے لیے خرچ بھاری ہوتا ہے، جس کو ماں باپ برداشت نہیں کر سکتے، تو ان طلبا پر زکوۃ کی رقم بالغ اور نابالغ دونوں قسم پر صرف کرنا کیسا ہے؟ اگر نہیں کر سکتے ہیں تو کوئی اچھی صورت بتائیں کہ ان پر استعمال کر سکیں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً

بالغ اولاد پر تو خرچ کی جا سکتی ہے؛ لیکن نابالغ کا باپ اگر صاحب نصاب ہے تو اس پر صرف کرنا درست نہیں ہے۔ باپ قرض لے کر خرچ کرے اس کے بعد اس کا قرضہ زکوۃ سے ادا کیا جا سکتا ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۸ رشوال المکرم ۱۴۲۰ھ

الجواب صحیح: عباس داود بسم اللہ

زکوۃ کی رقم بہ طور قرض للہ مد میں دینا

سوال: اگر ہمارے پاس (بیت المال میں) زکوۃ کی رقم زیادہ ہے اور للہ رقم نہیں ہے، اور مصرف ہمارے سامنے للہ کا آ گیا، یا ہمارے پاس للہ رقم ہے اور مصرف

زکوۃ کا آ گیا، تو کیا للہ رقم زکوۃ کے مستحق کو اور زکوۃ کی رقم للہ کے مستحق کو عارضی طور پر ایک دوسرے مصرف میں استعمال کرنا اور رقم آنے پر اس مد میں رکھ لینا کیسا ہے؟ اگر جائز نہیں تو شریعت نے کوئی جائز حیلہ بتایا ہو تو مطلع فرمائیں۔

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

للہ کی جو رقم ہے وہ مصرفِ زکوۃ کو دی جاسکتی ہے؛ اس لیے کہ جب وہ زکوۃ کا مصرف ہے تو للہ کا مصرف کیوں نہیں!؛ البتہ اس کے برعکس صورت ہو تو زکوۃ کی رقم بہ طورِ قرض للہ مد میں رقم دینے والوں کی اجازت سے استعمال کی جاسکتی ہے، بعد میں جب للہ رقم آئے تو اتنی رقم مدِ زکوۃ میں رکھ دی جائے۔

قال الشرنبلالي في رسالته: ذكروا أنه يجب عليه أن يجعل لكل نوع منها بيتا يخصه، ولا يخلط بعضه ببعض، وأنه إذا احتاج إلى مصرف خزاذ وليس فيها ما يفي به يستقرض من خزانة غيرها، ثم إذا حصل للتي استقرض لها مال يرد إلى المستقرض منها؛ إلا أن يكون المصروف من الصدقات أو خمس الغنائم علىٰ أهل الخراج وهم فقراء؛ فإنه لا يرد شيئا لاستحقاقهم الصدقات بالفقر إلخ (شامي ٢/٦٣) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

الجواب صحیح: عباس داود بسم اللہ

مستحق کے اکاؤنٹ میں جمع کرنے سے زکوۃ کی ادائیگی

سوال: ایک شخص سالانہ زکوۃ نکالتا ہے، اور اپنے چند قریبی رشتے دار جن کو دینا روا ہے چوں کہ ان کے حالات از روئے معاشرت درست نہ ہونے کی بناء پر یہ زکوۃ

ان لوگوں کے نام بینک یا پوسٹ کھاتہ نکال کر ان کی دستخط سے انھیں کے نام سالانہ بمقدار معینہ جمع کرتا ہے، یہ آفس کی ملکیت ہے، ان کی بغیر اجازت اور بغیر دستخط کے نکالی نہیں جاسکتی، یہ عمل اس لیے کرتا ہے کہ وہ وقت ضرورت پر اس کا صحیح استعمال کرسکیں؛ تاکہ وقت ضرورت پر ان کو قرضہ وغیرہ لینا نہ پڑے، کیا اس طرح زکوۃ کی رقم ان کے ناموں پر جمع کرنے اور ان کی ملکیت میں داخل کرنے سے ادا ہوجاتی ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

بینک یا پوسٹ میں اکاؤنٹ مستحق زکوۃ کے کہنے سے کھلوایا ہے، اور اسی کی طرف سے اس میں رقم جمع کرائی ہے کہ اب اس کے دستخط اور اس کی اجازت کے بغیر کوئی دوسرا وہ رقم نہیں نکال سکتا، تب تو تملیک پائی جانے کی وجہ سے مزکی کی زکوۃ ادا ہوجائے گی۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۱ر رمضان المبارک ۱۴۲۰ھ
الجواب صحیح: عباس داود بسم اللہ

نظام زکوۃ کے لیے بیت المال قائم کرنا

سوال: ہم کچھ افراد نے مل کر ایک کمیٹی بنائی ہے، جس کا نام ”توکل بیت المال ٹرسٹ“ ہے، اس میں ہم اراکین اور دیگر افراد جو اپنی رضامندی سے زکوۃ کی رقم جمع کرتے ہیں، تو کیا اس طور پر اجتماعی طریقہ سے زکوۃ کا نظام بنا کر مستحقین کو پہنچانا شرعاً کیسا ہے؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

زکوۃ وغیرہ کا ایسا انتظام کرنا کہ تمام وہ حضرات جن پر زکوۃ فرض ہے وہ اپنی زکوۃ

یکجا جمع کریں، اور اس کو صحیح مصارف پر خرچ کیا جائے، بہت مناسب اور پسندیدہ ہے؛ مگر اس میں جبر کی صورت اختیار نہ کی جائے کہ ہر شخص اپنی زکوۃ لازمی طور پر بیت المال ہی کو دے، اور بیت المال کے لوگ اس پر جا کر مسلط ہو جائیں؛ کیوں کہ یہ بیت المال، شرعی بیت المال نہیں ہے؛ بلکہ نام کا بیت المال ہے۔ (ماخوذ از فتاویٰ محمودیہ ۱۳/ ۹۵، ۹۶) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۱/ شوال المکرم ۱۴۲۰ھ
الجواب صحیح: عباس داود بسم اللہ

ہدیہ کے نام سے صدقہ دینا

سوال: صدقہ دیتے وقت سامنے والے کو یہ کہنا لازمی ہے کہ یہ صدقہ کی رقم ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً

اگر صدقہ کا مصرف ہے تو اس کو صدقہ دیتے وقت یہ کہنا ضروری نہیں کہ یہ رقم صدقہ کی ہے؛ بلکہ مصرف ہونے کے باوجود اگر وہ لینے میں شرم محسوس کرتا ہو تو ہدیہ کے نام سے بھی دیا جا سکتا ہے، اپنے دل میں صدقہ کی نیت کرے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

العبد احمد خانپوری، ۱۵/ محرم الحرام ۱۴۲۴ھ
الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ

كتاب الصوم

باب رؤية الهلال

ثبوتِ ہلال میں گذشتہ ماہ کا اعتبار

سوال : ذی الحجہ کے ۲۹/ چاند کی کہیں سے بھی اطلاع نہیں تھی؛ لیکن ذیقعدہ کے ۲۹/ چاند کی اطلاع موصول ہوگئی، تو اِس حساب سے ذیقعدہ کے ۳۰/ دن منگل کو پورے ہو جاتے تھے، جس کی بنا پر چند جگہ عیدالاضحیٰ بدھ ۵/ اگست ۱۹۸۷ء کو منائی گئی، تو کیا ثبوتِ ہلال میں گذشتہ مہینہ کا اعتبار کیا جائے گا؟ برائے کرم اِس مسئلہ کو ضرور واضح فرمائیں۔

الجواب : حامداً ومصلیاً ومسلماً

اگر شوال کی رویتِ ہلال بطریقِ موجب حاصل ہوئی اور اُس کے حساب سے ذوالقعدہ کے تیس دن پورے کیے ہیں تو عید کر سکتے ہیں۔

فیلزم أهل المشرق برؤية أهل المغرب إذا ثبت عندهم رؤية أولئك بطريق موجب كما مر (درمختار علی هامش الشامي ۲/۱۰۵) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

ثبوتِ ہلال میں شہادت کا محل ہونا ضروری ہے

سوال : سعودی عربیہ میں قرانِ شمس وقمر سے پہلے اور قرانِ شمس وقمر کے وقت یا قرانِ شمس وقمر کے چند گھنٹوں ہی کے بعد رویتِ ہلال کا فیصلہ کیا جاتا ہے، آیا اُسے معتبر

مانا جائے گا یا نہیں؟ وہاں کے علمائے کرام فرماتے ہیں کہ ہم آبزرویٹی رصد گاہوں کا کوئی اعتبار نہیں کرتے ہیں، ہم صرف رویتِ ہلال کا اعتبار کرتے ہیں، تو اب شریعتِ اسلامیہ کا اِس بارے میں کیا حکم ہے؟ آیا چاند کی رویت کو بھی آبروزیٹی کی کسوٹی پر پرکھا جانا ضروری ہے یا صرف دین دار مسلمانوں کی رویت کا اعتبار کر کے اُسے قبول کیا جا سکتا ہے، جیسا کہ سعودیہ کے علمائے کرام قبول فرماتے ہیں؟ حالاں کہ وہ رویت قرانِ شمس وقمر سے قبل یا متصل یا چند ہی گھنٹے بعد ہو۔

اِس بارے میں آپ ہماری رہنمائی فرمائیں، ہم انگلینڈ میں- جہاں کبھی بھی چاند نظر نہیں آتا ہے- مجبورِ محض ہیں، ملک میں سعودیہ کے چاند پر فیصلہ کرنا چاہتے تھے؛ مگر ایک عالمِ دین نے یہ بات کہہ کر کہ: سعودیہ میں قرانِ شمس وقمر سے پہلے یا متصل یا چند ہی گھنٹوں کے بعد رویتِ ہلال کا فیصلہ ہوتا ہے جو غلط ہے، ہمارے فیصلہ کو ٹھکرا دیا؛ اِس لیے آں جناب کی طرف رجوع ہو کر دریافت کرتے ہیں، اِس سے قبل آں جناب کی خدمت میں سعودیہ کے علمائے کرام کے فیصلوں کی نوعیت کا رسالہ ارسال کیا جا چکا ہے۔

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

چاند کا نکلنا سب مقامات پر بیک وقت نہیں ہے؛ بلکہ اِس میں قدرت کا پیدا کیا ہوا اختلاف ہے، کہیں ایک دن پہلے طلوع ہوتا ہے، کہیں دو دن پہلے، اگر شرعی اصول کے مطابق ایک ملک میں چاند کی رویت ثابت ہو جائے اور دو عادل شاہد بذریعۂ ہوائی جہاز ایسے ملک میں آکر شہادت دیں جہاں اُس روز اٹھائیس تاریخ ہو تو

شاہدوں کے عادل وثقہ ہونے کے باوجود اُن کی شہادت قابلِ سماعت نہیں ہوگی، شہادت کے لیے محل ہونا ضروری ہے، اُس کا محل یوم الشک ہے یعنی ۲۹ر تاریخ، اور ۲۸ تاریخ کو تو شہادت لی بھی نہیں جائے گی، نہ شاہد کاذب قرار دیا جائے گا، اگر چار آدمی عادل معتبر کسی شخص کے متعلق گواہی دیں کہ: ہم نے اِس کو زنا کرتے ہوئے دیکھا ہے؛ لیکن تفتیش سے معلوم ہوا کہ وہ شخص مجبوب ہے یعنی اُس کے پاس آلہ ہی موجود نہیں ؛ بلکہ مقطوع ہے، تو اِن شاہدوں کی وجہ سے اُس شخص کو سنگسار نہیں کیا جائے گا، نہ شاہدوں کے حدِ قذف جاری ہوگی۔ (فتاویٰ محمودیہ ۳/ ۱۳۹، ۱۴۰)

صورتِ مسئولہ میں حکومتِ سعودیہ کا یہ فیصلہ ۲۹ تاریخ کو شہادتِ رویت کی بنیاد پر ہے تو محلِ شہادت موجود ہے؛ اِس لیے قابلِ قبول ہے؛ ورنہ نہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

حررہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲ر جمادی الاولیٰ ۱۴۰۷ھ

قبول شہادت کے لیے محلّ شہادت ہونا ضروری ہے

(سوال): حضرات علماء قرآن اور مفتیان شرع متین سے رویت ہلال کے باب میں رہنمائی کی درخواست کی جاتی ہے؛ کیوں کہ جب سے مجھ پر رویتِ ہلالِ کمیٹی کے چیئرمین کی حیثیت سے روزہ اور عید وغیرہ کے چاند کے بارے میں فیصلہ کرنے کی ذمہ داری آن پڑی ہے تو میں نے یہ تہیہ کیا ہے کہ اس ذمہ داری کو شریعت کے مطابق پورا کرنے کی ہر ممکن کوشش کروں گا انشاء اللہ۔

(۱) صوبہ سرحد کے بعض علاقوں میں حکومتی کمیٹی کے فیصلوں پر عمل نہیں ہوتا؛

بلکہ انہوں نے آپس میں اپنی کمیٹیاں بنائی ہیں جن کے فیصلوں پر وہ عمل کرتے ہیں، ایسی کمیٹیوں کے وجود کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟

② مذکورہ کمیٹیوں کے فیصلوں کا طریقہ یہ ہے کہ وہ صرف گواہوں کی عدالت پر فیصلہ کرتی ہیں اور اس میں ان کے بقول یہ دیکھنا بھی ضروری نہیں ہے کہ چاند درایتی قواعد کے مطابق نظر بھی آسکتا تھا یا نہیں؟ اور اس کی ولادت ہوئی بھی ہے یا نہیں؟ یعنی وہ افق پر موجود بھی ہے یا نہیں؟ اب ایسی بدیہی بات (جس پر سارے علمائے فلکیات متفق ہیں اور ان میں اس پر کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا؛ نیز اس ولادت قمر پر سورج گرہن بھی منحصر ہوتا ہے جو کہ لاکھوں کا مشاہدہ ہوتا ہے کہ بالکل اسی وقت ہوتا ہے جس پر ولادت قمر کا وقت بتایا جاتا ہے) کو بھی اگر وہ حضرات قابل اعتبار نہیں سمجھتے تو دوسرے درایتی قوانین جن کا درجہ اس قانون سے بھی کہیں کم تر کا ہے یہ حضرات کیا خیال رکھ سکتے ہیں؟ اس میں پوچھنے کی بات یہ ہے کہ کیا ہم ان کی اس مسئلہ میں تقلید کر سکتے ہیں کہ صرف گواہوں کی عدالت پر ہی فیصلہ کریں اور اس کو نہ دیکھیں کہ چاند درایتی قوانین کے مطابق نظر آسکتا ہے یا نہیں؟ اور وہ اس روز افق پر موجود بھی ہے یا نہیں؟ اس میں مشکل بات یہ ہے کہ اگر ولادت قمر سے پہلے چاند کے نظر آنے کا اعلان کیا جائے تو اگلے روز چاند کے واضح طور پر آنے کی امید نہیں ہوتی، جس سے یہ تفاصیل جاننے والے حضرات بہت پریشان ہوتے ہیں اور ان میں بعض شرع متین کی توہین کے مرتکب بھی ہو سکتے ہیں جیسا کہ اس دفعہ رمضان ۱۴۱۸ھ کو بھی پشاور میں ان حضرات کی غیر ملکی کمیٹیوں نے پیر کے دن چاند نظر آنے کا اعلان کیا؛ حالاں کہ اسی رات کو چاند ۹/ بج کر ۵۷/ منٹ پر پیدا ہونے والا تھا، اس لیے اگلے دن باوجود موسم صاف

ہونے کے جیسا کہ فلکیات کے ماہرین بتاتے تھے صوبۂ سرحد میں کہیں بھی چاند نظر نہیں آیا تھا؛ حالاں کہ ہر جگہ اس کے دیکھنے کی پوری کوشش کی گئی تھی اور جیسا کہ توقع تھی کہ چاند کی اطلاع کراچی اور بلوچستان سے آسکتی ہے، چناں چہ وہیں سے شہادتیں وصول ہوئیں اور ان ہی کی شہادتوں پر میں نے چاند نظر آنے کا اعلان کیا تھا۔

ان علماء کرام کا مطالبہ ہے کہ ہم بھی ان کی شہادتوں کو لے کر ان پر فیصلہ کریں جس کے لیے اس دفعہ انہوں نے پوری کوشش کی؛ لیکن ولادت قمر سے پہلے چاند کے نظر نہ آنے کا سو فیصد یقین ہونے اور پورے ملک میں چاند کے کہیں اور سے نظر نہ آنے کے باوجود اگر ہم ان کا یہ مطالبہ مان لیں تو کیا شریعت اس فیصلہ کو تسلیم کرے گی؟ اس ضمن میں یہ بھی ایک شکل ہے کہ چاند نظر آنے یا نظر نہ آنے کا فیصلہ قاضی کی شرحِ صدر پر ہوتا ہے ایسی بدیہی رکاوٹوں کے ساتھ قاضی کا شرحِ صدر کیسے ممکن ہوسکتا ہے؟

(۳) ان کے برعکس دوسری طرف کچھ علماء کرام یہ فرماتے ہیں کہ بخاری شریف کی بعض احادیث کے بعض رواۃ پر وہم کا حکم علامہ عینی نے اس لیے لگایا ہے کہ ان کی روایت قواعد ریاضیہ سے متصادم تھی۔ (مقالات کوثری ۴۰۶، ۴۰۷)

تو ایک ایسا آدمی جو چاند کے نظر آنے کی شہادت دیتا ہے چاہے وہ عادل ہی کیوں نہ ہو اس پر اس درایتی اصول کے مطابق جرح کیوں نہیں ہوسکتی؛ کیوں کہ چاند کے نظر آنے میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو بھی سہو ہوا تھا جن کی عدالت مسلمہ ہے، ان کا کہنا ہے کہ چاند کا فیصلہ تو ''صوموا لرؤیته'' کی حدیث شریف پر ہی کیا جائے؛ لیکن ایسی صورت میں کہ چاند کی پیدائش ہی نہ ہوئی ہو اور غروب شمس کے وقت وہ افق پر موجود ہی نہ ہو تو پھر آنے والی شہادتوں پر خوب جرح کر کے تحقیق کی جائے کہ کہیں ان

حضرات کو دیکھنے کا سہو تو نہیں ہوا، اس کے بعد فیصلہ قاضی اپنی شرحِ صدر پر کرے۔

اب میرا سوال یہ ہے کہ کیا صوبہ سرحد کی غیر حکومتی کمیٹی کے علماء کرام کی بات کو اس طرح تسلیم کیا جائے اور درایتی مسلمہ قواعد کو ترک کر کے صرف عادل شواہد پر فیصلہ کیا جائے یا دوسرے علماء کرام کی بات لی جائے کہ مسلمہ درایتی قواعد کے مطابق جس دن غروب آفتاب سے پہلے چاند کی ولادت نہ ہوئی ہو یا چاند اس دن سورج غروب ہونے سے پہلے غروب ہو چکا ہو تو اس دن چاند نظر آنے کی جملہ شہادتوں کو قبول نہ کیا جائے، اس میں ہماری رہنمائی فرمائیں اور اپنی تحقیق اور حتمی رائے قرآن وحدیث کی روشنی میں عطا فرمائیں، یہ چوں کہ پورے ملک کا مسئلہ ہے، اس لیے درخواست ہے کہ اس پر ترجیحی طور پر توجہ فرما کر جلد جواب سے سرفراز فرمائیں۔

المستفتی: محمد عبداللہ خطیب مرکزی جامع مسجد اسلام آباد

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

① پاکستان کی مرکزی حکومت کو ولایتِ عامہ حاصل ہے؛ لہٰذا اگر مرکزی حکومت نے کسی معتبر ہلال کمیٹی کے علماء سے فیصلہ کروا کر نشر کیا تو یہ فیصلہ تمام پاکستان کے لیے موجبِ عمل ہوگا بشرطیکہ ریڈیو خاص ضابطہ کے تحت ہو۔

جواہر الفقہ میں ''رویت ہلال کے شرعی احکام'' نامی رسالہ میں چار اکابر علماء کی جو متفقہ تجویز شائع ہوئی ہے، اس میں مرکزی حکومت کی تشکیل کردہ مرکزی کمیٹی کے اعلان کو ''سب مسلمانوں کے لیے واجب القبول بتلایا گیا ہے''۔ (جواہر الفقہ ۱/۴۰۱)

اس لیے ان علاقہ جات کا حکومتی کمیٹی کے فیصلہ پر عمل نہ کرنا درست نہیں ہے۔

اگر حکومتِ مرکزی نے ہر ہر علاقہ میں اس علاقہ کے لیے ذیلی کمیٹی کی تشکیل کی اجازت دی اور اس اجازت کے ماتحت اس کے شرائط کے مطابق کمیٹی تشکیل دی گئی ہے تب تو درست ہے، ورنہ نہیں۔

(۲) قبول شہادت کے لیے محض عدالت کافی نہیں؛ بلکہ محل شہادت ہونا بھی ضروری ہے، رویت ہلال کی شہادت کا محل یوم الشک ہے یعنی ۲۹ / تاریخ۔ اور ۲۸ / تاریخ تو شہادت لی بھی نہیں جائے گی، نہ شاہد کاذب قرار دیا جائے گا، اگر چار آدمی عادل معتبر کسی شخص کے متعلق گواہی دیں کہ ہم نے اس کو زنا کرتے ہوئے دیکھا ہے؛ لیکن تفتیش سے معلوم ہوا کہ وہ شخص مجبوب ہے یعنی اس کے پاس آلہ ہی موجود نہیں؛ بلکہ مقطوع ہے تو ان شاہدوں کی وجہ سے اس شخص کو سنگسار نہیں کیا جائے گا، نہ شاہدوں کے حد قذف جاری ہوگی۔ (فتاوی محمودیہ ۳/۱۴۰)

آپ کے پاس جب کوئی شہادت آئے تو اولاً آپ یہ دیکھئے کہ شاہدین جس دن کی رویت کی شہادت دے رہے ہیں وہ ۲۸ / تاریخ ہے یا ۲۹ / تاریخ، اگر وہ ۲۸ / تاریخ کی رویت کی شہادت دے رہے ہیں تو آپ محلِ شہادت نہ ہونے کی بنیاد پر ان شہادتوں کی سماعت ہی نہ فرمائیں، عموماً درایتی قواعد کے اعتبار سے ولادتِ قمر سے پہلے چاند دیکھنے والی شہادتیں اس معیار پر پوری نہیں اترتیں، آپ نے رمضان ۱۴۱۸ھ کے تعلق سے غیر حکومتی کمیٹی کے جس اعلان کا سوال میں ذکر کیا ہے وہاں بھی یہی صورت تھی کہ پیر کے دن ہندو پاک میں ۲۸ / تاریخ تھی، میری معلومات کے مطابق ہندو پاک میں کہیں بھی ۲۹ / تاریخ نہیں تھی؛ البتہ اب یہ سوال رہ جاتا ہے کہ محلِ شہادت موجود ہے یعنی ۲۹ / تاریخ ہے؛ لیکن درایتی قواعد کے مطابق ولادت قمر نہیں ہوئی

ہے یا ولادت تو ہو چکی ہے لیکن رویت کا امکان نہیں ہے، اس صورت میں کیا کیا جائے؟
اس سلسلہ میں عرض یہ ہے کہ ۲۹/تاریخ کی شام کو ایسا تو ہوتا نہیں ہے کہ ولادت قمر نہ ہوئی ہو؛ اس لیے کہ اصولی طور پر اگر ولادت نہیں ہوتی ہے تو ۳۰/تاریخ کی شام کو بھی امکان رویت نہ ہوگا، اور اس کے بعد والا دن نئے ماہ کا قرار نہیں دیا جاسکے گا حالاں کہ تیس یوم پورے ہونے کی وجہ سے نیا ماہ شروع ہو چکا ہے، ہاں یہ ممکن ہے کہ ولادت قمر ہو چکنے کے باوجود رویت کا امکان حسبِ قواعد ہیئت نہیں ہے تو کتب فقہ خصوصاً علامہ شامی کی وہ بحث- جو انہوں نے اپنے رسالہ "تنبیه الغافل والوسنان فی احکام هلال رمضان" کی فصل ثالث میں کی ہے۔ (دیکھئے رسائل ابن عابدین ۱/۲۴۸، ۲۴۹)- دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قبولِ شہادت کی شروط معتبرہ عند الشرع کے ہوتے ہوئے اس کو قبول کیا جائے گا، محض عدم امکان نزدِ اہل ہیئت کی وجہ سے اس کو رد نہیں کریں گے، چناں چہ اس مسئلہ میں شوافع کا مسلک بیان فرماتے ہوئے علامہ سبکی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول نقل فرمایا ہے کہ حسابی اعتبار سے عدم امکان رویت کی صورت میں حساب پر عمل کرتے ہوئے شہادت رد کر دیں گے؛ لأن الحساب قطعی والشهادة ظنية۔ اس کے بعد علامہ رملی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے علامہ سبکی رحمۃ اللہ علیہ کے قول کی تردید نقل فرمائی ہے، اسی تردید میں اس کی بھی کہ "ہوسکتا ہے کہ عادل ہونے کے باوجود شاہد کو رویت میں سہو ہوا ہو" بایں الفاظ تردید فرمائی ہے: "والاحتمالات التی ذکرها السبکی بقوله "لأن الشاهد قد يشتبه عليه" الخ لا أثر لها شرعا لإمكان وجودها فی غيرها من الشهادات" اس بحث کے آخر میں خود علامہ شامی نے جو تحریر فرمایا ہے وہ وہی ہے جو میں اوپر بتلا چکا ہوں۔

فحيث علم أنه لا اعتماد على ما يقوله علماء النجوم والحساب فى اثبات الشهر لعدم اعتباره فى الشرع المعلق فيه وجوب الصوم أو الفطر على الرؤية لا على القواعد الفلكية، ظهر وتبين خطأ من عارض رؤية الشهر فى عامنا هذا الثابتة بالبينة التى اعتبرها الشارع ﷺ، وبنى الاحكام عليها بمجرد الاخبار عن جماعة أنهم رأوا الهلال نهاراً واعتمد على ذلك حتى صام يوم عيده بلا مسوغ شرعى؛ بل بمحض الاحتمال العقلى المخالف لنصوص الشرع التى اعتبرها الأئمة المجتهدون و اتباعهم المعتمدون (رسائل ابن عابدين١ /٢٤٩)

③ مقالات کوثری میرے پاس نہیں، اس لیے اس سلسلہ میں کچھ لکھنے سے قاصر ہوں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ١٧/ ذو القعدہ ١٤١٨ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ

چاند کے ثبوت کے بارے میں چند سوالات کے جوابات

مکرمی ومحترمی حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

خدا کرے مزاج گرامی بعافیت ہوں گے۔

رویتِ ہلال کے موضوع پر سوالنامہ آپ کی خدمت میں ارسال کیا جا رہا ہے، اگر ممکن ہو تو اِس کے جوابات اکیڈمی کو ارسال فرمادیں؛ ورنہ اپنے ساتھ سیمینار میں لیتے آئیں، اِس علمی تعاون پر ہم آپ کے بہت مشکور رہوں گے۔ والسلام

مجاہد الاسلام قاسمی (جنرل سکریٹری)

سوال: اسلام نے متعدد عبادات اور شرعی احکام کو قمری ماہ وسال سے وابستہ کیا ہے، اور قمری ماہ کے آغاز کا مدار ہلال کی بصری رویت پر رکھا ہے، خصوصاً روزہ جیسی اہم ترین اسلامی عبادت کا آغاز واختتام، اِسی طرح دونوں اسلامی تہواروں عید الفطر اور عید الاضحیٰ (جن کی حیثیت اصلاً عبادت کی ہے) کی ادائیگی بھی قمری ماہ وتاریخ سے وابستہ ہے؛ اِس لیے رویتِ ہلال سے متعلق قدیم وجدید سوالات کا شرعی حل ایک اسلامی فریضہ ہے، جو بابصیرت اور دقیقُ النظر علماء اور اصحابِ افتاء پر عائد ہوتا ہے، رویتِ ہلال کے بارے میں کچھ اہم اور بنیادی مسائل پر علماء کی طرف سے مُتفقہ رائے نہ ہونے کی وجہ سے بعض اوقات مسلمانوں میں انتشار پیدا ہوتا ہے، جس سے روزہ جیسی اہم عبادت اور عید الفطر وعید الاضحیٰ کی پُرمسرت تقریبات متأثر ہوتی ہیں، ذرائعِ اِبلاغ کی نئی ایجادات اور بعض علاقوں میں نظامِ قضاء کے فُقدان کی وجہ سے بھی بہت سے نئے مسائل پیدا ہو گئے ہیں؛ لہٰذا اِس سلسلہ میں چند بنیادی سوالات اصحابِ علم وتحقیق اور علماء وفقہاء کی خدمت میں اِس امید کے ساتھ پیش کیے جارہے ہیں کہ، آپ حضرات اِن سوالات پر واضح اور مدلل جواب تحریر فرمائیں گے۔

① [الف]: رویتِ ہلال کے سلسلہ میں مطالع کے اختلاف کا اعتبار ہوگا یا نہیں؟

[ب]: اگر مطالع کے اختلاف کا اعتبار ہے تو اُس کے حدود کیا ہیں؟

[ج]: ہندوستان بشمولِ پاکستان وبنگلہ دیش ونیپال کا مطلع ایک ہے یا مختلف؟ بالخصوص جب کہ اِن علاقوں میں بلندی کی سطح کافی مختلف ہے۔

[د]: اگر مطلع ایک ہے تو کیا کسی حصہ میں ۲۹ر تاریخ کو رویتِ ہلال کا ثبوت اور

اُس کا اعلان بھی کر دیا جائے، تو ملک کے دوسرے خطہ کے مسلمانوں پر کیا یہ لازم ہے کہ وہ اِس اعلان کے مطابق عمل کریں، یا اپنے مقامی قاضی اور جہاں نظامِ قضا نہ ہو وہاں کسی رویتِ ہلال کمیٹی کے فیصلے کا انتظار کریں؟ اور کیا اِس دوسرے خطہ کے قاضی یا رویتِ ہلال کمیٹی اِس اعلان کی پابند ہے؟

[ھ]: ایک خطہ میں اگر رویت ہو جائے تو دوسرے خطہ تک اُس کی خبر بذریعۂ فون یا فیکس یا ٹیلی گرام یا ریڈیو ملتی ہے، تو اِس خبر پر کیا عمل کرنا صحیح ہوگا؟ کیا اِن کے اعتبار کے لیے کچھ شرائط ہیں؟ اور کیا اِن کے مابین احکام میں کچھ فرق ہے؟

(۲) ہندوستان کے مختلف علاقوں میں اکثر موسم کا فرق رہتا ہے، اور فضا میں ابر، گرد وغبار یا مختلف طرح کی کثافت کے اعتبار سے بھی اِن کے مابین فرق ہے؛ اِس لیے قمری مہینے کی ۲۹/تاریخ کو ہر جگہ مطلع یکساں صاف یا گرد آلود نہیں رہتا ہے تو......

(الف) کیا رویت کے لیے فلکیاتی حساب سے مدد لی جاسکتی ہے؛ تا کہ یہ معلوم ہو کہ آج اُفق پہ چاند کی بصری رویت کا امکان ہے یا نہیں؟

(ب) بعض قدیم اور جدید علماء کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اگر کسی خطہ میں فلکیاتی حساب سے قمری ماہ کی ۲۹ / تاریخ کو چاند کی بصری رویت کا امکان نہ ہو، اور اِس کے باوجود اُس خطہ سے رویتِ ہلال کی شرعی شہادت ملتی ہے، تو کیا اُسے قبول کیا جائے گا؟ یا یہ کہہ کر کہ: اِن کو غلط فہمی ہوئی ہے، شہادت رد کر دی جائے گی؟

(ج) چاند کی رویت کے لیے کیا محکمۂ موسمیات سے مدد لی جاسکتی ہے؟ یعنی اِس کے علم کے لیے کہ آج مطلع صاف ہے یا گرد آلود و کثافت زدہ ہے، اور چاند کی رویت ممکن ہے یا نہیں؟

(د) اگر ۲۹؍شعبان کو مطلع ابر آلود ہو اور ایک شخص کی شہادت کی بنا پر قاضی نے آغازِ رمضان کا اعلان کر دیا ہو، اِس کے بعد رمضان کی ۳۰/ تاریخ مکمل ہو چکی ہو، ۳۰؍رمضان کی شام کو موسم بالکل صاف ہو اور عید کا چاند دیکھنے کی بہت کوشش کے باوجود کسی کو عید کا چاند دِکھائی نہ دیا ہو، تو کیا اگلے دن کو عید الفطر کا دن قرار دے کر عید منائی جائے گی؟ یا یہ سمجھا جائے گا کہ جس فردِ واحد نے رمضان کے چاند کی گواہی دی تھی اُسے مغالطہ ہوا یا اُس نے غلط بیانی سے کام لیا؛ لہٰذا اگلے دن کو رمضان کی ۳۰/ تاریخ قرار دے کر روزہ رکھنے کا فیصلہ کیا جائے گا؟

③ (الف) رمضان وعیدین کے ثبوت کے لیے جب کہ مَطلع صاف ہو تو کتنے افراد کی چاند دیکھنے کی شہادت کافی ہوگی؟ چاند دیکھنے والوں کے لیے عدل کا وہ معیار ضروری ہے جو فقہاء نے عام طور پر لکھا ہے؟ یا موجودہ دور میں اِتنا کافی ہے کہ چاند دیکھنے والا معاشرہ میں جھوٹا نہیں سمجھا جاتا، اور صوم وصلوۃ کا پابند ہے؟ اور کیا مستور الحال کی شہادت معتبر ہوگی؟

(ب) چاند دیکھنے والوں کے لیے کیا قاضی کے پاس جا کر یا جہاں نظامِ قضا نہ ہو وہاں کے مقامی علماء یا رویتِ ہلال کمیٹی کے ذمہ دار کے پاس جا کر شہادت دینا ضروری ہے؟ چاند دیکھنے والوں کا بیان اصولی طور پر شہادت ہے یا خبر؟ اگر شہادت ہے تو کیا اُس کے لیے شہادت اور مجلسِ قضا اور شہادت کی دیگر شرائط کا پایا جانا ضروری ہے؟

(ج) دیکھنے والوں کے لیے کیا فوری طور پر شہادت دینا ضروری ہے؟ اور اگر چاند دیکھنے کے بعد چند گھنٹوں کی تاخیر یا ایک دن یا اِس سے زائد کی تاخیر کے بعد شہادت دے، تو کیا اُن کی شہادت قبول کی جائے گی یا رد کر دی جائے گی؟ خصوصاً جب کہ

رمضان وعید الفطر کے موقع پر تاخیر سے اعلان کی صورت میں مسلمانوں کے مابین شدید اختلاف وانتشار پیدا ہوجاتا ہے۔

④ (الف) صوبۂ بہار واُڑیسہ اور ملک کے دیگر صوبوں میں جہاں نظامِ قضا موجود ہے، اگر وہاں کے قاضی چاند ہونے کا ثبوت ہونے کے بعد اعلان کرتے ہیں تو کیا اُس کے حلقۂ قضا کے تمام مسلمانوں پر اُس اعلان پر عمل ضروری ہوگا یا نہیں؟

(ب) قاضی کی طرف سے اگر ریڈیو یا ٹیلی ویژن کے ذریعہ مُتعیَّنہ الفاظ میں اعلان ہوتا ہے، تو اُس کا اعلان اعلانِ سلطان کے حکم میں ہوگا یا نہیں؟

(ج) ہندوستان اور اِس جیسے ملکوں میں اگر ایک صوبہ کے قاضی یا رویتِ ہلال کمیٹی نے شرعی اصولوں کی روشنی میں رویتِ ہلال کا اعلان کیا، تو کیا یہ صرف اُسی صوبہ کے مسلمانوں کے لیے واجب العمل ہوگا یا پورے ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے؟ یعنی دوسرے علاقہ کے مسلمانوں کے حق میں وہ محض ایک خبر ہے یا اُن کے حق میں بھی اعلانِ سلطان کا درجہ رکھتا ہے؟

(د) ریڈیو سے رویتِ ہلال کے اعلان کے معتبر ہونے کے لیے کیا معلن کا مسلمان ہونا ضروری ہے یا کوئی بھی شخص اعلان کرے؟ اگر تجربات سے تصدیق ہوتی ہے کہ یہ شخص قاضی یا رویتِ ہلال کمیٹی کی طرف خبر کی صحیح نسبت کیا کرتا ہے تو کیا اُس پر اعتماد کرلینا کافی ہے؟

⑤ (الف) بعض علاقوں میں بالعموم مطلع ابر آلود رہتا ہے، اور بہت کم چاند کی رویت ۲۹/ تاریخ کو ممکن ہوتی ہے، جیسے برطانیہ، کہ سال کے کچھ یا اکثر مہینوں میں وہاں چاند ۲۹/ تاریخ کو نظر ہی نہیں آتا، تو کیا ایسی جگہوں پر ہمیشہ ۳۰/ دن کا مہینہ

شمار کر کے رمضان و عیدین کا فیصلہ کیا جائے؟

(ب) اگر ہر مہینہ ۳۰/ دن کا شمار کیا جاتا ہے تو سال کے دنوں میں دیگر ممالکِ اسلامیہ کے حساب سے ہفتہ دس دنوں کا فرق پڑ جاتا ہے، اور چار سال میں ایک مہینہ کا فرق ہو جاتا ہے، تو کیا ایسی جگہوں میں چاند کی رویت کے لیے ماہرینِ فلکیات کے قول پر اعتماد کیا جائے؟ یا دیگر ممالک میں رویتِ ہلال کے اعلان پر عمل کیا جائے؟

(ج) ملک کے چند شہروں یا صوبوں کے رویتِ ہلال کمیٹی کے ذمہ داران کی طرف سے رویت کے ثبوت کا فیصلہ ہو جانے پر اُن جگہوں کے ریڈیو اسٹیشن، اُن کی طرف سے رویت کا جو اعلان کرتے ہیں، دوسرے علاقوں کے ذمہ داران کس حد تک اِن اعلانات پر اعتماد کر سکتے ہیں؟ کیا اِن اعلانات کی بنیاد پر وہ رویت کا ثبوت مان کر اپنے علاقوں میں اعلان کر سکتے ہیں؟ اور اِس کے لیے کیا کم از کم تین جگہوں کا اعلان درکار ہوگا؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

① (الف) امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے ظاہر روایت یہ ہے کہ: اختلافِ مطالع کا اعتبار نہ کیا جائے، اِسی کو عام فقہائے احناف نے راجح قرار دیا ہے، یہاں تک کہ مشرق و مغرب کے فاصلہ میں اختلافِ مطالع کو غیر معتبر قرار دے کر ایک جگہ کی رویت کو دوسری جگہ کے لیے حجت قرار دیا ہے۔ ''درمختار'' میں ہے:

(واختلاف المطالع) ورؤيته نهاراً قبل الزوال وبعده (غير معتبر على) ظاهر (المذهب)، وعليه أكثر المشائخ وعليه الفتوى، بحر عن الخلاصة (فيلزم أهل المشرق برؤية أهل المغرب) إذا ثبت عندهم رؤية

أولئك بطريق موجب كما مرّ وقال الزيلعي: الأشبه أنه يعتبر؛ لكن قال الكمال: الأخذ بظاهر الرواية أحوط. (در مختار على هامش الشامي ۲/ ۱۰۵،۱۰۴)

ہمارے اکابر میں سے سرخیلِ علمائے دیوبند حضرت اقدس مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے ''فتاویٰ رشیدیہ'' ۱/۴۱ میں، اور حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے ''فتاویٰ دار العلوم'' (مطبوعہ کراچی) ۱/۳۷۶ میں، اور حکیم الامت حضرت مولانا شاہ محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ''امداد الفتاویٰ'' ۲/۱۱۲ میں، اور مفتیٔ اعظم حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ''کفایت المفتی'' ۴/۲۰۹، ۲۱۱، ۲۱۲ میں اِسی پر فتویٰ دیا ہے، حنابلہ اور مالکیہ بھی اِسی کے قائل ہیں۔ اِس کے برخلاف فقہائے حنفیہ میں سے بعض حضرات نے بلادِ بعیدہ میں اختلافِ مَطالع کو معتبر مانا ہے، ہمارے اکابر میں سے حضرت العلامہ مولانا انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے ''العُرف الشَّذی'' ۱/۲۰۳ میں، اور حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے ''فتح الملہم'' ۳/۱۱۳ میں، اور حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے رسالہ ''رویتِ ہلال'' ص: ۴۸، ۴۹ میں اِسی کو اختیار فرمایا ہے، شوافع اِسی کے قائل ہیں۔

علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

وإنما الخلاف في اعتبار اختلاف المطالع بمعنى أنه هل يجب على كل قوم اعتبار مطلعهم، ولا يلزم احداً العمل بمطلع غيره أم لا يعتبر اختلافها؛ بل يجب العمل بالأسبق رؤيةً، حتى لو رؤى في المشرق ليلة الجمعة وفي المغرب ليلة السبت وجب على أهل المغرب العمل بما رآه أهل المشرق، فقيل بالأول، واعتمده الزيلعي وصاحب الفيض وهو

الصحيح عند الشافعية؛ لأن كل قوم مخاطبون بما عندهم كما في أوقات الصلاة، وأيده في الدرر بما مرّ من عدم وجوب العشاء والوتر على فاقد وقتهما، وظاهر الرواية الثاني، وهو المعتمد عندنا وعند المالكية والحنابلة. (شامی ۲/۱۰۵)

''مجموعۂ رسائل ابن عابدین'' میں علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک رسالہ بنام ''تنبيه الغافل والوسنان على أحكام هلال رمضان'' ہے، اِس میں اُنہوں نے اختلافِ مطالع کی شرعی حیثیت بیان کرنے کے لیے مستقل ایک فصل بعنوان ''الفصل الرابع في بيان حكم اختلاف المطالع'' قائم فرمائی ہے، اُس میں احناف، حنابلہ، اور مالکیہ کے یہاں اختلافِ مطالع کے عدمِ اعتبار والے قول کے معتمد اور راجح ہونے کی تصریح فرمائی ہے۔

لكن المعتمد الراجح عندنا أنه لااعتبار به، وهو ظاهر الرواية وعليه المتون كالكنز وغيره، وهو الصحيح عند الحنابلة كما في الأنصاف، وكذا هو مذهب المالكية الخ (مجموعۂ رسائل ابن عابدين ۱/ ۲۵۱)

نیز اختلافِ مَطالع کے اعتبار والا قول جمہور مشائخ اور ظاہر مذہب کے خلاف ہونے کے علاوہ وجوہ ذیل کی بناء پر بھی ناقابلِ عمل ہے۔

① قوله تعالىٰ: ﴿يسئلونك عن الأهلة، قل هي مواقيت للناس والحج﴾ وقوله تعالىٰ: ﴿قدره منازل لتعلموا عدد السنين والحساب﴾ میں واضح ہدایت ہے کہ احکامِ شرع کا مدار قمری حساب پر ہے، شمسی پر نہیں، اِس کی وجہ یہ ہے کہ شمسی تاریخوں کو ہر شخص معلوم نہیں کرسکتا؛ بلکہ دنیا کے چند افراد یہ تاریخیں

متعین کرتے ہیں اور باقی ساری دنیا محض اُن کی تقلید کرتی ہے، اِس کے برعکس قمر کے مُشاہدہ سے ہر ناخواندہ شخص بھی تاریخ معلوم کرسکتا ہے، چوں کہ احکامِ شرع ہر شہری وجنگلی اور خواندہ اور ناخواندہ کے لیے یکساں ہیں؛ اِس لیے اُن کا مدار یُسر وسہولت اور عام فہم طریقہ پر رکھا گیا ہے؛ مگر مَطالعِ قمر کے اختلاف کا علم اِتنا مشکل اور اِس قدر پیچیدہ ہے کہ تسخیرِ قمر کے موجودہ دورِ ترقی میں بھی ایسے لوگ بہت ہی کم؛ بلکہ کالعدم ہیں جو اختلافِ مطالع کا خط کھینچ کر یہ بتادیں کہ اِس خط کے ایک جانب رویت کا امکان ہے اور دوسری جانب نہیں، اختلافِ مطالعِ قمر کے علم کی بہ نسبت تو شمسی حساب بھی ہزاروں درجہ سہل اور آسان ہے، پس جب کہ شریعت نے شمسی حساب کو عام فہم نہ ہونے کی وجہ سے غیر معتبر قرار دیا ہے، تو اختلافِ مطالعِ قمر جیسے پیچیدہ اور مشکل ترین حساب کا مکلف بنانا بطریق اولیٰ مقتضائے شرع کے خلاف ہے۔

(۲) اگر یہ مسئلہ مقتضائے شرع کے خلاف اختلافِ مطالعِ قمر کے علم میں مہارت رکھنے والے چند افراد کے سپرد کر بھی دیا جائے، تو اِس میں ایک مزید قباحت یہ لازم آئے گی کہ ایک ہی مملکت کے اندر واقع دو متقارب مقامات کے درمیان خط اختلافِ مطالع واقع ہونے کی صورت میں ایک شہر میں مرکزی حکومت رویت کی بناء پر عید کا فیصلہ کرے اور دوسرے ملحق شہر میں اختلافِ مطالع کی بناء پر روزہ کا حکم دے، ایسے فیصلہ کی نظیر تاریخِ اسلام میں نہیں ملتی۔

(۳) (الف) خطِ اختلافِ مطالع کا محلِ وقوع ہر ماہ مختلف ہوتا ہے؛ لہٰذا ہر مہینہ میں اِس کی تعیین کے لیے ماہرینِ فن کی ضرورت پڑے گی جو کالعدم ہیں؛ نیز اِس میں ہر ماہ تبدیلی واقع ہونے کی وجہ سے اِجرائے احکام میں تعسّر اور عوام میں انتشار

پیدا ہونا لازمی امر ہے۔ (از: احسن الفتاوی ۴/ ۴۹۳)

(ب) جوابِ سابق میں اختلافِ مطالع کے عدمِ اعتبار کی تصریح وترجیح مذکور ہے، نیز اعتبار کی صورت میں تحدید بھی دشوار ہے، مسیرتِ شہر کی تحدید جس قول میں کی گئی ہے وہ متعدد وجوہ کی بناء پر باطل ہے۔

(ج) یہ یاد رہے کہ بلندی کی سطح مختلف ہونے سے مطالعِ قمر میں اختلاف نہیں ہوتا، ہاں! مَطالع ومَغاربِ شمس میں ہوتا ہے۔

(د) اگر ہندو پاک و بنگلہ دیش و نیپال کے تمام مسلمان رویتِ ہلال کے فیصلہ کے لیے کسی کمیٹی کو اختیار دے دیں، اور اُس کمیٹی کے سامنے رویتِ ہلال کا شرعی ثبوت مہیا ہونے پر وہ فیصلہ واعلان کر دے، تو اُن تمام مسلمانوں پر وہ اعلان وفیصلہ واجب العمل ہوگا؛ بشرطیکہ کمیٹی کے ارکان میں ماہرینِ فقہ کی اکثریت ہو، اور اُن کی رائے کو قانونی غلبہ حاصل ہو، اور اگر ایسا نہیں ہے تو مقامی قاضی یا رویتِ ہلال کمیٹی کے فیصلہ کا انتظار ضروری ہے۔

(ھ) ہلالِ رمضان کے علاوہ دیگر اسلامی مہینوں کے ہلال کے لیے خبر کافی نہیں؛ بلکہ شہادت شرط ہے، كما هو مصرح في كتب الفقه؛ اِس لیے اِن میں محض خبرِ رویت پر عمل درست نہیں، چاہے وہ فون یا فیکس یا ٹیلی گرام یا ریڈیو سے ملی ہو؛ البتہ اگر ہلالِ رمضان میں خبر اِس طرح پہنچی کہ اِس میں احتمالِ تزویر نہ ہو تو اُس پر عمل کر سکتے ہیں؛ بشرطیکہ جس جگہ خبر پہنچ رہی ہے وہاں کا مطلع صاف نہیں تھا۔

(۲) (الف) صرف اِتنی مدد میں تو بظاہر کوئی اشکال نہیں ہے۔

(ب) اگر رویتِ ہلال کی شرعی شہادت ملی ہے تو محض فلکیاتی حساب سے عدمِ

امکان کی بنیاد پر اُس کو رد نہیں کیا جا سکتا۔

رویتِ ہلال کے معاملہ میں آلاتِ رصدیہ اور حساباتِ ریاضیہ کے ناقابلِ اعتبار ہونے کا مسئلہ تقریباً اجماعی مسئلہ ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ شرحِ بخاری میں فرماتے ہیں:

وا لمراد بالحساب هنا حساب النجوم وتسييرها، ولم يكونوا يعرفون من ذلك أيضاً إلا النزر اليسير، فعلق الحكم بالصوم وغيره بالرؤية لرفع الحرج عنهم في معاناة حساب التسيير، واستمر الحكم في الصوم ولو حدث بعدهم من يعرف ذلك؛ بل ظاهر السياق يشعر بنفى تعليق الحكم بالحساب أصلاً، ويوضحه قوله في الحديث الماضى: (فإن غم عليكم فاكملوا العدة ثلاثين) ولم يقل: فسلوا أهل الحساب، والحكمة فيه كون العدد عند الإغماء يستوي فيه المكلفون، فيرتفع الاختلاف والنزاع عنهم، وقد ذهب قوم إلى الرجوع إلى أهل التسيير في ذلك وهم الروافض، ونقل عن بعض الفقهاء موافقتهم قال الباجي: وإجماع السلف الصالح حجة عليهم، وقال ابن بزيزه: وهو مذهب باطل، فقد نهت الشريعة عن الخوض في علم النجوم؛ لأنها حدس وتخمين ليس فيها قطع ولا ظن غالب، مع أنه لو ارتبط الأمر بها لضاق؛ إذ لا يعرفها إلا القليل (فتح الباري ٤/ ١٢٧)

علامہ ابنِ رُشد مالکی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

فإن العلماء أجمعوا على أن الشهر العربي يكون تسعاً وعشرين ويكون ثلاثين وعلى أن الاعتبار في تحديد شهر رمضان إنما هو

الرؤية (بداية المجتهد١/ ٢٠٧)

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

واختلف العلماء في معنى "فاقدروا له" فقالت طائفة من العلماء: معناه ضيقوا له وقدروه تحت السحاب، وممن قال بهذا أحمد بن حنبل وغيره، ممن يجوّز صوم يوم ليلة الغيم عن رمضان كما سنذكره إن شاء الله تعالىٰ، وقال ابن سريج وجماعة منهم مطرف بن عبدالله وابن قتيبة وآخرون: معناه قدروه بحساب المنازل، وذهب مالك والشافعي وأبوحنيفة وجمهور السلف والخلف إلىٰ أن معناه: قدروا له تمام العدد ثلاثين يوماً قال المازري حمل جمهور الفقهاء قوله ﷺ: "فاقدروا له" علىٰ أن المراد إكمال العدة ثلاثين، كما فسره في حديث آخر قالوا: ولا يجوز أن يكون المراد حساب المنجمين؛ لأن الناس لو كلفوا به ضاق عليهم؛ لأنه لايعرفه إلا أفراد، والشرع إنما يعرف الناس بما يعرفه جماهيرهم (نووي شرح مسلم ١/ ٣٤٧)

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ "أوجز المسالك شرح مؤطا إمام مالك" **میں تحریر فرماتے ہیں:**

والثالث: معناه قدروه بحسب المنازل، قاله أبوالعباس ابن سريج من الشافعية، ومطرف بن عبدالله من التابعين، وابن قتيبة من المحدثين، قال ابن عبدالبر: لايصح عن مطرف، وأما ابن قتيبة فليس هو ممن يعرج إليه في مثل هذا قال الباجي: وذكر الداودي أنه قيل في معنىٰ قوله "فاقدروا له" أي قدروا المنازل، وهذا لانعلم أحداً قال به إلا بعض

أصحاب الشافعي، أنه يعتبر في ذلك بقول المنجمين، والإجماع حجة عليه. (أوجز ٥/١٦)

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ شرح مشکوۃ میں فرماتے ہیں:

وفي شرح السنة قال ابن سريج: "فاقدروا" خطاب لمن خصه الله بهذا العلم، وقوله: "فاكملوا العدة" خطاب للعامة اهـ وهو مردود لحديث: "إنا أمة أمية، لانكتب ولانحسب" فانه يدل علىٰ أن معرفة الشهر ليست إلى الكتاب والحساب كما يزعمه أهل النجوم، وللاجماع على عدم الاعتداد بقول المنجمين ولو اتفقوا على أنه يرى، ولقوله تعالىٰ مخاطباً لخير أمة: ﴿أخرجت للناس﴾ خطاباً عاماً، ﴿فمن شهد منكم الشهر فليصمه﴾، ولقوله ﷺ بالخطاب العام: "صوموا لرؤيته وافطروا لرؤيته"؛ ولما في نفس هذا الحديث "لاتصوموا حتىٰ تروه" ولما في حديث أبي داؤد والترمذي عن أبي هريرة أنه عليه الصلوٰة والسلام قال: "الصوم يوم يصومون، والفطر يوم يفطرون؛ بل أقول: لو صام المنجم عن رمضان قبل رؤيته بناءً على معرفته يكون عاصياً في صومه، ولا يحسب عن صومه إلا إذا ثبت الهلال على خلاف فيه، ولو جعل عيدالفطر بناءً على زعمه الفاسد يكون فاسقاً، وتجب عليه الكفارة في قول وهو الصحيح، وإن استحل افطاره فرضاً عن عده واجباً صار كافرا (مرقاة٤/ ٢٤٢جديد)

علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

(قوله: لا عبرة بقول الموقتين) أي في وجوب الصوم على الناس؛

بل في "المعراج": لا يعتبر قولهم بالإجماع، ولا يجوز للمنجم أن يعمل بحساب نفسه وفي "النهر": فلا يلزم بقول الموقتين أنه أي الهلال يكون في السماء ليلة كذا وإن كانوا عدولاً في الصحيح، كما في الايضاح. (شامي ٢/١٠٠)

اِن تمام عباراتِ منقولۂ بالا سے یہ بات صاف صاف معلوم ہوتی ہے کہ، رویتِ ہلال کے معاملہ میں حساباتِ ریاضیہ اور آلاتِ رصدیہ کا اعتبار نہیں، اور یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ مسئلہ اجماعی ہے، بعض شافعیہ حساب کے معتبر ہونے کے قائل ہیں؛ لیکن خود اُن کے ہم مسلک مشائخ نے اُن کا رد کیا ہے۔ علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے رسالہ "تنبیہ الغافل والوسنان علی أحکام هلال رمضان" میں ایک مستقل فصل قائم فرما کر اِس مسئلہ پر کلام فرمایا ہے، جس میں مذاہبِ اربعہ کی کتبِ معتبرہ کی نقول پیش فرما کر اِس کا اجماعی ہونا ثابت فرمایا ہے۔ ملاحظہ ہو: رسائل ابنِ عابدین ۱/۲۴۶ تا ۲۴۹۔

عمومی طور پر جب یہ فیصلہ کر لیا گیا کہ حساباتِ ریاضیہ کا اِس معاملہ میں اعتبار نہیں، تو اِس سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ اِس کا اعتبار جس طرح وجوبِ صوم میں نہیں کیا گیا اِسی طرح اگر ثقہ اور عادل گواہوں نے اِس بات کی گواہی دی کہ: ہم نے چاند دیکھا ہے، اور حساباتِ ریاضیہ کے اعتبار سے اُس روز رویت کا امکان نہیں، تو اِس صورت میں بھی محض حساباتِ ریاضیہ کی وجہ سے اِن شاہدوں کی شہادت کو رد نہیں کیا جائے گا؛ لیکن چوں کہ عام طور پر حضراتِ مصنفین جہاں حساباتِ ریاضیہ کے عدمِ اعتبار کو بیان فرماتے ہیں، وہاں بطورِ مثال پہلی صورت تحریر فرماتے ہیں، کہ اگر مطلع صاف نہ ہونے کی وجہ سے چاند نظر نہیں آیا اور منجمین واہلِ ہیئت یہ بتلاتے ہیں کہ: چاند موجود

ہے، تو محض اُن کی بات پر روزہ واجب نہ ہوگا؛ (بلکہ ملاعلی قاری رحمۃ اللہ علیہ کی عبارت میں تو یہاں تک ہے کہ: کسی حساب داں نے محض اپنے حساب کی بنیاد پر بلا رویتِ شرعی روزہ رکھا تو وہ گنہگار ہوگا، اور اِسی بنیاد پر عید الفطر منائی تو فاسق ہوگا، اور افطار کو وجوبی طور پر حلال سمجھا تو کافر قرار دیا جائے گا) اِس سے شاید یہ غلط فہمی ہو کہ دوسری صورت میں یعنی جب کہ حساباتِ ریاضیہ سے رُویت کا عدمِ امکان ثابت ہوتا ہو، اور شرعی شہادت رُویت کی میسر ہو جائے تو وہ رد کردی جائے گی؛ حالاں کہ ایسا نہیں ہے؛ بلکہ علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے جہاں علامہ سبکی شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ: ''اہلِ حساب کے قول کا اعتبار کیا جائے گا؛ اِس لیے کہ حساب قطعی چیز ہے'' وہیں اُنہوں نے اِس کی صراحت فرمائی ہے کہ: علامہ سبکی رحمۃ اللہ علیہ کے اِس قول کی خود اُن کے ہم مسلک مشائخ نے تردید فرمائی ہے، اِس موقع پر جو عبارات مشائخِ شافعیہ کی نقل فرمائی ہیں، اُس میں اِس دوسری صورت کی صراحت موجود ہے، اور اِس میں صاف صاف لکھا ہے کہ: اہلِ حساب کے قول کی وجہ سے شہادت رد نہیں کی جاسکتی؛ بلکہ شہادت پر ہی عمل ہوگا؛ اِس لیے کہ شارع نے شہادت کو یقین کا قائم مقام قرار دیا ہے، ملاحظہ ہو:

وللإمام السبكي الشافعي تاليف، مال فيه إلى اعتماد قولهم؛ لأن الحساب قطعي اهـ ومثله في شرح الوهبانية، قلت: ما قاله السبكي رده متأخرو أهل مذهبه، منهم: ابن حجر والرملي في شرح المنهاج، وفي فتاوى الشهاب الرملي الكبير الشافعي سئل عن قول السبكي: لو شهدت بينة برؤية الهلال ليلة الثلاثين من الشهر وقال الحساب بعدم إمكان الرؤية تلك الليلة عمل بقول أهل الحساب؛ لأن الحساب قطعي

والشهادة ظنية، وأطال في ذلك، فهل يعمل بما قاله أم لا؟ وفيما إذا رؤى الهلال نهاراً قبل طلوع الشمس يوم التاسع والعشرين من الشهر وشهدت بينة برؤية الهلال رمضان ليلة الثلاثين من شعبان فهل تقبل الشهادة أم لا؟ لأن الهلال إذا كان الشهر كاملاً يغيب ليلتين، أو ناقصاً يغيب ليلة، أو غاب الهلال الليلة الثالثة قبل دخول وقت العشاء؛ لأنه ﷺ كان يصلي العشاء لسقوط القمر الثالثة، هل يعمل بالشهادة أم لا؟ فاجاب: بأن المعمول به في المسائل الثلاث ما شهدت به البينة؛ لأن الشهادة نزلها الشارع منزلة اليقين، وما قاله السبكي مردود، ردّه عليه جماعة من المتأخرين، وليس في العمل بالبينة مخالفة لصلاته ﷺ، ووجه ما قلناه أن الشارع لم يعتمد الحساب؛ بل ألغاه بالكلية بقوله:" نحن أمة أمية، لانكتب ولانحسب، الشهر هكذا وهكذا"، وقال ابن دقيق العيد: الحساب لا يجوز الاعتماد عليه في الصلاة، انتهى والأحتمالات التي ذكرها السبكي بقوله: "ولأن الشاهد قد يشتبه عليه" الخ لا أثر لها شرعاً؛ لإمكان وجودها في غيرها من الشهادات اهـ (رد المحتار على الدر المختار ۲/۱۰۰)

اِس بحث سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اگر رَصدگاہ والے یہ اعلان کریں کہ: فلاں روز رویت ممکن نہیں، اور شہادتِ شرعیہ سے اُس روز رویت ثابت ہوجائے تو شہادت پر ہی عمل ہوگا، محض رَصدگاہ کی تحقیق وحساب کی وجہ سے شہادت رد نہیں کی جاسکتی، ہاں! یہ ضرور ہے کہ اِس شہادت کو ماننے کی وجہ سے مہینہ ۲۹ ر سے کم کا لازم نہ آتا ہو، اِس لیے کہ اگر مہینہ ۲۹ سے کم کا لازم آتا ہے تو وہ دن محلِ شہادت ہی نہیں۔

لقوله عليه الصلوة والسلام: الشهر هكذا وهكذا وهكذا، وعقد الإبهام في الثالثة، ثم قال: الشهر هكذا وهكذا وهكذا، يعني تمام الثلاثين، يعني مرة تسعاًوعشرين ومرة ثلاثين (متفق عليه)

اِس جگہ اُن حضرات کو جو حساب کے قطعی ہونے کے قائل ہیں بڑا اشکال یہ پیش آتا ہے کہ: جب آیتِ قرآنی سے شمس وقمر کا ایک حساب سے جاری ہونا ثابت ہے تو پھر ہم حساب کی قطعیت کی بنیاد پر شہادت کو کیوں رَد نہ کریں؟ کیا اِن آیاتِ قرآنی سے صَرفِ نظر کرلیا جائے؟ تو اُن حضرات کی خدمت میں عرض ہے کہ: جو بات قرآن مجید سے ثابت ہے وہ تو صرف اِتنی ہے کہ ﴿الشمس والقمر بحسبان﴾ شمس وقمر کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک حساب مقرر فرمایا ہے، اور یہ دونوں اُس حساب سے سرِ مو تجاوز نہیں کرسکتے؛ لیکن اِس حساب کی تفصیل تو قرآن یا حدیث میں موجود نہیں، یہ کیا ضروری ہے کہ اہلِ ہیئت وریاضی جس حساب کے دعویدار ہیں وہی مراد ہو۔ اور اگر مان بھی لیں کہ وہی حساب مراد ہے تب بھی یہ دعویٰ کہ وہ حساب قطعی ہے، محلِ نظر ہے۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: خود اِن فنی معلومات کی حقیقت پر نظر کی جائے تو معلوم ہوگا کہ، اگرچہ حساب بحیثیتِ حساب کے قطعی ہو کہ دو اور دو چار ہی ہوسکتے ہیں، تین یا پانچ نہیں ہوسکتے؛ لیکن اِن دو کا دو ہونا یہ ہماری نظر اور اندازے وتخمینہ ہی کا حکم ہوسکتا ہے، کتنے ہی باریک سے باریک پیمانوں سے تولا اور پرکھا جائے یہ احتمال ختم کرنا ہماری قدرت میں نہیں کہ ہم نے جس کو دو سمجھا ہے وہ دو سے کسی قدر کم یا زیادہ ہو، خواہ یہ کمی یا زیادتی ایک بال کے ہزارویں حصہ کے برابر ہو، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ زمین کے فرش پر کسی زاویہ میں ایک بال کے ہزارویں حصہ

کی کمی یا زیادتی اگر چہ بالکل غیر محسوس زیادتی ہے؛ مگر اوپر کی فضاء اور سیاروں تک جب اِس زاویہ کے خطوط ملائے جائیں گے تو میلوں کا فرق ہو جائے گا۔ ''مذہب اور سائنس'' کتاب میں گارڈن بلیف کا ایک اقتباس لیا ہے، جس میں صراحت ہے کہ: چاند ہم سے دو لاکھ چالیس ہزار میل دور ہے، سورج قریباً نو کروڑ تیس لاکھ میل دور ہے۔ (ص: ٦٩) ساتھ ہی یہ یاد رکھنا چاہیے کہ، مثلاً آفتاب کو جب ہم کسی وقت دیکھتے ہیں تو وہ آٹھ منٹ پہلے کا آفتاب ہوتا ہے، اِس طرح قریب ترین جس ستارہ کو ہم دیکھتے ہیں وہ چار سال پہلے کا ہوتا ہے۔ (ص: ۷۱) ہم سے قریب ترین ستارہ بھی اتنی دور ہے کہ اُس کی روشنی ہم تک آنے میں چار سال لگ جاتے ہیں، حالاں کہ روشنی ایک سیکنڈ میں ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل سفر کرتی ہے۔ (ص: ۷۲) اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ کیمرہ کی طرح ترقی یافتہ آلات جھوٹ نہیں بولتے؛ مگر اِن آلات کو واقعات پر منطبق کرنا تو بہر حال انسانی نظر اور انسانی عمل ہے، اِس میں غیر محسوس فرق ہو جانا کسی وقت بھی مستبعد نہیں؛ بلکہ واقع ہے، جس کا مشاہدہ ہمیشہ اہلِ فن کے باہمی اختلافات سے ہوتا رہتا ہے، دنیا میں جتنی جدید اور قدیم تقویمیں اور جنتریاں اور کیلنڈر وجود میں آئے ہیں اُن میں سے صرف اُن کو لیا جائے جو مسلم ماہرینِ فن نے تیار کیے ہیں، تو اُن میں بھی باہمی اختلاف نظر آتا ہے، اگر اُن حسابات اور آلات کے نتائج قطعی اور یقینی ہوتے تو ماہرینِ فن کے اختلافِ رائے کا کوئی احتمال نہ رہتا، سائنس کی نئی ترقیات اور فنِ ریاضی وفلکیات کی جدید ترقیات کا آج کی دنیا میں بڑا ہنگامہ ہے، اور اِس میں شبہ نہیں کہ بہت سی نئی تحقیقات نے پرانے فلسفہ اور ریاضی کے اصول کی دھجیاں بکھیر دیں اور اِس کے خلاف مشاہدہ کرا دیا؛ لیکن اِس کے باوجود یہ نہیں کہا

جاسکتا کہ آج ایک محقق ماہر نے جو کچھ کہہ دیا وہ حرفِ آخر ہے، اِس کی تغلیط آئندہ کوئی نہیں کرسکے گا، آئندہ کو چھوڑ کر اِسی موجودہ دور میں اِسی درجہ کے دوسرے ماہرین اُس سے مختلف رائے رکھتے ہیں۔ (رویتِ ہلال ص:۳۸/۳۹)

آگے چل کر تحریر فرماتے ہیں: اِتنی بات اِس اختلاف میں سب کے لیے واضح ہوگئی کہ اِن قواعد وآلات سے حاصل ہونے والے نتائج کو قطعی اور یقینی کہنا محض خوش گمانی ہے، صحیح یہ ہے کہ اِس میں بھی غلطیاں ہوسکتی ہیں، چوتھی صدی ہجری کا مشہور اسلامی فلاسفر اور ماہرِ نجوم وفلکیات ابوریحان البیرونی جو شہاب الدین غوری کے زمانہ میں ایک مدتِ دراز تک ہندوستان میں بھی رہا ہے، اور اِن فنون کا بے نظیر امام مانا جاتا ہے، اِس نئی روشنی اور نئی تحقیقات کے دور میں بھی اُس کی امامت سب کے نزدیک مسلَّم ہے، روسی ماہرین نے اُس کی تحقیقات سے راکٹ وغیرہ کے مسائل میں بڑا کام لیا ہے، اُن کی مشہور کتاب "الآثار الباقية عن القرون الخالية" ایک جرمن ڈاکٹر سی ایڈورڈ سخاؤ کے حاشیہ کے ساتھ لیزک میں چھپ کر شائع ہوئی ہے، اُس میں اِن آلاتِ رصدیہ کے اِن نتائج کے غیر یقینی ہونے کے مسئلہ کو تمام ماہرینِ فن کا اجماعی اور اتفاقی نظریہ بتلایا ہے، اُس کے الفاظ یہ ہیں:

إن علماء الهيئة مجمعون على أن المقادير المفروضة في أواخر أعمال رؤية الهلال هي إبعاد لم يوقف عليها إلا بالتجربة، وللمناظر أحوال هندسية يتفاوت لأجلها المحسوس بالبصر في العظم والصغر، وفي ما إذا تاملها متأمل منصف لم يستطع بت الحكم على وجوب رؤية الهلال أو امتناعها (الآثار الباقية، ص: ۱۹۸، طبع ليزك ۱۹۲۳ء)

علمائے ریاضی و ہیئت اِس پر متفق ہیں کہ رویتِ ہلال کے عمل میں آنے کے لیے جو مقداریں فرض کی جاتی ہیں، وہ سب ایسی ہیں جن کو صرف تجربہ ہی سے معلوم کیا جاسکتا ہے، اور مناظر کے احوال مختلف ہوتے ہیں جن کی وجہ سے آنکھوں سے نظر آنے والی چیز کے سائز میں چھوٹے بڑے ہونے کا فرق ہوسکتا ہے، اور فضائی وفلکی حالات ایسے ہیں کہ اُن میں جو بھی ذرا غور کرے گا تو رویتِ ہلال کے ہونے اور نہ ہونے کا کوئی قطعی فیصلہ ہرگز نہ کرسکے گا۔

اور ''کشف الظنون'' میں بحوالہ زیچ شمس الدین محمد بن علی خواجہ کا چالیس سالہ تجربہ یہی لکھا ہے کہ: اِن معاملات میں کوئی صحیح اور یقینی پیشن گوئی نہیں کی جاسکتی جس پر اعتماد کیا جاسکے۔ (کشف الظنون ۲/ ۹۶۹، رویتِ ہلال، ص: ۴۱/ ۴۲)

اور جب یہ ثابت ہوگیا کہ رَصد گاہوں اور آلاتِ رصدیہ کے ذریعہ حاصل کردہ معلومات بھی رُویتِ ہلال کے مسئلہ میں کوئی یقینی فیصلہ نہیں کہلاسکتی؛ بلکہ وہ بھی تجرباتی اور تخمینی معاملہ ہے تو اُس اصول کے حکیمانہ اصول ہونے کی اَور بھی تائید ہوگئی جو رسولِ امی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اِس معاملہ میں اختیار فرمایا، کہ اِن کاوشوں اور باریکیوں میں امت کو اُلجھائے بغیر بالکل سادگی کے ساتھ رویت ہونے نہ ہونے پر احکامِ شرعیہ کا مدار رکھ دیا، جس پر ہر شخص ہر جگہ ہر حال میں آسانی سے عمل کرسکے۔ (رویتِ ہلال، ص: ۴۲)

شہادت کے لیے جب ایک ضابطہ شریعت نے مقرر فرمایا تو اُس میں مزید قیود کا اضافہ دلیلِ شرعی کے بغیر ممکن نہیں۔ ''وہ شہادت اہلِ ہیئت کے قطعی حساب کے خلاف نہ ہو'' یہ ایک ایسی قید ہے جس کا کوئی شرعی ماخذ نہیں۔ پھر حساب کو قطعی کہنا خود بلا دلیل اور اہلِ ہیئت کی تصریحات کے خلاف ہے، جو حضرات قطعیتِ حساب کے دعویدار

ہیں اُن کے غور وفکر کے لیے دو واقعے پیش کر رہا ہوں:

دو واقعے:

① علمائے امت کا اتفاق ہے کہ دنیا کی تمام مساجد محض تحری وتخمینہ سے قائم کی گئی ہیں؛ لیکن مسجدِ نبوی کی سمت بطورِ وحی ومکاشفہ قائم کی گئی ہے، حق تعالیٰ نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے بیت اللہ کو بطورِ معجزہ کر دیا تھا، اُس کو دیکھ کر آپ نے مسجدِ مدینہ کی بنیاد رکھی۔

''بحر الرائق'' میں ہے: نقل عن أبي بكر الرازي في محراب المدينة أنه مقطوع به، فإنه إنما نصبه رسول الله ﷺ بالوحي (۱/ ۳۰۳)

''در مختار'' میں ہے: وكذا المدني لثبوت قبلتها بالوحي.

(در مختار علی هامش الشامي ۱/ ۳۱۵)

اِس لیے باجماعِ امت مسجدِ نبوی کی سمت بالکل یقینی ہے؛ لیکن حساباتِ ریاضیہ سے جانچا گیا تو وہ بھی صحیح نہیں اتری؛ چناں چہ امیرِ مصر احمد ابن طولون نے جب مصر میں اپنی جامع مسجد بنانے کا ارادہ کیا، تو چند ماہرینِ ہندسہ کو مدینہ منورہ بھیج کر پہلے مسجدِ نبوی کی سمتِ قبلہ کو آلاتِ ریاضیہ سے جانچا، تو معلوم ہوا کہ آلات کے ذریعہ نکالے ہوئے خطِ سمتِ قبلہ سے مسجدِ نبوی کی سمتِ قبلہ دس درجہ مائل بجنوب ہے، جیسا کہ علامہ مقریزی نے ''کتاب الخطط'' ۲/ ۲۵۶ میں بالفاظِ ذیل اس کا ذکر کیا ہے:

إن أحمد ابن طولون لما عزم على بناء هذا المسجد بعث إلى محراب رسول الله ﷺ من أخذ سمته، فإذا هو مائل عن خط سمت القبلة المستخرج بالصناعة نحو عشر درج إلى جهة الجنوب

اب جو لوگ آلاتِ رصدیہ پر مدار رکھتے ہیں اور اِس پر فخر کرتے ہیں، وہ دیکھیں کہ اُن کی تجویز پر تو مسجدِ نبوی کی سمتِ قبلہ بھی پوری نہیں اُترتی، اگر چہ موجودہ زمانہ کے آلات کے مطابق مسجدِ نبوی کی سمت، قبلہ کے عین مطابق ہے؛ لیکن اِس سے اِتنا تو معلوم ہوا کہ آلات پر مدار رکھنا اور اصولِ شرع کو محض آلاتِ رصدیہ کی وجہ سے چھوڑنا غلط طریقہ ہے۔

(۲) نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں سورج گرہن ہوا تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُس کی نماز بھی پڑھی اور پڑھائی تھی۔ ''بخاری شریف'' اور دیگر کتبِ حدیث میں اِس کی صراحت موجود ہے کہ، سورج گرہن کا یہ واقعہ اُس روز پیش آیا تھا جس روز آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صاحب زادہ حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کی وفات ہوئی۔ اِس موقع پر علامہ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے اکثر اہل سِیر کے حوالہ سے یہ بھی بیان کیا ہے کہ: حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کی وفات دس چاند کو ہوئی تھی، دو قول اَور بھی ذکر کیے ہیں جن میں ایک چار چاند کا اور دوسرا چودہ کا ہے۔ چناں چہ فرماتے ہیں:

(قوله: يوم مات ابراهيم) يعني ابن النبي ﷺ، وقد ذكر جمهور أهل السير أنه مات في السنة العاشرة من الهجرة، فقيل: في ربيع الاول، وقيل: في رمضان، وقيل: في ذي الحجة، والأكثر على أنها وقعت في عاشر الشهر، وقيل: في رابعه، وقيل: في رابع عشرة (فتح الباري ۲/ ۵۲۹)

چناں چہ خود حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی دوسری تصنیف ''الإصابة'' ۱/ ۹۳ میں اور علامہ ابن عبد البر مالکی رحمۃ اللہ علیہ نے ''الاستيعاب على هامش الإصابة'' (۱/ ٤۳) میں بھی دس چاند والا قول نقل فرمایا ہے۔

ملاعلی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے ”مرقات شرحِ مشکوۃ“ میں حافظ کے حوالہ سے اِسی کو ذکر کیا ہے: قال ابن حجر: وكان ذلك يوم عاشر الشهر، كما قاله بعض الحفاظ (مرقات ۲/ ۲۷۵)

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ”أوجز المسالك“ میں اِس کو ”شرحِ احیاء“ اور ”تاریخ الخمیس“ کے حوالہ سے ذکر کیا ہے:

قلت: وذكره في تاريخ الخميس في السنة السادسة، فقال: وفي هذه السنة كسفت الشمس أول مرة قيل: الكسوف الذي كان فيه موت إبراهيم، كذا في الوفاء، ثم ذكر في السنة العاشرة، فقال: وفي هذه السنة يوم الثلثاء لعشر ليال خلون من ربيع الأول توفى إبراهيم بن رسول الله ﷺ وانكسفت الشمس يوم مات، فقال الناس: إنما كسفت لموت ابراهيم، قيل: إن الغالب أن الكسوف يكون يوم الثامن والعشرين أو التاسع والعشرين وانكسفت في العاشر، فقالوا: إنها كسفت لموته، انتهىٰ (أوجز المسالك ٤/ ٢٥)

اہلِ ہیئت کے نزدیک یہ بات اصولِ مسلمہ میں سے ہے کہ سورج گرہن قمری مہینہ کی آخری تاریخوں (۲۷/ ۲۸/ ۲۹) میں ہوتا ہے، اور یہاں حدیث میں تصریح موجود ہے کہ حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کی وفات کے روز سورج گرہن ہوا، اور اکثر اہلِ سیر یہ فرماتے ہیں کہ: اِن کی وفات دس چاند کو ہوئی، جس کا مطلب یہ ہوا کہ دس چاند کو سورج گرہن ہوا، اب اگر اہلِ ہیئت سے اِس سلسلہ میں دریافت کیا جائے تو وہ صاف صاف لفظوں میں یہ کہیں گے کہ: یہ ناممکن اور محال ہے؛ لیکن علمائے کرام اور محدثینِ عظام اِسی واقعہ کو اُن کی تردید کے لیے پیش فرماتے ہیں؛ چناں چہ حافظ ابن

حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ اِسی موقع پر تحریر فرماتے ہیں:

وفيه رد على أهل الهيئة لأنهم يزعمون أنه لا يقع في الأوقات المذكورة، وقد فرض الشافعي وقوع العيد والكسوف معاً، واعترضه بعض من اعتمد على قول أهل الهيئة، وانتدب أصحاب الشافعي لدفع قول المعترض فأصابوا (فتح الباري ٢ /٤٢٣)

دیکھیے حافظ نے اِس موقع پر اہلِ ہیئت کی تردید فرمائی ہے؛ (بلکہ اُن کی اِس عبارت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ ممکن ہے کہ عید اور کسوف دونوں جمع ہوجائیں، اور اہلِ ہیئت کی بات کا اعتبار کرنے والوں کی طرف سے امام پر جو اعتراض وارد کیا گیا اُس کا اصحابِ شوافع نے جواب دیا، اور اُن کے اِس جواب کی خود حافظ "فأصابوا" فرما کر تصویب و تائید کر رہے ہیں)۔

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ بھی شرح مشکوۃ میں یہی بات فرماتے ہیں:

وفيه رد لقول أهل الهيئة: لا يمكن كسوفها في غير يوم السابع أو الثامن أو التاسع والعشرين؛ إلا أن يريد أن ذلك باعتبار العادة وهذا خارق لها. (مرقاة ٢/ ٢٧٥)

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے "اوجز" میں اِس مسئلہ پر مستقل بحث فرمائی ہے:

والسادس فيما قال أهل الهيئة: أن الكسوف لا يكون إلا في الثامن والعشرين أو التاسع والعشرين، وقد ورد عند أهل التاريخ وقوعهما في الأوقات المختلفة، وورد أن الشمس كسفت عند شهادة الإمام حسين في العاشوراء، وتقدم عن العيني راداً على أهل الهيئة أنه لو كان

الكسوف لوقوعه في ظل الأرض في وقت لكان ذلك الوقت محدوداً معلوماً؛ لان المجرى منهما محدود معلوم، فلما كان تأتي في الأوقات المختلفة والجرى واحد والحساب واحد علم قطعاً فساد قولهم. انتهى.

(أوجز المسالك ٥/٢٤)

اِس لیے رویتِ ہلال کی شہادت بھی محض اِس وجہ سے رد نہیں کی جاسکتی کہ رَصدگاہ والے اُس روز رویت کو ناممکن قرار دیتے ہیں۔

(ج): مطلع کا صاف یا گرد آلود ہونا حسّی چیز ہے، جس کا فیصلہ بہ آسانی کیا جاسکتا ہے، اِس کے لیے محکمۂ موسمیات کی مدد لینا سمجھ میں نہیں آتا۔ رہا رویت کے امکان وعدمِ امکان کا سوال، تو جب اِس سلسلہ میں اُن کی بات کا شرعاً اعتبار ہی نہیں تو پوچھنے سے کیا حاصل؟

(د) اگر ہلالِ رمضان میں خبرِ واحد عادل پر اعتماد کرتے ہوئے روزہ کا حکم دیا گیا اور تیس روزے پورے ہوجانے کے بعد بھی رویت ہلال نہ ہوئی، تو بحالتِ صحو عید کرنا جائز نہیں، اور بحالتِ علت عید کرنا جائز ہے۔

إذا صاموا بشهادة الواحد وأكملوا ثلاثين يوماً ولم يروا هلال شوال لا يفطرون فيما روى الحسن عن أبي حنيفة رحمهما الله تعالى للأحتياط، وعن محمد رحمه الله تعالى أنهم يفطرون، كذا في التبيين، وفي غاية البيان: قول محمد أصح، كذا في النهر الفائق، وقال شمس الأئمة الحلواني: هذا الاختلاف فيما إذا لم يروا هلال شوال والسماء مصحية، فأما إذا كانت متغيمة فإنهم يفطرون بلا خلاف، كذا فى الذخيرة (عالمگيري ١/١٩٨)

(و) لوصاموا (بقول عدل) حيث يجوز و غم هلال الفطر (لا) يحل على المذهب، خلافاً لمحمد، كذا ذكره المصنف؛ لكن نقل ابن الكمال عن الذخيرة: أنه إن غم هلال الفطر حل اتفاقاً وفي الزيلعي: الأشبه إن غم حل وإلا لا (در مختار)

وفي الشامية: (قوله: وفي الزيلعي إلخ) نقله لبيان فائدة لم تعلم من كلام الذخيرة، وهي ترجيح عدم حل الفطر إن لم يغم شوال، لظهور غلط الشاهد؛ لأنه الأشبه من ألفاظ الترجيح، لكنه مخالف لما علمته من تصحيح غاية البيان لقول محمد بالحل، نعم! حمل في الإمداد ما في غاية البيان على قول محمد بالحل إذا غم شوال، بناء على تحقق الخلاف الذي نقله المصنف، وقد علمت عدمه، وحينئذ فما في غاية البيان في غير محله؛ لأنه ترجيح لما هو متفق عليه، تأمل (شامي ۲/۱۰۳)

(قوله: وهي ترجيح عدم حل الفطر إن لم يغم الخ) هو وإن أشعر بالترجيح يشعر بالخلاف في المسئلة على خلاف عبارة الذخيرة، وعبارة مجمع الروايات المنقولة في السندي تشهد بالخلاف أيضاً، حيث قال: وفي الإمداد عن مجمع الروايات عن الزاهدى: لو قبل الإمام شهادة الواحد وأتموا ثلاثين، ثم غم عليهم هلال شوال، قال الإمام والثاني: يصومون من الغد، وقال محمد: يفطرون، وقال شمس الأئمة الحلواني: الخلاف فيما إذا لم ير هلال شوال والسماء مصحية، فإن كانت متغيمة يفطرون بلاخلاف اه والأظهر أن ما نقله عن الزيلعي إنما ذكره لبيان أن ما ذكره عن المصنف من تصحيح عدم الحل صحح الزيلعي خلافه، وإن ما حكاه ابن الكمال من الاتفاق حكى الزيلعى ما

يدل على الخلاف. (تقريرات الرافعي ١/ ١٤٦، ١٤٧)

نوٹ: اِس مسئلہ میں علمائے پاکستان نے اُسی پر اتفاق فرمایا ہے جو احقر نے جواب میں لکھا ہے، اِن اتفاق کرنے والوں میں حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ بھی شامل ہیں۔

علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ اپنے رسالہ میں تحریر فرماتے ہیں: ثم اعلم! أنه إذا تم عدد رمضان ثلاثين بشهادة فرد ولم ير هلال الفطر والسماء مصحية لايحل الفطر اتفاقاً؛ لظهور غلط الشاهد ويعزر ولاخلاف في حل الفطر إذا تم العدد وكان بالسماء علة ليلة الفطر وإن ثبت رمضان بشهادة الفرد، كما حرره في إمداد الفتاح (رسائل ابن عابدين ١/ ٢٣٦)

③ (الف) مطلع صاف ہونے کی صورت میں جمِ غفیر کی رویت شرط ہے؛ البتہ صاحبِ بحر الرائق علامہ ابن نجیم رحمۃ اللہ علیہ کے بقول دو کی گواہی سے بھی کام چل جائے گا، اور اگر خارجِ مصر یا بلند مقام سے دیکھنے والا ایک بھی ہو تو اُس کی شہادت سے ثبوت ہو جائے گا۔ علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ اپنے رسالہ "تنبيه الغافل والوسنان" میں اِس مسئلہ پر تفصیلی بحث فرمانے کے بعد آخر میں خلاصہ تحریر فرماتے ہیں:

حاصل مامر فيما يتوقف عليه وجوب الصوم عندنا رؤية الهلال من عدل أو مستور لو في السماء علة، وإلا فجمع عظيم أو اثنان على ما اختاره في البحر في زماننا، أو واحد عدل إذا جاء من خارج المصر أو من مكان عال. (رسائل ابن عابدين ١/ ٢٣٨)

فاسق کے صدق کا اگر ظنِ غالب ہو تو اُس کی شہادت قبول کرنا جائز ہے۔

درمختار میں ہے: (فلو قضى بشهادة فاسق نفذ) وأثم فتح (در مختار)

علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ اس پر تحریر فرماتے ہیں:

(قوله: بشهادة فاسق نفذ) قال في جامع الفتاوى: وأما شهادة الفاسق فإن تحرى القاضي الصدق في شهادته تقبل، وإلا فلا اهـ فقال: وفي الفتاوى القاعدية: هذا إذا غلب على ظنه صدقه، وهو مما يحفظ، درر، أول كتاب القضاء وظاهر قوله: وهو مما يحفظ اعتماده اهـ (شامي ٤/ ٤١٣، ٤١٤)

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ”کیوں کہ اگر فاسق کی شہادت کو مطلقاً رد کرنا قرار دیا جائے تو ساری دنیا کا نظام مختل ہو جائے، کیوں کہ معاملات کے لیے قابل قبول شہادت ہزار میں ایک بھی میسر آنا مشکل ہو جائے گا، ہاں! یہ ظاہر ہے کہ قاضی کے لیے غلبۂ ظن بصدقِ مخبر ضروری ہے، جو فاسق اِس درجہ میں نہ ہو اُس کی شہادت رد کی جائے گی؛ ورنہ قبول کرنا چاہیے؛ تا کہ حقوق ضائع نہ ہو جائیں۔

”معين الحكام“ میں ”باب الثاني والعشرين“ میں اِس مسئلہ پر مفصل کلام کر کے اِس کو ترجیح دی ہے:

(مسئلة): قال القرافي في باب السياسة: نص بعض العلماء على أنا إذا لم نجد في جهة إلا غير العدول أقمنا أصلحهم وأقلهم فجوراً للشهادة عليهم، ويلزم ذلك في القضاة وغيرهم؛ لئلا تضيع المصالح، قال: وما أظن أحداً يخالف في هذا؛ فإن التكليف شرط في الإمكان، وهذا كله للضرورة؛ لئلا تهدر الأقوال وتضيع الحقوق، قال بعضهم: وإذا كان الناس فساقاً إلا القليل النادر قبلت شهادة بعضهم على بعض، ويحكم بشهادة الأمثل فالأمثل من الفساق، هذا هو الصواب

الذي عليه العمل وإن أنكره كثير من الفقهاء بألسنتهم، كما أن العمل على صحة ولاية الفاسق ونفوذ أحكامه وإن أنكروه بألسنتهم، وكذلك العمل على صحة كون الفاسق وليا في النكاح ووصياً في المال، وهذا يؤيد ما نقله القرافي: وإذا غلب على الظن صدق الفاسق قبلت شهادته وحكم بها، والله تعالى لم يأمر برد خبر الفاسق، فلا يجوز رده مطلقاً؛ بل يتثبت فيه حتى يتبين صدقه من كذبه، فيعمل على ما تبين وفسقه عليه. (معين الحكام، ص: ۱۱۷)

در بابِ رویتِ ہلالِ رمضان مستور الحال کی شہادت کا اعتبار کیا جائے گا۔ (كما مر في عبارة العلامة الشامي)

(ب) حاکم مسلم نہ ہونے کی صورت میں تمام شرائطِ شہادت ساقط نہ ہوں گی؛ بلکہ ممکنہ شروط کا اعتبار ضروری ہے۔

ولوكانوا ببلدة لا حاكم فيها صاموا بقول ثقة، وأفطروا بإخبار عدلين مع العلة للضرورة (در مختار مع الشامي ۲ /۱۰۰،۹۹)

اِس میں عدد کی صراحت ہے، جو شروطِ شہادت میں سے ہے۔

"بحر الرائق" میں ہے: فيشترط فيه ما يشترط في سائر حقوقهم، من العدالة، والحرية، والعدد، وعدم الحد في القذف، ولفظ الشهادة، والدعوى على خلاف فيه إن أمكن ذلك؛ وإلا فقد تقدم أنهم لوكانوا في بلدة لا قاضي فيها ولا وال فإن الناس يصومون بقول الثقة، ويفطرون بإخبار عدلين للضرورة. (۲/ ۲۸۷)

اِس میں خط کشیدہ الفاظ "إن أمكن ذلك" سے معلوم ہوتا ہے کہ ممکنہ شروط

کی رعایت ضروری ہے۔

(ج): اگر ثبوتِ رؤیت اُن کی شہادت پر موقوف ہے تو اُن کے لیے ضروری ہے کہ فوری طور پر شہادت دیں۔

ويجب على الجارية المخدرة أن تخرج في ليلتها بلاإذن مولا ها وتشهد، كما في الحافظية(در مختار) (قوله: ويجب على الجارية المخدرة) أي ا لتي لا تخالط الرجال، وكذا يجب على ا لحرة أن تخرج بلاإذن زوجها، وكذا غير المخدرة والمزوجة بالأولى، قال ط: والظاهر أن محل ذلك عند توقف إثبات الرؤية عليها؛ وإلا فلا (شامي ۲/ ۹۹)

اگر اِن کی یہ تاخیر اِس لیے ہے کہ مقامی علماء یا چاند کمیٹی تک پہنچنا اُن کے لیے فوری طور پر ممکن نہ تھا، تب تو اُن کی شہادت رَد نہیں کی جائے گی؛ ورنہ رَد کی جاسکتی ہے۔

وعليه تفرع ما لوشهدوا في آخر رمضان برؤية هلاله قبل صومهم بيوم، إن كانوا في المصر ردت لتركهم الحسبة، وإن جاء وا من خارج قبلت من الفتح ملخصاً. (شامي ۲/ ۹۹)

نوٹ: آج کل عوام مسلمین میں مسائلِ شریعت سے جہالت وناواقفیت بھی عام ہے، اگر اُن کی یہ تاخیر اِسی جہالت کی وجہ سے تھی تو اُن کی شہادت رد کی جائے یا نہیں؟ اِس کی صراحت نہیں ملی۔

۴ (الف، ب) اگر قاضی کا تقرر تمام مسلمین کی تراضی سے عمل میں آیا ہے تو سب کے حق میں واجب العمل ہے۔

(ج) دوسرے صوبوں کے مسلمانوں کے حق میں واجب العمل نہیں ہے، محض

خبر کی حیثیت رکھتا ہے۔

(د) اگر اعلان بایں الفاظ ہو کہ: فلاں رویتِ ہلال کمیٹی چاند کا شرعی ثبوت مل جانے کے بعد یہ اعلان کر رہی ہے، یا اپنے انتظام سے کرا رہی ہے کہ: رویت شرعاً ثابت ہو چکی ہے، اور یہ کمیٹی جانی پہچانی اور معتبر ہو، اور اُس کے تمام ارکان پابندِ شرع ہوں تو یہ اعلان مقبول اور واجب العمل ہوگا۔

اور اگر اعلان کے طور پر نہیں؛ بلکہ محض خبر کے طور پر نشر کر رہی ہے، اور تجربہ سے یہ بات ثابت ہو کہ یہ ریڈیو کسی خاص ضابطہ کے تحت ہے، بلا اجازت معتبر خبر شائع نہیں کی جاسکتی، تو ہلالِ رمضان کے اثبات کے لیے کافی ہے، ہلالِ فطر کے اثبات کے لیے کافی نہیں۔

⑤ (الف، ب) دیگر قریبی ممالک جہاں مطلع عموماً صاف رہتا ہو اور رویت ہوتی ہو، اُن سے رابطہ قائم فرما کر بطریقِ موجِب ثبوت مہیا کیا جائے۔

(ج) حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں: ''مختلف ریڈیو اسٹیشنوں کی خبریں بھی جب وہ حد تواتر کو پہنچ جائیں تو استفاضہ میں داخل ہیں''۔ (فتاویٰ دار العلوم ۲/ ۴۸۷ مطبوعہ کراچی)

تین ریڈیو اسٹیشنوں سے بھی حصولِ استفاضہ ممکن ہے:

قال الحافظ ابن حجر العسقلاني: والثاني -وهو أول أقسام الآحاد- ما له طرق محصورة بأكثر من اثنين، وهو المشهور عند المحدثين، سمي بذلك لوضوحه، وهو المستفيض على رأى جماعة من أئمة الفقهاء.

(شرح نخبة الفكر)

مگر حقیقت یہ ہے کہ استفاضہ کے لیے کوئی عدد متعین نہیں؛ بلکہ جتنی اخبار سے غلبۂ ظن متحقق ہوجائے وہ خبر مستفیض ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد خانپوری، ۶/ جمادی الاخری ۱۴۱۵ھ

اہلِ برطانیہ کے لیے دربابت رویتِ ہلال مشعلِ راہ

سوال: (۱) یہاں برطانیہ میں ''مرکزی رویتِ ہلال کمیٹی'' کی طرف سے ایک کتاب ''سعودی عرب کی رویت کے اصول شریعت ومفتیان کرام کی نظروں میں'' شائع ہوئی ہے، اِس میں تقریباً ۲۰ مفتیانِ عظام کے حوالہ سے برطانیہ کو چاند کی تاریخوں کے تعیین کے بارے میں سعودیہ کے تابع بنانے کو جائز قرار دیا ہے، اِن مفتیانِ کرام میں آں جناب کا بھی نام ہے، تقریباً چھ سال سے اِس پر عمل ہورہا ہے، اِس کی وجہ سے ہندوستان پاکستان وغیرہ ممالک سے کبھی دو دن کبھی تین دن کا فاصلہ ہورہا ہے، دو دن، تین دن پہلے رمضان المبارک کا آغاز ہورہا ہے، سعودیہ کے مشرق ومغربی علاقوں میں سعودیہ اور اُن کے متبعین علاقوں کے علاوہ کہیں بھی دنیا بھر میں رویت نہیں ہوتی، مثلاً سعودیہ کے مغربی علاقہ افریقہ، پناما، باربا ڈوز وغیرہ؛ حالاں کہ اِن علاقوں میں موسم اور مطلع اکثر صاف ہوتا ہے۔

دیگر عرض ایں کہ یہاں ہلال کمیٹی صرف مکہ معظّمہ اور مدینہ منورہ دو جگہ فون کرکے فیصلہ کرلیتی ہے، کیا تواتر واستفاضہ کی تعریف دو فون پر صادق آتی ہے؟ حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے ''اصلاحِ انقلاب امت'' میں ''رمضان کے متعلق کوتاہیاں'' کے ماتحت لکھا ہے: رویتِ ہلال کی خبر کے بارے میں جب بے احتیاطی ہوتی ہے تو بدونِ ثبوت

رمضانیت باعتقادِ رمضان فرض روزہ رکھا جاتا ہے، حالاں کہ یوم شک میں روزہ رکھنے سے منع فرمایا ہے، جب بناء غیر صحیح پر روزہ شروع کیا اور ختم رمضان پر اتفاق سے ابر ہونے کی وجہ سے اکمالِ ثلثین کے قاعدے پر عید کرے گا، اور ممکن ہے وہ تاریخ رمضان کی ہو تو کس قدر سخت بات ہے!۔

آں جناب سے بندہ صرف یہی تحقیق کرنا چاہتا ہے کہ، سعودیہ کے تابع بن کر مغربی ممالک سے دو دن، تین دن پہلے رمضان کا آغاز اور اختتام کرنا عین اصولِ شریعت پر عمل کرنا ہے؟ اِس بارے میں مفصل جواب تحریر فرما کر ہم طالب علموں کی ہمت افزائی فرمائیں، عین نوازش ہوگی۔

(۲) احسن الفتاویٰ ج ۴ر میں ''سعودیہ میں رویت کا اعلان پاکستان کے لیے حجت نہیں ہے'' اِس کی فوٹو کاپی ساتھ میں ارسالِ خدمت ہے، اِس جواب کے مطابق برطانیہ کو سعودیہ کے تابع بن کر عمل کرنا صحیح ہے یا نہیں؟ خلافِ ظاہر ہونے کی وجوہ بیان میں پائی جاتی ہیں، ساتھ اختلافِ مطالع کے بارے میں علامہ شیخ عبداللہ بن محمد کے مضمون کی فوٹو کاپی شیخ بن باز کی، نیز مفتیٔ گجرات مفتی عبدالرحیم لاجپوری مدظلہ کا ماہِ جولائی ۱۹۷۸ء میں ''سفرِ برطانیہ کے درمیان متفقہ فیصلہ'' کی فوٹو کاپی ساتھ میں ارسالِ خدمت ہے۔ آں جناب سے گذارش ہے کہ: اِن سب باتوں کو مدنظر رکھ کر جواب تحریر فرمائیں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً

(۱) (۲) علاقہ برطانیہ میں رویتِ ہلال کا مسئلہ نیا نہیں ہے، ایک مدت سے اہلِ

علم اور اربابِ فتویٰ کے درمیان موضوعِ بحث بنا ہوا ہے، اور یہ حضرات اُس کے حل کرنے میں لگے ہوئے ہیں، قرآنی آیات، حدیثی روایات، فقہی عبارات، اقوالِ مشائخ اور قواعدِ ہیئات سے استنباط اور استشہاد بھی فرماتے ہیں؛ لیکن کسی ایک بات پر اتفاق نہیں ہو پاتا، اور متفق ہونا بظاہر دشوار ہونے کے ساتھ ضروری بھی نہیں ہے؛ اِس لیے اہلِ علم اور دلائل سے واقف حضرات کے لیے تو دیانۃً یہ ضروری ہے کہ جس دلیل کو قوی اور راجح قرار دیں اُسی پر عمل کریں، اور عوام اپنے علماء کا اتباع کریں، اور اگر اُن میں بھی اختلاف ہو تو جس پر زیادہ اعتماد ہو اُس کا اتباع کریں۔

ایک بات یاد رہے کہ اہلِ علم اپنے اختیار کردہ قول وعمل کو دوسرے اہلِ علم پر زبردستی چپکانے کی کوشش نہ کریں، اور اُن کے قول وعمل کو باطل محض قرار دے کر نزاع پیدا نہ کریں، اور عوام پر لازم ہے کہ اہلِ علم کے اختلاف میں دخل دے کر اِس کو باعثِ نزاع وفساد ہرگز نہ بنائیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد خانپوری، ۶/ ربیع الاول ۱۴۳۱ھ

برطانیہ میں دیگر ممالک سے آنے والی چاند کی خبر پر عمل کرنے کی وجہ سے اٹھنے والے چند سوالات کے جوابات

بخدمتِ اقدس حضرت مفتی صاحب زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بعد سلام مسنون! امید ہے کہ مزاجِ گرامی بخیر ہوگا، ایک نہایت ہی اہم استفتاء

فوری رہبری کی ضرورت کے پیشِ نظر جناب کی خدمت میں معروض ہے، امید ہے کہ مبارک ماہ کی قیمتی گھڑیوں میں سے تھوڑا وقت نکال کر رہبری سے فوری طور پر نوازیں گے، اللہ رب العزت ہر قسم کی عافیت سے نوازیں۔ آمین

سوال: برطانیہ میں اُفق اور موسم ہمیشہ غبار آلود ہونے کی وجہ سے چاند کی رویت نہ ہونے کے باعث رمضان وعیدین کی تعیین کے بارے میں ہمیشہ برطانیہ سے باہر کی آمدہ خبروں پر اعتماد کرتے ہوئے علمائے کرام فیصلہ کرتے ہیں۔

اب تک دو مختلف طریقوں سے فیصلہ کیا جاتا تھا، بعض علماء اِس طرح فیصلہ کرتے تھے کہ برطانیہ سے باہر کسی بھی ملک سے ملنے والی رویتِ ہلال کی خبر پر رمضان شروع کر دیا جائے، اور عید الفطر کے موقع پر بھی جس ملک کی رویت کی خبر پر رمضان شروع کیا ہے اُس کی پابندی کے بغیر وہ یا کسی اَور ملک کی خبر پر عید الفطر کا تعین کر لیا جائے۔

دوسرے بعض علماء رمضان وعیدین دونوں کے تعین کے لیے برطانیہ سے قریب مسلم ملک مراکش کی رویت کی خبر پر (جہاں ہر ماہ رویتِ ہلال کا باقاعدہ نظم ہے) رمضان وعیدین کا تعین کرتے۔

سالِ رواں علمائے کرام نے نئی صورت یہ تجویز کی کہ، سعودی عرب کی رویتِ ہلال کی خبر پر برطانیہ میں بھی رمضان وعیدین کا تعین کیا جائے۔

مراکش کی رویت پر برطانیہ میں رمضان وعیدین کرنے والے علماء نے اِس سے اِس بنیاد پر اختلاف کیا کہ سعودی عرب کی رویت صحیح نہیں ہوتی، اور اِس بارے میں شواہد ودلائل اور مفتیان کرام کے اقوال پیش کیے۔

مذکورہ دو مختلف صورتوں کی بناء پر ۱۴۲۰ھ سالِ رواں رمضان کی ابتدا میں

برطانیہ میں حسبِ ذیل کیفیت پیدا ہوئی: سعودی عرب میں رویتِ ہلال کا اعلان بروز پیر ۲۷/ اپریل ۱۹۸۷ء کی شام کو ہوا، کہ آئندہ کل بروز منگل ۲۸/ اپریل ۱۹۸۷ء کو یکم رمضان ہوگی؛ چناں چہ برطانیہ میں بھی اِس کے مطابق یکم رمضان کا اعلان کیا گیا۔

مراکش کی تحقیقِ رویت کے مطابق ۲۷/ اپریل ۱۹۸۷ء کو ۲۸/ شعبان ۱۴۰۷ھ ہونے کی وجہ سے منگل کو رمضان شروع ہونے کا امکان ہی نہیں تھا، ۲۸/ اپریل ۱۹۸۷ء بروز منگل ۲۹/ شعبان کو مراکش میں چاند کی رویت نہ ہوئی، اور ۳۰/ شعبان ۱۴۰۷ھ بروز بدھ ۲۹/ اپریل ۱۹۸۷ء کو برطانیہ میں مختلف شہروں میں سیکڑوں لوگوں نے چاند دیکھا، اور اُنھوں نے بروز جمعرات ۳۰/ اپریل ۱۹۸۷ء سے رمضان شروع کیا، یوں دونوں میں دو دن کا فرق ہوگیا۔

سوال طلب امور:

① مقامی رویت ہونے کے بعد باہر کی مقدم آمدہ خبر کی شرعاً کیا حیثیت ہوگی؟ بالخصوص جب کہ وہ مشتبہ ہونے کے علاوہ بداہت کے بھی خلاف ہو؛ نیز اِس خبر کی وجہ سے مقامی ماہ ۲۸ دن کا ہوجاتا ہو۔

② بعض لوگوں کا خیال ہے کہ برطانیہ میں ۳۰ شعبان، ۲۹ اپریل کو جو چاند دیکھا گیا وہ دو دن پہلے کا تھا، کیا چاند کے بارے میں اِس طرح قیاس کرنا اور یوں اندازہ کرنا صحیح ہے؟ یا چاند چھوٹا ہو یا بڑا اور بعد غروبِ آفتاب زیادہ دیر اُفق پر رہے یا کم، اُسی رات کا شمار ہوگا جس رات وہ دیکھا گیا؟

③ برطانیہ میں ۳۰ شعبان کو چاند کی رویت ہونے کی وجہ سے جنھوں نے

سعودی عرب کی خبر پر دو روز مقدم رمضان شروع کیا، اُن کے دو روزے رمضان میں شمار ہوں گے یا نفل شمار ہوں گے؟

④ اُن کو رمضان کا اختتام برطانیہ کی مقامی رویت کے مطابق ۲۹ یا ۳۰ روزے شمار کر کے کرنا چاہیے؟ یا سعودی عرب کی خبر کے مطابق عید الفطر مقدم رمضان میں منانی چاہیے؟

⑤ برطانیہ کی آبزرویٹری نے اخبارات میں یہ لکھا تھا کہ: قرانِ شمس وقمر ۲۸/ اپریل ۱۹۸۷ء گرینچ وقت کے مطابق رات ایک بج کر ۳۴ منٹ پر ہوگا، اور سعودی معیاری وقت کے مطابق صبح ۴ بج کر ۳۴ منٹ پر ہوگا۔ اور یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ چاند محاق سے پہلے دنیا میں کہیں بھی نظر نہیں آسکتا، تو سعودی میں وہ محاق سے تقریباً دس گھنٹے پہلے کیسے دیکھا گیا؟ چناں چہ یہ اعلان محالِ عادی ہونے کی وجہ سے کیسے صحیح ہوسکتا ہے؟ کیا علمِ ہیئت کا قاعدہ شریعت کے خلاف ہے؟

⑥ بعض لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ عید الاضحیٰ سعودی عرب میں حج کے دوسرے دن برطانیہ میں منائی جائے، کیا حدیث شریف میں یا شریعتِ مطہرہ میں اِس کی کوئی حقیقت ہے کہ سعودی عرب میں جس دن حج ہو اُس کے دوسرے دن برطانیہ میں عید الاضحیٰ منائی جائے؟

نوٹ: مسئلہ اہم اِس وجہ سے ہے کہ رمضان مبارک کے اختتام سے پہلے اِس کا جواب ہو؛ تاکہ لوگ اپنے روزوں کے بارے میں صحیح رہبری حاصل کرسکیں، بناء بریں امید کرتا ہوں کہ جناب والا جلد جواب سے نوازیں گے۔

احقر شبیر ٹیلر

(الجواب): حامداً ومصلیاً ومسلماً

آپ کے سوالات کا جواب دینے سے پہلے چند باتیں تمہیدی طور پر عرض کرتا ہوں، جن سے آپ کے اشکالات بھی انشاء اللہ تعالیٰ دور ہوں گے۔

شرعی احکام کی بنیاد سادگی پر ہے۔

شریعت کے تمام احکام کی بنیاد یسر وسہولت اور سادگی اور بے تکلفی پر ہے، فلسفیانہ تدقیقات پر نہیں؛ کیوں کہ اِس شریعت کا دائرۂ حکومت تمام عالم کے بحر وبر اور اسود و احمر، شہری و دیہاتی، آبادیوں اور اُن کے سُکّان پر حاوی ہے، اسلامی فرائض نماز، روزہ وغیرہ جس طرح شہریوں پر عائد ہیں اِسی طرح دیہاتیوں اور پہاڑوں، درّوں اور جزائر کے رہنے والے ناخواندہ، ناواقف لوگوں پر بھی عائد ہیں۔ اور جو احکام اِس درجہ عام ہوں اُن میں مقتضائے عقل وحکمت ورحمت یہی ہے کہ اُن کو تدقیقاتِ فلسفیہ اور قواعدِ ریاضیہ یا آلاتِ رصدیہ پر موقوف نہ رکھا جائے؛ تاکہ ہر خاص وعام، خواندہ وناخواندہ بہ آسانی اپنے فرائض انجام دے سکے، شریعت کے تمام تر احکام اِسی نظریہ کے تحت بالکل آسان اور سادہ طریقہ پر آئے۔ یہی وجہ ہے کہ شریعت کے وہ احکام جن کا تعلق خاص وقت سے ہے، نماز وغیرہ، اِن کے لیے معیار سورج کے طلوع وغروب اور اُس کے استواء واِنحناء کو بنایا گیا، روزۂ رمضان کا مدار چاند دیکھنے پر رکھا گیا، حساباتِ ریاضیہ کا اعتبار نہیں کیا گیا، مہینے قمری رکھے گئے جن کا مدار رویتِ ہلال پر ہے، شمسی مہینوں کو نہیں لیا گیا؛ اِس لیے کہ اِن کا مدار حساباتِ ریاضیہ پر ہے، احکامِ اسلامیہ کے تتبُّع سے بکثرت اِس کے نظائر معلوم کیے جاسکتے ہیں؛ کیوں کہ آلات اور فنی

چیزیں ہر جگہ اور ہر زمانے میں مہیا نہیں ہوسکتیں، اور اُن کا فراہم ہو جانا یقینی نہیں ہوتا، اگر ایسی چیزوں پر احکام کا دارومدار رکھ دیا جائے تو وہ بہت سے لوگوں بلکہ اکثریت کے لیے نا قابل عمل ہو جائیں گے۔

چناں چہ رمضان اور عید کی آمدورفت کے لیے صحیح احادیث میں وہی فطری اور سادہ اصول بتایا گیا ہے جو اسلام کی روح کے عین مطابق ہے، کہ فنی چیزوں کی فراہمی، آلاتِ رصدیہ اور علمِ حساب کی احتیاج کے بغیر اِس مسئلہ کو حل کیا جائے؛ اِس لیے یہ حکم دیا گیا: "صوموا لرؤيته وأفطروا لرؤيته، فإن أغمي عليكم فاقدروا له ثلثين" مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کو کسی پریشانی میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں ہے، اور نہ دُوربین ودیگر آلاتِ رصدیہ وقواعدِ حسابیہ سے مدد لینے کی حاجت، بس جب چاند ۲۹ تاریخ کو نظر آجائے تب وہ روزہ رکھنا شروع کردیں (اگر رمضان کا چاند ہے)، اور عید کرلیں (اگر عید کا مہینہ ہے)، اور نظر نہ آئے تو تیس دن پورے کرنے کے بعد اگلا دن اُس کے لیے خود ہی متعین ہے، اب اِس کی بھی ضرورت نہیں ہے کہ چاند دیکھا جائے۔

"بذل المجہود" میں ہے:

فعلق الحكم بالصوم وغيره بالرؤية لرفع الحرج عنهم في معاناة حساب التسيير، واستمر الحكم في الصوم، ولو حدث بعدهم من يعرف ذلك؛ بل ظاهر السياق يشعر بنفي تعليق الحكم بالحساب أصلا، وقد ذهب قوم إلى الرجوع إلى أهل التسيير في ذلك، وهم الروافض قال الباجي: وإجماع السلف الصالح حجة عليهم، وقال ابن بزيزة:

وهو مذهب باطل، فقد نهت الشريعة عن الخوض في علم النجوم؛ لأنها حدس وتخمين ليس فيها قطع ولا ظن غالب، مع أنه لو ارتبط الأمر بها لضاق؛ إذ لا يعرفها إلا القليل (۱۱/ ۱۰۵)

اور پھر مزید یہ آسانی کہ ہر شخص پر چاند دیکھنا لازم نہیں کیا گیا؛ بلکہ بتادیا گیا کہ اگر دو ایک (عید کے لیے کم سے کم دو) معتبر دین دار مسلمان (بحالتِ ابر وغبار وغیرہ) چاند دیکھ کر گواہی دے دیں تو سب کے لیے کافی ہے، اور محض اِتنی بات سے ہی مہینہ کی آمد ثابت ہو جائے گی؛ لہٰذا اِس کے تقاضے پر عمل کرنا ضروری ہوگا۔

''بذل المجہود'' میں ہے: (فلا تصوموا حتى تروه ولا تفطروا حتى تروه) قال الحافظ: ليس المراد تعليق الصوم بالرؤية في حق كل أحد؛ بل المراد بذلك رؤية بعضهم، وهو من يثبت به ذلك، أما واحد على رأي الجمهور أو الإثنان على رأي آخرين، ووافق الحنفية على الأول؛ إلا أنهم خصوا ذلك بما إذا كان في السماء علة الغيم وغيره، وإلا متى كان صحوا لم يقبل إلا من جمع كثير يقع العلم بخبرهم (۱۱/ ۱۰۶)

حسابی قواعد اور آلاتِ رصدیہ کا دخل:

حسابی قواعد اور علمِ ہیئت کے اصول سے ہلال کا ثبوت مان کر اُس کے مطابق عمل کرنا روحِ شریعت سے میل نہیں کھاتا؛ بلکہ اِس کو ناقابلِ اعتبار قرار دیا گیا ہے، جیسا کہ ارشادِ نبوی ﷺ: ''إنا أمة أمية، لا نكتب ولا نحسب'' الخ کی تشریح کرتے ہوئے ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ بحوالۂ طیبی فرماتے ہیں:

قال الطيبي: إنا كناية عن جيل العرب، وقوله: ''لا نكتب ولا نحسب'' بيان لقوله أمّية، وهذا البيان ثم الإشارة باليد ثم القول

باللسان ينهيك على أن الاستقصاء في معرفة الشهر لا إلى الكتاب والحساب كما عليه أهل النجامة اه فالمعنى أن العمل على ما يعتاده المنجمون ليس من هدينا وسنّتنا؛ بل علمنا يتعلق برؤية الهلال، فإنا نراه مرة تسعا وعشرين و مرة ثلاثين (مرقات شرح مشكوة ۲/ ۵۰۳)

آگے چل کر حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے تحریر فرماتے ہیں:

قال ابن حجر: وإنما بالغ في البيان بما ذكر مع الإشارة المذكورة ليبطل الرجوع إلى ما عليه الحساب والمنجمون (مرقات۲/ ۵۰۴)

جب مدار رویت پر ٹھہرا تو فقہاء نے چاند کے تتبع اور تلاش کو واجب علی الکفایۃ قرار دیا ہے۔

''فتح القدیر'' میں علامہ ابن الہمام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: (قوله: وينبغي للناس) أي يجب عليهم وهوواجب على الكفاية(فتح القدير ۲/ ۳۱۳)

''مراقی الفلاح شرح نور الایضاح'' میں علامہ شرنبلالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: يجب كفاية التماس الهلال ليلة الثلاثين من شعبان؛ لأنه قد يكون ناقصا (مراقي الفلاح على هامش الطحطاوي: ۳۵٤)

علامہ طحطاوی رحمۃ اللہ علیہ اِس پر حاشیہ تحریر فرماتے ہیں:(يجب) الظاهر منه الافتراض؛ لأنه يتوصل به إلى الفرض، وكذا يجب التماس هلال شوال في غروب التاسع والعشرين من رمضان (طحطاوی علی المراق ۳۵٤)

''فتاویٰ عالمگیری'' میں بحوالہ ''الاختیار شرح المختار'' لکھا ہے: يجب أن يلتمس الناس الهلال في التاسع والعشرين من شعبان وقت الغروب، فإن

رأوه صاموه، وإن غم أكملوه ثلاثين يوما(١/ ١٩٧)

''تبیین الحقائق'' شرحِ کنز الدقائق میں ہے: ويجب التماس الهلال في التاسع والعشرين من شعبان (١/ ٣١٧)

اِس پر علامہ شبلی رحمۃ اللہ علیہ حاشیہ تحریر فرماتے ہیں: (قوله: يجب التماس الهلال الخ) هو واجب على الكفايةاه فتح (حاشية شبلي على الزيلعي شرح الكنز١ /٣١٧)

فقہِ حنفی کے مشہور متن ''مختصر القدوری'' میں ہے: وينبغي للناس أن يلتمسوا الهلال في يوم التاسع والعشرين من شعبان.

اِس کی شرح فرماتے ہوئے علامہ ابوبکر حداد رحمۃ اللہ علیہ رقم طراز ہیں: أي يجب، وكذا ينبغي أن يلتمسوا هلال شعبان أيضا في حق إتمام العدة.

(الجوهرة النيرة ١/ ١٦٧)

عباراتِ منقولۂ بالا سے شعبان، رمضان اور شوال تینوں مہینوں کے چاند کی تلاش اور جستجو کا واجب ہونا معلوم ہوا؛ اس لیے مسلمانوں پر ضروری اور واجب ہے، کہ چاند دیکھنے کی سعی کریں۔ محض اس بنیاد پر کہ کسی جگہ کا مطلع ہمیشہ ابر آلود یا غبار آلود رہتا ہے اس فریضہ کی ادائیگی میں کوتاہی کی گنجائش نہیں نکلتی، برطانیہ کے رہنے والے اس عذر کو پیش کر کے اپنے اس فریضہ کی ادائیگی سے سبکدوش نہیں ہو سکتے، یہ بات الگ ہے کہ باوجود سعی کے مطلع صاف نہ ہونے کی وجہ سے چاند نظر نہ آئے؛ لیکن رویت کا انتظام واہتمام کرنا ان پر ضروری ہو جاتا ہے، اور چاند نظر آنے کی صورت میں شہادت دینا بھی ضروری ہو جاتا ہے، اگر چاند دیکھنے والے کو یہ معلوم ہو کہ میری شہادت پر ثبوت رویت موقوف ہے تو اس پر شہادت دینا واجب ہو جاتا ہے؛ یہاں تک کہ اگر چہ چاند

دیکھنے والی پردہ نشین منکوحہ عورت ہے تب بھی اسی رات گھر سے نکل کر قاضی کے سامنے شہادت پیش کرے، اگر شوہر اجازت نہ دے تو بلا اجازت نکل سکتی ہے۔

''درمختار'' میں ہے: ویجب علی الجاریة المخدرة ان تخرج فی لیلتها بلا اذن مولاها وتشهد کما فی الحافظیة.

علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ اس پر حاشیہ تحریر فرماتے ہیں: قوله ویجب علی الجاریة المخدرة ای التی لا تخالط الرجال، وکذا یجب علی الحرة ان تخرج بلا اذن زوجها وکذا غیر المخدرة والمزوجة بالاولی قال ط: والظاهر ان محل ذلك عند توقف اثبات الرؤیة علیها والا فلا. (شامی ۲/۹۹)

اب اگر کسی جگہ باوجود سعی وتتبع کے مطلع صاف نہ ہونے کی وجہ سے چاند نظر نہ آئے، تو اس صورت میں دوسری جگہ سے بطریق موجب آئی ہوئی خبر پر عمل کیا جاسکتا ہے بشرطیکہ اس کو ماننے سے مہینہ ۲۸ یا ۳۱ کا لازم نہ آتا ہو۔ (فتاوی محمودیہ ۳/۱۲۲)

رویت ہلال کے معاملہ میں آلات رصدیہ اور حسابات ریاضیہ کے ناقابل اعتبار ہونے کا مسئلہ تقریباً اجماعی مسئلہ ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ شرح بخاری میں فرماتے ہیں:

والمراد بالحساب هنا حساب النجوم وتسییرها، ولم یکونوا یعرفون من ذلك ایضاً الا النزر الیسیر، فعلق الحکم بالصوم وغیره بالرؤیة لرفع الحرج عنهم فی معاناة حساب التسییر واستمر الحکم فی الصوم ولو حدث بعدهم من یعرف ذلك بل ظاهر السیاق یشعر بنفی تعلیق الحکم بالحساب اصلاً، ویوضحه قوله فی الحدیث الماضی: (فان غم

علیکم فاکملوا العدۃ ثلاثین) ولم یقل فسلوا اهل الحساب والحکمة فیه کون العدد عند الاغماء یستوی فیه المکلفون فیرتفع الاختلاف والنزاع عنهم، وقد ذهب قوم الی الرجوع الی اهل التسییر فی ذلك وهم الروافض، ونقل عن بعض الفقهاء موافقتهم قال الباجی واجماع السلف الصالح حجة علیهم وقال ابن بزیزه وهو مذهب باطل فقد نهت الشریعة عن الخوض فی علم النجوم لأنها حدس وتخمین لیس فیها قطع ولا ظن غالب مع انه لو ارتبط الامر بها لضاق اذ لایعرفها الا القلیل(فتح الباری ٤/١٠٢)

علامہ ابن رشد مالکی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

فان العلماء اجمعوا علی ان الشهر العربی یکون تسعاً و عشرین ویکون ثلاثین وعلی ان الاعتبار فی تحدید شهر رمضان انماهوالرؤیة.

(بدایة المجتهد ١/ ٢٠٧)

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

واختلف العلماء فی معنی "فاقدرواله" فقالت طائفة من العلماء: معناه ضیقوا له وقد روه تحت السحاب، وممن قال بهذا احمد بن حنبل وغیره ممن یجوّز صوم یوم لیلة الغیم عن رمضان کما سنذکره انشاء الله تعالیٰ، وقال ابن سریج وجماعة منهم مطرف بن عبدالله وابن قتیبة وآخرون: معناه قدروه بحساب المنازل، وذهب مالك والشافعی وابوحنیفة وجمهور السلف والخلف الیٰ ان معناه قدروا له تمام العدد ثلاثین یوماً قال المازری حمل جمهور الفقهاء قوله ﷺ "فاقدروا له" علیٰ ان المراد اکمال العدة ثلاثین کما فسره فی حدیث آخر، قالوا ولا یجوز ان یکون

المراد حساب المنجمين لان الناس لو كلفوابه ضاق عليهم لانه لا يعرفه الا افراد والشرع انما يعرف الناس بما يعرفه جماهيرهم.

(نووی شرح مسلم ۱/ ۳۴۷)

شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ ”اوجز المسالك شرح مؤطا امام مالك“ میں تحریر فرماتے ہیں:

والثالث: معناه قدروه بحسب المنازل، قاله أبوالعباس ابن سريج من الشافعية، ومطرف بن عبدالله من التابعين، وابن قتيبة من المحدثين، قال ابن عبدالبر: لا يصح عن مطرف، وأما ابن قتيبة فليس هو ممن يعرج عليه في مثل هذا قال الباجي: وذكر الداودي أنه قيل في معنىٰ قوله ”فاقدروا له“ أي قدروا المنازل، وهذا لانعلم أحداً قال به إلا بعض أصحاب الشافعي، أنه يعتبر في ذلك بقول المنجمين، والإجماع حجة عليه (أوجز ۵/۱٦)

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ شرح مشکوۃ میں فرماتے ہیں:

وفى شرح السنة قال ابن السريج: فا قدروا خطاب لمن خصه الله بهذا العلم، وقوله فاكملوا العدة خطاب للعامة اه وهو مردود لحديث ”انا امة امية لانكتب ولانحسب“ فانه يدل علىٰ ان معرفة الشهر ليست الى الكتاب والحساب كما يزعمه اهل النجوم، و للاجماع على عدم الاعتداد بقول المنجمين ولو اتفقوا على انه يرى ولقوله تعالى مخاطباً لخير امة اخرجت للناس خطاباً عاماً فمن شهد منكم الشهر فليصمه، ولقوله ﷺ بالخطاب العام ”صوموا لرؤيته وافطروا لرؤيته“ ولما فى نفس هذا الحديث لاتصوموا حتىٰ تروه ولما فى حديث ابى داؤد

والترمذی عن ابی ھریرۃ انہ علیہ الصلوٰۃ والسلام قال: الصوم یوم یصومون والفطر یوم یفطرون؛ بل اقول لو صام المنجم عن رمضان قبل رؤیتہ بناءً علی معرفتہ یکون عاصیاً فی صومہ، ولا یحسب عن صومہ الا اذا ثبت الھلال علی خلاف فیہ ولو جعل عید الفطر بناءً علی زعمہ الفاسد یکون فاسقاً وتجب علیہ الکفارۃ فی قول وھو الصحیح وان استحل افطارہ فرضاًعن عدہ واجباًصار کافراً. (مرقات ۴/ ۲۴۲ جدید)

علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

(قولہ لاعبرۃ بقول الموقتین) ای فی وجوب الصوم علی الناس بل فی المعراج لا یعتبر قولھم بالاجماع، ولا یجوز للمنجم ان یعمل بحساب نفسہ وفی النھر، فلایلزم بقول الموقتین انہ ای الھلال یکون فی السماء لیلۃ کذا وان کانوا عدولاً فی الصحیح کما فی الایضاح(شامی ۲/ ۱۰۰)

ان تمام عباراتِ منقولۂ بالا سے یہ بات صاف صاف معلوم ہوتی ہے کہ رویت ہلال کے معاملہ میں حسابات ریاضیہ اور آلات رصدیہ کا اعتبار نہیں، اور یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ مسئلہ اجماعی ہے۔ بعض شافعیہ حساب کے معتبر ہونے کے قائل ہیں لیکن خود ان کے ہم مسلک مشائخ نے ان کا رد کیا ہے، علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے رسالہ "تنبیہ الغافل والوسنان علی احکام ھلال رمضان" میں ایک مستقل فصل قائم فرما کر اس مسئلہ پر کلام فرمایا ہے، جس میں مذاہب اربعہ کی کتب معتبرہ کی نقول پیش فرما کر اس کا اجماعی ہونا ثابت فرمایا ہے۔ ملاحظہ ہو: رسائل ابن عابدین ۱/ ۲۴۶ تا ۲۴۹۔

عمومی طور پر جب یہ فیصلہ کرلیا گیا کہ حسابات ریاضیہ کا اس معاملہ میں اعتبار نہیں تو اس سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ اس کا اعتبار جس طرح وجوب صوم میں نہیں کیا گیا،

اسی طرح اگر ثقہ اور عادل گواہوں نے اس بات کی گواہی دی کہ ہم نے چاند دیکھا ہے اور حسابات ریاضیہ کے اعتبار سے اس روز رویت کا امکان نہیں تو اس صورت میں بھی محض حسابات ریاضیہ کی وجہ سے ان شاہدوں کی شہادت کو رد نہیں کیا جائے گا، لیکن چوں کہ عام طور پر حضرات مصنفین جہاں حسابات ریاضیہ کے عدم اعتبار کو بیان فرماتے ہیں، وہاں بطور مثال پہلی صورت تحریر فرماتے ہیں کہ اگر مطلع صاف نہ ہونے کی وجہ سے چاند نظر نہیں آیا اور منجمین و اہل ہیئت یہ بتلاتے ہیں کہ چاند موجود ہے تو محض ان کی بات پر روزہ واجب نہ ہوگا، (بلکہ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ کی عبارت میں تو یہاں تک ہے کہ کسی حساب داں نے محض اپنے حساب کی بنیاد پر بلا رویت شرعی روزہ رکھا تو وہ گنہگار ہوگا، اور اسی بنیاد پر عید الفطر منائی تو فاسق ہوگا، اور افطار کو وجوبی طور پر حلال سمجھا تو کافر قرار دیا جائے گا) اس سے شاید یہ غلط فہمی ہو کہ دوسری صورت میں یعنی: جب کہ حسابات ریاضیہ سے رویت کا عدم امکان ثابت ہوتا ہو اور شرعی شہادت رویت کی میسر ہو جائے تو وہ رد کر دی جائے گی؛ حالاں کہ ایسا نہیں ہے، بلکہ علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے جہاں علامہ سبکی شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ”اہل حساب کے قول کا اعتبار کیا جائے گا؛ اس لیے کہ حساب قطعی چیز ہے“ وہیں انہوں نے اس کی صراحت فرمائی ہے، کہ علامہ سبکی رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول کی خود ان کے ہم مسلک مشائخ نے تردید فرمائی ہے، اس موقع پر جو عبارات مشائخ شافعیہ کی نقل فرمائی ہیں، اس میں اس دوسری صورت کی صراحت موجود ہے اور اس میں صاف صاف لکھا ہے کہ اہل حساب کے قول کی وجہ سے شہادت رد نہیں کی جا سکتی، بلکہ شہادت پر ہی عمل ہوگا؛ اس لیے کہ شارع نے شہادت کو یقین کا قائم مقام قرار دیا ہے ملاحظہ ہو:

وللامام السبکی الشافعی تالیف مال فیه الی اعتماد قولهم لان الحساب قطعی اھ ومثله فی شرح الوهبانیة، قلت: ما قاله السبکی رده متأخرو اهل مذهبه منهم ابن حجر والرملی فی شرحي المنهاج، وفی فتاوی الشهاب الرملی الکبیر الشافعی سئل عن قول السبکی لوشهدت بینة برؤیة الهلال لیلةالثلاثین من الشهر وقال الحساب بعدم امکان الرویة تلك اللیلة عمل بقول اهل الحساب لان الحساب قطعی والشهادة ظنیة، واطال فی ذلك فهل یعمل بما قاله ام لا؟ وفیما اذا رؤی الهلال نهاراً قبل طلوع الشمس یوم التاسع والعشرین من الشهر وشهدت بینة برؤیة الهلال رمضان لیلة الثلاثین من شعبان فهل تقبل الشهادة ام لا؟ لأن الهلال اذا کان الشهر کاملاً یغیب لیلتین او ناقصاً یغیب لیلة او غاب الهلال اللیلة الثالثة قبل دخول وقت العشاء لأ نه ﷺ کان یصلی العشاء لسقوط القمر الثالثة هل یعمل بالشهادة ام لا؟ فاجاب: بأن المعمول به فی المسائل الثلاث ما شهدت به البینة لأن الشهادة نزلها الشارع منزلة الیقین، وما قاله السبکی مردود ردّه علیه جماعة من المتأخرین ولیس فی العمل بالبینة مخالفة لصلاته ﷺ ووجه ما قلناه ان الشارع لم یعتمد الحساب بل الغاه بالکلیة بقوله ”نحن امة امیة لا نکتب ولا نحسب الشهر هکذا وهکذا“ وقال ابن دقیق العید الحساب لا یجوز الاعتماد علیه فی الصلوة، انتهی والاحتمالات التی ذکرها السبکی بقوله ولأن الشاهد قد یشتبه علیه الخ لااثر لها شرعاً لامکان وجودها فی غیرها من الشهادات اھ

(رد المحتار علی الدر المختار ۲/۱۰۰)

اس بحث سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اگر رصدگاہ والے یہ اعلان کریں کہ فلاں روز رویت ممکن نہیں، اور شہادت شرعیہ سے اس روز رویت ثابت ہو جائے تو شہادت پر ہی عمل ہوگا، محض رصدگاہ کی تحقیق وحساب کی وجہ سے شہادت رد نہیں کی جاسکتی، ہاں یہ ضرور ہے کہ اس شہادت کو ماننے کی وجہ سے مہینہ ۲۹ سے کم کا لازم نہ آتا ہو؛ اس لیے کہ اگر مہینہ ۲۹ سے کم کا لازم آتا ہے تو وہ دن محل شہادت ہی نہیں۔

لقوله عليه الصلوة والسلام: الشهر هكذا وهكذا وهكذا، وعقد الابهام في الثالثة ثم قال: الشهر هكذا وهكذا وهكذا يعني تمام الثلاثين يعني مرة تسعاً و عشرين ومرة ثلاثين (متفق عليه)

اس جگہ ان حضرات کو جو حساب کے قطعی ہونے کے قائل ہیں، بڑا اشکال یہ پیش آتا ہے کہ جب آیت قرآنی سے شمس وقمر کا ایک حساب سے جاری ہونا ثابت ہے، تو پھر ہم حساب کی قطعیت کی بنیاد پر شہادت کو کیوں رد نہ کریں؟ کیا ان آیات قرآنی سے صرف نظر کرلیا جائے؟ تو ان حضرات کی خدمت میں عرض ہے کہ جو بات قرآن مجید سے ثابت ہے، وہ تو صرف اتنی ہے کہ ﴿الشمس والقمر بحسبان﴾ شمس وقمر کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک حساب مقرر فرمایا ہے، اور یہ دونوں اس حساب سے سرِ مو تجاوز نہیں کرسکتے؛ لیکن اس حساب کی تفصیل تو قرآن یا حدیث میں موجود نہیں، یہ کیا ضروری ہے کہ اہل ہیئت وریاضی جس حساب کے دعویدار ہیں وہی مراد ہو، اور اگر مان بھی لیں کہ وہی حساب مراد ہے تب بھی یہ دعوی کہ وہ حساب قطعی ہے محل نظر ہے۔ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ خود ان فنی معلومات کی حقیقت پر نظر کی جائے تو معلوم ہوگا کہ اگرچہ حساب بحیثیت حساب کے قطعی ہو کہ دو اور دو چار ہی ہو

سکتے ہیں، تین یا پانچ نہیں ہو سکتے لیکن ان دو کا دو ہونا یہ ہماری نظر اور اندازے وتخمینہ ہی کا حکم ہو سکتا ہے کتنے ہی باریک سے باریک پیمانوں سے تولا اور پرکھا جائے یہ احتمال ختم کرنا ہماری قدرت میں نہیں کہ ہم نے جس کو دو سمجھا ہے وہ دو سے کسی قدر کم یا زیادہ ہو، خواہ یہ کمی یا زیادتی ایک بال کے ہزارویں حصہ کے برابر ہو اور یہ بھی ظاہر ہے کہ زمین کے فرش پر کسی زاویہ میں ایک بال کے ہزارویں حصے کی کمی یا زیادتی اگرچہ بالکل غیر محسوس زیادتی ہے؛ مگر اوپر کی فضاء اور سیاروں تک جب اس زاویہ کے خطوط ملائے جائیں گے تو میلوں کا فرق ہو جائے گا ''مذہب اور سائنس'' کتاب میں گارڈن بلیف کا ایک اقتباس لیا ہے، جس میں صراحت ہے کہ چاند ہم سے دو لاکھ چالیس ہزار میل دور ہے، سورج قریبا نو کروڑ تیس لاکھ میل دور ہے۔ (ص ۶۹) ساتھ ہی یہ یاد رکھنا چاہیے کہ مثلاً آفتاب کو جب ہم کسی وقت دیکھتے ہیں تو وہ آٹھ منٹ پہلے کا آفتاب ہوتا ہے اس طرح قریب ترین جس ستارہ کو ہم دیکھتے ہیں وہ چار سال پہلے کا ہوتا ہے۔ (ص ۷۱) ہم سے قریب ترین ستارہ بھی اتنی دور ہے کہ اس کی روشنی ہم تک آنے میں چار سال لگ جاتے ہیں حالاں کہ روشنی ایک سیکنڈ میں ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل سفر کرتی ہے۔ (ص ۷۲) اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ کیمرہ کی طرح ترقی یافتہ آلات جھوٹ نہیں بولتے؛ مگر ان آلات کو واقعات پر منطبق کرنا تو بہرحال انسانی نظر اور انسانی عمل ہے اس میں غیر محسوس فرق ہو جانا کسی وقت بھی مستبعد نہیں؛ بلکہ واقع ہے جس کا مشاہدہ ہمیشہ اہل فن کے باہمی اختلافات سے ہوتا رہتا ہے، دنیا میں جتنی جدید اور قدیم تقویمیں اور جنتریاں اور کیلنڈر وجود میں آئے ہیں ان میں سے صرف ان کو لیا جائے جو مسلم ماہرین فن نے تیار کیے ہیں، تو ان میں بھی باہمی اختلاف

نظر آتا ہے، اگر ان حسابات اور آلات کے نتائج قطعی اور یقینی ہوتے تو ماہرین فن کے اختلاف رائے کا کوئی احتمال نہ رہتا، سائنس کی نئی ترقیات اور فن ریاضی وفلکیات کی جدید ترقیات کا آج کی دنیا میں بڑا ہنگامہ ہے، اور اس میں شبہ نہیں کہ بہت سی نئی تحقیقات نے پرانے فلسفہ اور ریاضی کے اصول کی دھجیاں بکھیر دیں اور اس کے خلاف مشاہدہ کرادیا؛ لیکن اس کے باوجود یہ نہیں کہا جاسکتا کہ آج ایک محقق ماہر نے جو کچھ کہہ دیا وہ حرف آخر ہے اس کی تغلیط آئندہ کوئی نہیں کرسکے گا۔ آئندہ کو چھوڑ کر اسی موجودہ دور میں اسی درجہ کے دوسرے ماہرین اس سے مختلف رائے رکھتے ہیں۔

(رویت ہلال ص ۳۸/۳۹)

آگے چل کر تحریر فرماتے ہیں: اتنی بات اس اختلاف میں سب کے لیے واضح ہوگئی کہ ان قواعد وآلات سے حاصل ہونے والے نتائج کو قطعی اور یقینی کہنا محض خوش گمانی ہے، صحیح یہ ہے کہ اس میں بھی غلطیاں ہوسکتی ہیں، چوتھی صدی ہجری کا مشہور اسلامی فلاسفر اور ماہر نجوم وفلکیات ابوریحان البیرونی جو شہاب الدین غوری کے زمانہ میں ایک مدت دراز تک ہندوستان میں بھی رہا ہے اور ان فنون کا بے نظیر امام مانا جاتا ہے، اسی نئی روشنی اور نئی تحقیقات کے دور میں بھی اس کی امامت سب کے نزدیک مسلم ہے، روسی ماہرین نے اس کی تحقیقات سے راکٹ وغیرہ کے مسائل میں بڑا کام لیا ہے، ان کی مشہور کتاب "الاثار الباقیة عن القرون الخالیة" ایک جرمن ڈاکٹر سی ایڈورڈ سخاؤ کے حاشیہ کے ساتھ لیزک میں چھپ کر شائع ہوئی ہے، اس میں ان آلات رصدیہ کے ان نتائج کے غیر یقینی ہونے کے مسئلہ کو تمام ماہرین فن کا اجماعی اور اتفاقی نظریہ بتلایا ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:

ان علماء الهيئة مجمعون على ان المقادير المفروضة فى اواخر اعمال رؤية الهلال هى ابعاد لم يوقف عليها الا بالتجربة، وللمناظر احوال هندسية يتفاوت لاجلها المحسوس بالبصر فى العظم والصغر، وفى ما اذا تاملها متأمل منصف لم يستطع بت الحكم على وجوب رؤية الهلال او امتناعها. (الاثار الباقية ص ۱۹۸ طبع ليزك ۱۹۲۳ء)

علماء ریاضی وہیئت اس پر متفق ہیں کہ رویت ہلال کے عمل میں آنے کے لیے جو مقداریں فرض کی جاتی ہیں وہ سب ایسی ہیں جن کو صرف تجربہ ہی سے معلوم کیا جاسکتا ہے اور مناظر کے احوال مختلف ہوتے ہیں جن کی وجہ سے آنکھوں سے نظر آنے والی چیز کے سائز میں چھوٹے بڑے ہونے کا فرق ہوسکتا ہے، اور فضائی وفلکی حالات ایسے ہیں کہ ان میں جو بھی ذرا غور کرے گا، تو رویت ہلال کے ہونے اور نہ ہونے کا کوئی قطعی فیصلہ ہرگز نہ کر سکے گا۔

اور "کشف الظنون" میں بحوالہ زیچ شمس الدین محمد بن علی خواجہ کا چالیس سالہ تجربہ یہی لکھا ہے کہ ان معاملات میں کوئی صحیح اور یقینی پیشن گوئی نہیں کی جاسکتی جس پر اعتماد کیا جاسکے۔ (کشف الظنون ۲/۹۶۹، رویت ہلال ص ۴۱/۴۲)

اور جب یہ ثابت ہوگیا کہ رصد گاہوں اور آلات رصدیہ کے ذریعہ حاصل کردہ معلومات بھی رویت ہلال کے مسئلہ میں کوئی یقینی فیصلہ نہیں کہلا سکتی، بلکہ وہ بھی تجرباتی اور تخمینی معاملہ ہے تو اس اصول کے حکیمانہ اصول ہونے کی اور بھی تائید ہوگئی، جو رسول امی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس معاملہ میں اختیار فرمایا کہ ان کاوشوں اور باریکیوں میں امت کو الجھائے بغیر بالکل سادگی کے ساتھ رویت ہونے نہ ہونے پر احکام شرعیہ کا

مدار رکھ دیا، جس پر ہر شخص ہر جگہ ہر حال میں آسانی سے عمل کر سکے۔ (رویت ہلال ص ۴۲)

شہادت کے لیے جب ایک ضابطہ شریعت نے مقرر فرمایا تو اس میں مزید قیود کا اضافہ دلیل شرعی کے بغیر ممکن نہیں، وہ شہادت اہل ہیئت کے قطعی حساب کے خلاف نہ ہو، یہ ایک ایسی قید ہے جس کا کوئی شرعی ماخذ نہیں۔ پھر حساب کو قطعی کہنا خود بلا دلیل اور اہل ہیئت کی تصریحات کے خلاف ہے۔ جو حضرات قطعیت حساب کے دعویدار ہیں ان کے غور و فکر کے لیے دو واقعے پیش کر رہا ہوں۔

دو واقعے:

① علمائے امت کا اتفاق ہے کہ دنیا کی تمام مساجد محض تحری و تخمینہ سے قائم کی گئی ہیں، لیکن مسجد نبوی کی سمت بطور وحی و مکاشفہ قائم کی گئی ہے، حق تعالیٰ نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے بیت اللہ کو بطور معجزہ کر دیا تھا، اس کو دیکھ کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسجد مدینہ کی بنیاد رکھی۔

''بحر الرائق'' میں ہے: نقل عن ابی بکر الرازی فی محراب المدینة انه مقطوع به فانه انما نصبه رسول الله ﷺ بالوحی (۱/ ۳۰۳) ''در مختار'' میں ہے: وکذا المدنی لثبوت قبلتها بالوحی (در مختار علی هامش الشامی ۱/ ۳۱۵)

اِس لیے باجماع امت مسجد نبوی کی سمت بالکل یقینی ہے لیکن حسابات ریاضیہ سے جانچا گیا تو وہ بھی صحیح نہیں اتری؛ چناں چہ امیر مصر احمد ابن طولون نے جب مصر میں اپنی جامع مسجد بنانے کا ارادہ کیا تو چند ماہرین ھندسہ کو مدینہ منورہ بھیج کر پہلے مسجد نبوی کی سمت قبلہ کو آلات ِریاضیہ سے جانچا تو معلوم ہوا کہ آلات کے ذریعہ نکالے ہوئے خط سمت قبلہ سے مسجد نبوی کی سمت قبلہ دس درجہ مائل بجنوب ہے جیسا

کہ علامہ مقریزی نے کتاب الخطط ۲ / ۲۵۶ میں بالفاظ ذیل اس کا ذکر کیا ہے:

ان احمد ابن طولون لما عزم على بناء هذاالمسجد بعث الى محراب رسول الله ﷺ من اخذ سمته فاذا هو مائل عن خط سمت القبلة المستخرج بالصناعة نحو عشر درج الى جهة الجنوب

اب جو لوگ آلات رصدیہ پر مدار رکھتے ہیں اور اس پر فخر کرتے ہیں وہ دیکھیں کہ ان کی تجویز پر تو مسجد نبوی کی سمت قبلہ بھی پوری نہیں اترتی۔ اگرچہ موجودہ زمانہ کے آلات کے مطابق مسجد نبوی کی سمت، قبلہ کے عین مطابق ہے لیکن اس سے اتنا تو معلوم ہوا کہ آلات پر مدار رکھنا اور اصول شرع کو محض آلات رصدیہ کی وجہ سے چھوڑنا غلط طریقہ ہے۔

(۲) نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں سورج گرہن ہوا تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُس کی نماز بھی پڑھی اور پڑھائی تھی۔ ''بخاری شریف'' اور دیگر کتبِ حدیث میں اِس کی صراحت موجود ہے کہ، سورج گرہن کا یہ واقعہ اُس روز پیش آیا تھا جس روز آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صاحب زادہ حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کی وفات ہوئی۔ اِس موقع پر علامہ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے اکثر اہل سِیر کے حوالہ سے یہ بھی بیان کیا ہے کہ: حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کی وفات دس چاند کو ہوئی تھی، دو قول اَور بھی ذکر کیے ہیں جن میں ایک چار چاند کا اور دوسرا چودہ کا ہے۔ چناں چہ فرماتے ہیں:

(قوله: يوم مات ابراهيم) يعني ابن النبي ﷺ، وقد ذكر جمهور أهل السير أنه مات في السنة العاشرة من الهجرة، فقيل: في ربيع الاول، وقيل: في رمضان، وقيل: في ذي الحجة، والأكثر على أنها وقعت

في عاشر الشهر، وقيل: في رابعه، وقيل: في رابع عشرة (فتح الباري ٢/ ٤٢٣)

چناں چہ خود حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی دوسری تصنیف ”الإصابة“ ١/ ٩٣ میں اور علامہ ابن عبد البر مالکی رحمۃ اللہ علیہ نے ”الاستيعاب على هامش الإصابة“ (١/ ٤٣) میں بھی دس چاند والا قول نقل فرمایا ہے۔

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے ”مرقات شرحِ مشکوۃ“ میں حافظ کے حوالہ سے اِسی کو ذکر کیا ہے: قال ابن حجر: وكان ذلك يوم عاشر الشهر، كما قاله بعض الحفاظ. (مرقات ٢/ ٢٧٥)

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ”أوجز المسالك“ میں اِس کو ”شرحِ احیاء“ اور ”تاریخ الخمیس“ کے حوالہ سے ذکر کیا ہے:

قلت: وذكره في تاريخ الخميس في السنة السادسة، فقال: وفي هذه السنة كسفت الشمس أول مرة قبل الكسوف الذي كان فيه موت إبراهيم، كذا في الوفاء، ثم ذكر في السنة العاشرة، فقال: وفي هذه السنة يوم الثلثاء لعشر ليال خلون من ربيع الأول توفى إبراهيم بن رسول الله ﷺ وانكسفت الشمس يوم مات، فقال الناس: إنما كسفت لموت ابراهيم، قيل: إن الغالب أن الكسوف يكون يوم الثامن والعشرين أو التاسع والعشرين وانكسفت في العاشر، فقالوا: إذها كسفت لموته، انتهىٰ (أوجز المسالك ٤/ ٢٥)

اہلِ ہیئت کے نزدیک یہ بات اصولِ مسلمہ میں سے ہے کہ سورج گرہن قمری مہینہ کی آخری تاریخوں (٢٧/ ٢٨/ ٢٩) میں ہوتا ہے، اور یہاں حدیث میں تصریح موجود ہے کہ حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کی وفات کے روز سورج گرہن ہوا، اور اکثر

اہلِ سیر یہ فرماتے ہیں کہ: اِن کی وفات دس چاند کو ہوئی، جس کا مطلب یہ ہوا کہ دس چاند کو سورج گرہن ہوا، اب اگر اہلِ ہیئت سے اِس سلسلہ میں دریافت کیا جائے تو وہ صاف صاف لفظوں میں یہ کہیں گے کہ: یہ ناممکن اور محال ہے؛ لیکن علمائے کرام اور محدثینِ عظام اِسی واقعہ کو اُن کی تردید کے لیے پیش فرماتے ہیں؛ چناں چہ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ اِسی موقع پر تحریر فرماتے ہیں:

وفيه رد على أهل الهيئة لأنهم يزعمون أنه لا يقع في الأوقات المذكورة، وقد فرض الشافعي وقوع العيد والكسوف معاً، واعترضه بعض من اعتمد على قول أهل الهيئة، وانتدب أصحاب الشافعي لدفع قول المعترض فأصابوا (فتح الباري ٢/ ٤٢٣)

دیکھیے حافظ نے اِس موقع پر اہلِ ہیئت کی تردید فرمائی ہے؛ (بلکہ اُن کی اِس عبارت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ ممکن ہے کہ عید اور کسوف دونوں جمع ہو جائیں، اور اہلِ ہیئت کی بات کا اعتبار کرنے والوں کی طرف سے امام پر جو اعتراض وارد کیا گیا اُس کا اصحابِ شوافع نے جواب دیا، اور اُن کے اِس جواب کی خود حافظ "فأصابوا" فرما کر تصویب و تائید کر رہے ہیں)۔

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ بھی شرح مشکوۃ میں یہی بات فرماتے ہیں:

وفيه رد لقول أهل الهيئة: لا يمكن كسوفها في غير يوم السابع أوالثامن أو التاسع والعشرين؛ إلا أن يريد أن ذلك باعتبار العادة وهذا خارق لها (مرقاة ٢/ ٢٧٥)

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے "اوجز" میں اِس مسئلہ پر

مستقل بحث فرمائی ہے:

والسادس فيما قال أهل الهيئة: أن الكسوف لايكون إلا في الثامن والعشرين أوالتاسع والعشرين، وقد ورد عند أهل التاريخ وقوعهما في الأوقات المختلفة، وورد أن الشمس كسفت عند شهادة الإمام حسين في العاشوراء، وتقدم عن العيني راداً على أهل الهيئة أنه لو كان الكسوف لوقوعه في ظل الأرض في وقت لكان ذلك الوقت محدوداً معلوماً؛ لان المجرى منهما محدود معلوم، فلما كان تأتي في الأوقات المختلفة والجرى واحد والحساب واحد علم قطعاً فساد قولهم. انتهى.

(أوجز المسالك ٥/٢٤)

اس لیے رویت ہلال کی شہادت بھی محض اس وجہ سے رد نہیں کی جاسکتی کہ رصدگاہ والے اس روز رویت کو ناممکن قرار دیتے ہیں۔

اس تمہیدی وضاحت کے بعد آپ کے سوالات کے جوابات بالترتیب حسب ذیل ہیں:

① باہر سے آئی ہوئی خبر کو ماننے سے مقامی مہینہ ۲۸ کا ہو جاتا ہے تو اس پر عمل جائز نہیں، جیسا کہ تمہید میں واضح کیا جاچکا، اور اگر ۲۹ ویں تاریخ کو یہ خبر بطریق موجب موصول ہوئی تو اس پر عمل کیا جائے گا۔

② مقامی حساب سے ۲۹/ شعبان مطابق ۲۸/ اپریل کو بطریق موجب خبر رویت حاصل ہونے پر جب رویت کا فیصلہ کر دیا گیا ہو، اور اس کے بعد ۲۹/ اپریل کی شام نظر آنے والے چاند کو دو دن پہلے کا بتلایا جاوے تو اس میں کوئی حرج نہیں؛ اس لیے کہ بعض مرتبہ ابر کی وجہ سے چاند کئی روز نظر نہ آئے اور بعد میں ابر صاف

ہونے پر یا چاند کا سائز بڑا ہونے پر ابر کے باوجود نظر آئے تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ اسی روز کا ہے؛ اس لیے کہ شرعی طریقہ سے مہینہ ثابت ہو چکا ہے۔ ممانعت جو وارد ہوئی ہے وہ اس صورت میں ہے جب کہ اس کا ثبوت بطریق موجب پہلے سے نہیں ہوا ہو، اور محض چاند کے سائز کی بنیاد پر اس کو ایک دو روز کا بتلایا جائے۔

③ بطریق موجب ثبوت فراہم ہونے پر روزے رکھے ہیں تو وہ رمضان ہی کے شمار ہوں گے۔

④ جب سعودیہ کی خبرِ شرعی پر رمضان کا ثبوت مان لیا گیا تو اب اگر اس حساب سے ۲۹ ویں کی شام چاند نظر آ جاوے تو عید الفطر منالیں اور ۲۹ کی شام چاند نظر نہ آنے کی صورت میں ۳۰ روزے مکمل کر کے عید مناویں۔

⑤ تمہید میں بیان کردہ تفصیل میں اس کا جواب آ چکا ہے۔

⑥ حدیث میں ایسی کوئی تصریح نہیں ہے؛ البتہ اگر سعودی رویت کی خبر بطریق موجب برطانیہ پہنچ گئی تو اس پر عمل کیا جا سکتا ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

حررہ: العبد احمد خانپوری، ۱۲ ذی القعدہ ۱۴۰۷ھ
الجواب صحیح والمجیب نجیح: محمود غفرلہ

مکتوب گرامی حضرت مفتی محمود حسن گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

محترمی زید احترامہ!　　السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا خط ملا، آپ کا فتوی ماشاء اللہ بہت جامع اور مفید معلومات پر مشتمل ہے

اور آپ کا طرز استدلال نہایت پختہ ہے، کیا اچھا ہو کہ یہ چھپ جائے دوسروں کو بھی زیادہ سے زیادہ نفع پہنچے۔ حضرت مہتمم صاحب دامت برکاتہم کی خدمت میں بہت بہت سلام، دعا کی درخواست۔ تعطیل عید الاضحیٰ میں ہتھورا، باندہ، کانپور کا نظام تجویز ہو رہا ہے پھر اس کے بعد کلکتہ ہوتے ہوئے انشاء اللہ آپ کی خدمت میں حاضری کا ارادہ ہے، جس کی اطلاع کسی وقت انشاء اللہ کر دوں گا۔ مولانا احمد بزرگ ماشاء اللہ بہت خوش نصیب ہیں اللہ پاک حج مقبول نصیب فرمائے۔ گھر میں بچوں کو اور ان کی والدہ کو دعا سلام، بڑی بچی کو بھی اللہ تعالیٰ صحت عطا فرمائے۔ فقط والسلام

املاہ: العبد محمود غفرلہ، ۲۲/۱۱/۱۴۰۷ھ

مذکورہ فتوے پر مولانا یعقوب قاسمی مدظلہ کے چند اشکالات

محترمی مولانا احمد صاحب زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

عزیز شبیر ٹیلر پر مرسلہ مفصل فتوی بابت ’’برطانیہ میں رویت‘‘ پڑھا۔ اس پر حسب ذیل چند باتیں بطور افہام وتفہیم پیش خدمت ہیں:

(الف) جواب کی تمہید کا خلاصہ یہ ہے کہ اثباتِ شہورِ اسلامی میں اعتبار رویت ہلال کا ہے نہ کہ فلکی حساب کا۔

راقم آثم بھی اس سے متفق ہے کہ اسلامی ماہ کے تعین کا مدار چاند کی بصری ارضی رویت پر ہے، اور علماء ہیئت وفلک بھی یہ لکھتے ہیں کہ چاند کی ارضی بصری رویت کے وقت کا حتمی فیصلہ کسی قسم کے حساب سے نہیں کیا جا سکتا، کیوں کہ اس میں بہت سے

عوامل کارفرما ہوتے ہیں؛ اس لیے علم ہیئت کے ماہرین امکان رویت کو فرماتے ہیں۔

اگر علم ہیئت کا حساب ۲۹/ تاریخ کو امکان رویت ہلال کو بتائے؛ مگر رویت بصری نہ ہو تو اسلامی ماہ کی یکم تاریخ کا فیصلہ امکان رویت کے حساب کی وجہ سے نہیں کیا جائے گا، بلکہ ۳۰ دن مکمل کر کے دوسرا ماہ شروع کیا جائے گا، جس کی تازہ مثال یہ ہے کہ ۲۹/ ذی الحجہ ۱۴۰۷ھ ۲۵/ اگست کو علم ہیئت کے حساب سے چاند کی رویت کا قوی امکان تھا؛ مگر ۲۵/ اگست کو رویت بصری نہ ہونے کی وجہ سے مراکش اور جہاں بھی رویت ہلال کا اہتمام ہوتا ہے ۳۰/ ذی الحجہ مکمل کر کے یکم محرم ۱۴۰۸ھ ۲۷/ اگست بروز جمعرات متعین ہوا جب کہ سعودی عرب میں ۲۵/ اگست بروز منگل یکم محرم تھی۔

مگر یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ کسی بھی مقام کی رویت کی شہادت قران شمس و قمر محاق سے بھی مقدم ہو تو اس کو صرف اس وجہ سے قبول کر لینا کہ شہادت ہے اور اس سے اسلامی ماہ کا تعین کر لینا بھی صحیح نہیں کیوں کہ قران شمس وقمر، محاق یہ کوئی مفروضہ یا صرف علم ہیئت کی اصطلاح نہیں، بلکہ متقدمین ومتأخرین مفسرین نے بالاتفاق اکثر نے ''یستتر لیلتین او لیلة'' سے اور بعض نے صراحۃً لفظ ''محاق'' سے اس کو تعبیر کیا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھئے: بحر المحیط، روح المعانی، خازن، احکام القران للقرطبی، صاوی، جمل، مواھب الرحمن تفسیر.

نوٹ: مولانا شبیر احمد عثمانی قدس سرہ اور مذکورہ سارے مفسرین متفقہ طور پر آیت کریمہ ﴿والقمر قدرناہ منازل﴾ کی تفسیر میں تحریر فرماتے ہیں کہ چاند کی ۲۸ منزلیں ہیں، اور اخیر ماہ میں وہ ایک یا دو راتیں مستور ہوتا ہے یہی قران شمس وقمر،

محاق اور نیو مون ہے۔

سعودی عرب کے شاہدوں کا قران شمس وقمر، محاق کے وقت یا اس سے بھی پہلے چاند کی بصری رویت کی شہادت دینا یہ صرف علم ہیئت کے خلاف نہیں، بلکہ مذکورہ سارے مفسرین کی متفقہ تفسیر کے خلاف ہے، علامہ اندلسی آلوسی رحمۃ اللہ علیہ سے علامہ عثمانی رحمۃ اللہ علیہ تک سارے مفسرین مذکورہ آیت کریمہ کی تفسیر میں غلطی کرتے رہے، اور اب اس دور میں شاہدین رویت سعودی عرب نے اس غلطی کو فاش کیا، کہ نہیں چاند ماہ کی آخری راتوں میں مستور نہیں ہوتا ہمیں نظر آتا ہے۔ یا للعجب

میری ناقص رائے میں اصل الجھن علماء ومفتی حضرات کو یہ ہو رہی ہے کہ حساب کی وجہ سے شاہدین کی شہادت کو کیسے رد کریں؟ حساب فلکی کی وجہ سے شہادت کو رد نہیں کرنا؛ بلکہ فقہاء کے نزدیک قضائے قاضی میں یہ بات مسلم ہے، کہ شاہدوں کی شہادت میں ریب وشک ہونے کی صورت میں (چاہے وہ شک گواہوں کی ذات میں ہو یا شہادت کے محل وقوع میں) اس شہادت کو رد کر دیا جائے گا، اسی لیے شہادت میں گواہوں کا عادل ہونا شرط قرار دیا گیا، اور فاسقِ بین اور محدود بالقذف کی گواہی رد کر دی جائے گی۔

اسی طرح شاہدوں کا محال عادی کے خلاف گواہی دینا یہ بھی ریب وشک ہے اس وجہ سے وہ شہادت قابل قبول ہو کر اس پر حکم کو متفرع کرنے کے بجائے اس کو رد کر دینا چاہیے، کیوں کہ شریعت مطہرہ کا مدار محالات پر نہیں ہو سکتا؛ لہذا قران شمس و قمر کے وقت یا اس سے پہلے چاند کی رویت بصری کی شہادت حساب فلکی کی وجہ سے رد نہیں کی جاتی، بلکہ شہادت میں ریب وشک ہونے کی وجہ سے رد کی جاتی ہے۔

چناں چہ شیخ محمد بخیت حنفی مصری اپنی کتاب "ارشاد اهل الملة الی اثبات الاهلة" میں ص ۲۸۴ پر تحریر فرماتے ہیں:

"ان یری مع عدم الامکان وذلك مستحیل، وانما المراد ان یخبر مخبر برؤیته مع عدم امکانه والاخبار یحتمل الصدق والکذب، والکذب یحتمل العمد والغلط، ولکل منهما اسباب لا تنحصر فلیس من الرشد قبول الخبر المحتمل لذلك اوالشهادة به مع عدم الامکان لان الشرع لا یأتی بالمستحیلات"

آگے لکھتے ہیں:

لان دلالة الحساب القطعی اوالقریب من القطعی علی عدم الامکان اقوی من الریبة، والریبة موجبة لرد الشهادة فاعتقادنا عدم الامکان لذلك او اقوی.

آپ کے جواب سے یہ بات نتیجہ کے طور پر ثابت ہوتی ہے کہ چاند کی مؤخر رویت کا اعتبار نہیں، بلکہ اسبق ومقدم رویت کی خبر آنے پر مہینہ ۲۸ یا ۳۱ کا نہ ہوتا ہو، تو اس پر عمل کرنا چاہیے، اور مفتی اسماعیل بھڑکودروی مفتی کنتھاریہ دارالعلوم کے فتوی کے مطابق چاند کی اسبق اور مقدم رویت پر عمل کرنا واجب ہے۔

لہٰذا بالفرض والتقدیر اگر برطانیہ میں مقامی رویت ہوتی ہو تب بھی مسلک مذکورہ پر عمل کرتے ہوئے دوسرے مقام بعید سے اصول شریعت کے مطابق ثابت ہونے والی مقدم رویت کا ثبوت معتبر اپنے یہاں فراہم ہوجانے پر مقامی رویت سے قبل ہی عمل کرنا جائز اور درست ہے بلکہ بقول متقدمین واجب ہے۔ (فتویٰ مفتی اسماعیل)

آپ حضرات کے دونوں مذکورہ فتووں کی روشنی میں ۱۴۰۷ھ کے رمضان

وعید کا تجزیہ درج ذیل ہے: ’’دہلی اور سعودی عرب میں رمضان کی ابتداء شاہدوں کی شہادت سے ۲۸/ اپریل ۱۹۸۷ء بروز منگل ہوئی اور اسی کے مطابق ۳۰ روزے مکمل کر کے ۲۸/ مئی ۱۹۸۷ء بروز جمعرات منائی گئی، اسی طرح عید الاضحیٰ سعودی عرب میں ۴/ اگست ۱۹۸۷ء بروز منگل تھی، گجرات اور ہندوستان کے معظم علاقوں میں رمضان کی ابتداء ۳۰/ اپریل ۱۹۸۷ء بروز جمعرات سے ہوئی اور عید الفطر ۲۹ مئی ۱۹۸۷ء بروز جمعہ منائی گئی، اور عید الاضحیٰ ۶/ اگست ۱۹۸۷ء بروز جمعرات منائی گئی‘‘۔

آپ حضرات کے قول کے مطابق تو ہندوستان اور بالخصوص گجرات میں رمضان وعیدین ۱۴۰۷ھ صحیح وقت پر نہیں ہوئی، بلکہ وقت سے مؤخر ہوئی کیوں کہ چاند کی اسبق رویت کا اعتبار کرتے ہوئے اس پر عمل کرنا واجب یا جائز تھا۔ سعودی عرب کی دور کی خبر نہ سہی (اگرچہ بقول آپ کے اختلاف مطالع کا قطعاً اعتبار نہیں، سے نظر انداز) دہلی کی خبر پر بھی عمل نہیں کیا گیا اور ترک واجب کے مرتکب ہوئے۔

چوں کہ ساری دنیا میں سب سے اول اور مقدم سعودی عرب میں چاند کی رویت کا اعلان ہوتا ہے، تو بقول آپ کے عالم اسلام میں اپنی مقامی رویت کا مسئلہ ختم ہو جاتا ہے، کیوں کہ چاند کی رویت کی اسبق خبر سعودی عرب سے ملنے پر اس پر عمل کرنا واجب ہے، باقی رہا چاند کی رویت کا طریق موجب سے پہنچنا تو یہ بات اس دور میں کوئی دشوار نہیں، سعودی ریڈیو، ٹی۔ وی کی نشریات کے علاوہ معتمد لوگوں کے متعدد فون رمضان وعیدین کے موقعے پر موصول ہوتے رہتے ہیں، اور عید الاضحیٰ کی سعودی کی خبر تو تواتر کے درجہ میں پورے عالم اسلام میں عید الاضحیٰ سے کئی دن پہلے پہنچنے سے شاید کسی کو انکار ہو؛ بلکہ اب تو ہندو پاک بالخصوص گجرات میں سعودی سے

آنے جانے والوں کا تانتا بندھا رہتا ہے جو آپ حضرات پر بھی مخفی نہیں۔

وجہ اشکال کسوف شمس:

تو اس بارے میں معروض ہے کہ یہ مسئلہ تو خالص علم ہیئت وفلک اور حساب کا ہے، ظاہر ہے اس میں اہل فن کی بات زیادہ وزنی ہوگی مولانا موسیٰ روحانی بازی مدرس حدیث جامعہ اشرفیہ لاہور نے اپنی معروف کتاب ''فلکیات جدیدہ'' میں نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ۲۳ سالہ عہدِ نبوت کے کسوف شمس کی تعداد اور تاریخوں پر مشتمل ایک جدول تیار کی ہے، جس میں یہ بتایا ہے کہ کسوف ہمیشہ اسلامی ماہ کی اخیری تاریخوں میں ہوا ہے۔ (۲۲۱،۲۲۲)

حضرت ابراہیم کی وفات کی تاریخ کے بارے میں اور کسوف کی تاریخ کے بارے میں (عہد نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) روایات بہت ہی مختلف ومضطرب ہیں، جیسا کہ حضرت شیخ الحدیث قدس سرہ نے ''اوجز'' میں اس کی ابتداء ہی اس کلمہ سے کی ہے:

الخامس فی تاریخ الکسوف فی زمانه ﷺ واختلف اهل السیر جدًا.

حضرت ابراہیم کی وفات کے بارے میں ۴ مختلف ماہ مروی ہیں، تاریخ بھی ۳، ۴ مختلف، حتی کے سال بھی دو تین مختلف مروی ہیں۔

آپ بھی اس بات سے اتفاق کریں گے کہ اس زمانہ میں تاریخ وماہ کی تعیین کا ایسا رواج نہیں تھا جیسا کے بعد میں ہوا؛ اس لیے اس میں اقوال کا مختلف ہوجانا اہل نقول کے حافظہ کی بنیاد پر قدرتی بات ہے۔

ان کان صوابا فمن الله وان کان غیر ذلك فمنی واستغفرالله والله أعلم وعلمه اتم واحکم

احقر: یعقوب اسماعیل قاسمی غفرلہ، ۱۴۰۸ھ مطابق ۱۹۸۷ء بروز بدھ

اشکالات کے جوابات

محترم ومکرم مولانا یعقوب صاحب مدت فیوضکم

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

عنایت نامہ نے ممنون کیا، آپ نے جو توجہ فرمائی اس پر ممنون ومسرور ہوں، چوں کہ افہام وتفہیم مقصود ہے؛ اس لیے جن امور کی طرف آپ نے توجہ دلائی ہے ان کے سلسلہ میں میرا خیال بھی عرض کرتا ہوں، امید کہ آپ بھی اس کی طرف توجہ فرمائیں گے۔

(الف) آپ نے احقر کے تمہیدی مضمون کا جو خلاصہ تحریر فرمایا ہے اس میں اہم جز چھوڑ دیا ہے؛ اس لیے آپ کے پیش فرمودہ خلاصہ میں کچھ اضافہ کی اجازت چاہتا ہوں۔ (آپ نے جو خلاصہ پیش فرمایا ہے وہ یہ ہے) ''اثباتِ شہورِ اسلامی میں اعتبار رویت ہلال کا ہے نہ کہ فلکی حساب کا'' (اس پر اتنا اضافہ فرمالیں) ''اور ثبوت رویت میں اعتبار شہادت کا ہے، اور شہادت کے ردو قبول کا معیار فلکی حساب نہیں بلکہ شریعت کا مقرر کردہ اصول ہے''۔

جس طرح محض فلکی حساب کے امکان رویت بتلادینے سے کام نہیں چلتا، اسی طرح اس کے عدم امکان کے دعوی کی بنیاد پر شہادت رد نہیں کی جاسکتی، جب تک کہ ردشہادت کے لیے کوئی وجہ شرعی نہ ہو، فلکی حساب کا رویت ہلال پر مثبت ومنفی کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا۔ جس طرح فلکی حساب کے مثبت طور پر معتبر ومؤثر نہ ہونے کو آپ تسلیم کرتے ہیں، اسی طرح منفی طور پر بھی وہ مؤثر ومعتبر نہیں، ''لا عبرة بقول المؤقتين

فی الصوم'' کا یہی مطلب فقہاء کرام نے لیا ہے۔ اور اپنے تمہیدی مضمون میں اسی کو میں نے ثابت کیا ہے۔

آپ کو بڑی الجھن جو پیش آرہی ہے اس کی وجہ یہ ہے: کہ آپ کتب تفسیر میں ''منازل قمر'' کی تفصیل کے ذیل میں ''قران شمس وقمر اور محاق'' کا تذکرہ دیکھ کر یہ سمجھ رہے ہیں کہ جب یہ حضرات مفسرینِ عظام اس کو اپنی تفسیر میں لکھ رہے ہیں تو یہ شرعا ایسا معتبر ہے کہ احکام شرعیہ کے باب میں مؤثر ہے۔ آپ کی غلط فہمی کی بنیاد یہیں سے پڑی، میں نے اپنا سابق جواب لکھنے سے پہلے روح المعانی، ابن کثیر، تفسیر کبیر، تفسیر قرطبی، تفسیر جواھر طنطاوی کا مطالعہ ان تمام مقامات کا کیا تھا لیکن مجھے اس کے دیکھنے کے بعد بھی کوئی اشکال نہیں ہوا۔ اس کی دو وجوہ ہیں:

① پہلی یہ کہ جہاں حضرات مفسرین علم ہیئت کے حوالہ سے منازل قمر کی تشریح کرتے ہیں، وہاں یہ بات واضح کر دیتے ہیں کہ قرآن میں جو لفظ منازل آیا ہے اس کی مراد قطعی طور پر یہ نہیں بلکہ قرآن کے نزدیک تو منازل کا مطلب صرف وہ فاصلے ہیں، جو چاند یومیہ طے کرتا ہے۔ چوں کہ ہیئت والے بھی اس سے بحث کرتے ہیں اور ان کے یہاں اس کے مخصوص نام اور مقدار ہے؛ اس لیے مناسبت مقام کے پیش نظر اس کا بھی تذکرہ کر دیتے ہیں، چناں چہ حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ سورۂ یونس کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ: وقدرہ منازل لتعلموا عدد السنین والحساب. (اور مقرر کیں اس کے لیے منزلیں) یعنی روزانہ بتدریج گھٹتا بڑھتا ہے ﴿والقمر قدرناہ منازل حتی عاد کالعرجون القدیم﴾ علمائے ہیئت نے اس کے دورہ کی تقسیم کر کے اٹھائیس منزلیں مقرر کی ہیں، جو بارہ بروج پر منقسم ہیں،

قرآن میں خاص ان کی مصطلحات مراد نہیں، مطلق سیر و مسافت کے مدارج مراد ہیں۔ (فوائد شبیریہ سورۂ یونس)

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: قرآن کریم ان اصطلاحی ناموں سے بالاتر ہے، اس کی مراد صرف وہ فاصلے ہیں جن کو چاند خاص خاص دنوں میں طے کرتا ہے۔ (معارف القران ۷/ ۳۹۳)

علامہ سید محمود آلوسی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: المنازل جمع منزل، والمراد به: المسافة التي يقطعها القمر في يوم و ليلة(روح المعانی ۲۳/۱۶)

آگے اصطلاح ہیئت کو بیان کرتے ہوئے ان کے اختلاف کو بھی ذکر کرتے ہیں:

وهي عند اهل الهند سبعة و عشرون؛ لأن القمر يقطع فلك البروج في سبعة وعشرين يوما وثلث،فحذفوا الثلث لأنه ناقص عن النصف كما هو مصطلح اهل التنجيم، وعند العرب، وساكني البدو ثمانية و عشرون الخ. (حوالہ بالا)

جب یہ بات واضح ہو چکی کہ مراد قرآنی ان اصطلاحات سے بالاتر ہے، تو اب حضرات مفسرین عظام کے محض ان باتوں کو اپنی تفاسیر میں ذکر کر دینے سے آپ یہ استدلال فرما رہے ہیں کہ علامہ اندلسی آلوسی سے علامہ عثمانی تک سارے مفسرین مذکورہ آیت کریمہ کی تفسیر میں غلطی کرتے رہے اور اب اس دور میں شاہدین رویت سعودی عرب نے اس غلطی کو فاش کیا الخ۔ اس کی گنجائش نہیں۔

(۲) دوسری وجہ جو پہلی سے بھی زیادہ اہم ہے، وہ یہ کہ شریعت مطہرہ نے تمام علوم میں اعتبار و اعتماد کی جو درجہ بندی فرمائی ہے اس کو توڑنے کی شریعت اجازت نہیں

دیتی اور نہ ہی اس کی خلاف ورزی سے شرعی مقصود حاصل ہوسکتا ہے۔ احکام شرعیہ کے اثبات وعدم اثبات کے لیے دلائل شرعیہ کی ضرورت ہے جو صرف چار ہیں یعنی قرآن وسنت اور اجماعِ امت وقیاس، ان کے بغیر کسی حکم کو ثابت نہیں کیا جاسکتا، فن ہیئت کے مسلمات کو یہ مقام حاصل نہیں کہ ان کی وجہ سے دلائل شرع سے ثابت شدہ مسائل کو چھوڑا جائے یا اس میں شک وشبہ کی گنجائش نکالی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ فقہائے کرام نے باوجود یہ کہ ان میں سے بہت سے حضرات فن ہیئت کے ماہر بھی تھے، رویت ہلال کے ثبوت وعدم میں ہیئت کا اعتبار نہیں کیا۔ شریعت مطہرہ کی قائم فرمودہ اس درجہ بندی کے سلسلہ میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا کلام پیش کرتا ہوں، جس سے انشاء اللہ آپ کے اشکالات بھی دور ہونگے؛ اگرچہ مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہ کلام فن تاریخ کی مناسبت سے ارشاد فرمایا ہے لیکن اصولی شان کا حامل ہونے کی وجہ سے فن ہیئت اور دیگر فنون پر بھی منطبق ہوتا ہے:

''اسلام میں اعتبار واعتماد کا جو مقام قرآن کریم اور احادیث متواترہ کا ہے وہ عام احادیث کا نہیں، جو حدیث رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا درجہ ہے وہ اقوال صحابہ رضی اللہ عنہم کا نہیں، اسی طرح تاریخی روایات کے اعتماد واعتبار کا بھی وہ درجہ نہیں ہے جو قرآن وسنت یا سند صحیح سے ثابت شدہ اقوال صحابہ رضی اللہ عنہم کا ہے؛ بلکہ جس طرح نص قرآنی کے مقابلے میں اگر کسی غیر متواتر حدیث سے اس کے خلاف کچھ مفہوم ہوتا ہو تو اس کی تاویل واجب ہے یا تاویل سمجھ میں نہ آئے تو نص قرآنی کے مقابلے میں اس حدیث کا ترک واجب ہے، اسی طرح تاریخی روایات اگر کسی معاملہ میں قرآن وسنت سے ثابت شدہ کسی چیز سے متصادم ہوں تو وہ بمقابلہ قرآن وسنت کے متروک یا واجب التاویل

قرار دی جائیں گی، خواہ وہ تاریخی اعتبار سے کتنی ہی معتبر و مستند روایات ہوں، اعتبار واعتماد کی درجہ بندی کسی فن کی عظمت واہمیت کو گھٹاتی نہیں؛ البتہ شریعت اور اس کے احکام کی عظمت کو بڑھاتی ہے کہ ان کے ثبوت کے لیے اعتماد واعتبار کا نہایت اعلی درجہ لازم قرار دیا گیا ہے''۔ (مقام صحابہ ص ۱۵)

مگر فن تاریخ کے اتنے فوائد وفضائل اور اس کی اتنی بڑی اہمیت کے باوجود اس فن کو یہ مقام کسی نے نہیں دیا کہ شریعت اسلام کے عقائد واحکام اس فن سے حاصل کیے جائیں، حلال وحرام کے مباحث میں تاریخی روایات کو حجت قرار دیا جائے، جن مسائل کے ثبوت کے لیے قرآن وسنت اور اجماع وقیاس کے شرعی دلائل کی ضرورت ہے ان میں تاریخی روایات کو مؤثر مانا جائے یا تاریخی روایات کی بناء پر قرآن وسنت یا اجماع سے ثابت شدہ مسائل میں کسی شک وشبہ کو راہ دی جائے۔ (ایضاص ۲۳/ ۲۴)

یہی وجہ ہے کہ ائمہ حدیث جن کی کتابیں حدیث میں اصول معتمد علیہ کا درجہ رکھتی ہیں، ان میں وہ جن راویوں کو ضعیف قرار دے کر ان کی روایت چھوڑ دیتے ہیں، جب وہ تاریخ کے میدان میں آتے ہیں تو ان ضعیف راویوں کی روایات بھی شاملِ کتاب کر لیتے ہیں، واقدی اور سیف ابن عمر وغیرہ کو ائمہ حدیث نے حدیث کے معاملہ میں ضعیف بلکہ اس سے بھی زیادہ مجروح کہا ہے؛ مگر تاریخی معاملات مغازی وسیر میں وہی ائمہ حدیث ان کی روایت نقل کرنے میں کوئی رکاوٹ محسوس نہیں کرتے۔ (ایضا۲۹)

خلاصہ یہ ہے کہ عام دنیا کی تاریخ اور اس میں مدون کی ہوئی کتابیں فن حدیث و فقہ یا عقائد کی طرح شریعت اسلام کے عقائد واحکام سے بحث کرنے والا کوئی فن نہیں ہے جس کے لیے روایات کی تنقیح وتنقید کی سخت ضرورت ہو، اور کھرے کھوٹے

کو ممتاز کیے بغیر مقصد حاصل نہ ہو؛ اس لیے فن تاریخ میں ہر طرح کی قوی وضعیف اور صحیح وسقیم روایتیں بغیر نقد وتبصرہ کے جمع کر دینے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھا گیا، علوم قرآن وسنت کے ماہر وہی علماء جو تنقید وتحقیق اور جرح وتعدیل کے امام مانے گئے ہیں، جب فن تاریخ پر کوئی تصنیف لکھتے ہیں تو اگرچہ زمانہ جاہلیت کی تاریخوں کی طرح بے سروپا افواہوں اور افسانوں کو اپنی کتاب میں جگہ نہیں دیتے، بلکہ اصول روایت کا لحاظ رکھتے ہوئے سند کے ساتھ روایت نقل کرتے ہیں، اسی لیے اسلامی تاریخیں تاریخی حیثیت میں عام دنیا کی تاریخوں سے صدق واعتماد کے اعتبار سے ایک ممتاز مقام رکھتی ہیں، لیکن تاریخ میں وہ راویوں کے حالات کی چھان بین اور اس جرح وتعدیل سے کام نہیں لیتے، جو فن حدیث وغیرہ میں استعمال کی جاتی ہے۔ (ایضا ۲۹/ ۳۰)

ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ جو حدیث وتفسیر کے مشہور امام اور بڑے ناقد معروف ہیں، روایات میں تنقید وتحقیق ان کا خاص امتیازی وصف ہے؛ مگر جب یہی بزرگ تاریخ پر کتاب البدایۃ والنہایۃ لکھتے ہیں تو تنقید کا وہ درجہ باقی نہیں رہتا، خود البدایۃ والنہایۃ ۸/ ۲۰۲ میں بعض تاریخی روایات درج کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ اس کی صحت میرے نزدیک مشتبہ ہے؛ مگر مجھ سے پہلے ابن جریر وغیرہ یہ روایت نقل کرتے آئے ہیں؛ اس لیے میں نے بھی نقل کر دیا، اگر وہ ذکر نہ کرتے تو میں ان کو اپنی کتاب میں نہ لاتا۔ ظاہر ہے کہ کسی حدیث کی تحقیق میں وہ ہرگز نہیں کہہ سکتے کہ اس کی صحت مشتبہ ہونے کے باوجود چوں کہ پہلے کسی بزرگ نے لکھا ہے؛ اس لیے لکھتا ہوں، یہ تاریخ ہی کا اپنا مقام تھا کہ اس میں ابن کثیر نے اس توسع کو جائز قرار دیا۔ (ایضا ۳۱)

اور یہ کسی خاص شخص کی اتفاقی غلطی نہیں، بلکہ تمام ائمۂ فن کی سوچی سمجھی روش تاریخ

میں یہی ہے کہ فن تاریخ میں ضعیف وسقیم روایات کو بلا تنقید ذکر کر دینا کوئی عیب نہیں، کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ ان روایات سے دین کے عقائد یا احکام شرعیہ کو ثابت کرنا نہیں، عبرت ونصیحت اور تجارب اقوام وغیرہ کے فوائد حاصل کرنا ہیں، وہ یوں بھی ہو سکتے ہیں، اور اگر کوئی شخص ان تاریخی روایات سے کسی ایسے مسئلہ پر استدلال کرنا چاہتا ہے جس کا تعلق اسلامی عقائد یا احکام عملیہ سے ہے، تو اس کی اپنی ذمہ داری ہے کہ روایات کی تنقید اور راویوں پر جرح وتعدیل کا وہی ضابطہ اختیار کرے جو حدیث کی روایات میں لازم وضروری ہے، اس کے بغیر اس کا استدلال جائز نہیں، اور یہ کہنا کہ کسی بڑے ثقہ اور امام حدیث کی کتاب تاریخ میں یہ روایت درج ہے اس کو اس ذمہ داری سے سبکدوش نہیں کرتا۔ اس بات کو اس مثال سے سمجھئے کہ ائمۂ مجتہدین اور فقہائے امت میں بہت سے ایسے حضرات بھی ہیں، جو فن طب کے بھی ماہر ہیں، جیسے: امام شافعی وغیرہ، اور بعض حضرات کی تصانیف بھی فن طب میں موجود ہیں، یہ حضرات اگر کسی طب کی کتاب میں اشیاء کے خواص وآثار بیان کرتے ہوئے یہ لکھیں: کہ شراب میں فلاں فلاں خواص وآثار ہوتے ہیں، خنزیر کے گوشت پوست اور بال کے فلاں فلاں خواص وآثار ہیں، پھر کوئی آدمی طب کی کتاب میں ان کے کلام کو دیکھ کر ان چیزوں کو جائز قرار دینے لگے، اور استدلال میں یہ کہے کہ فلاں امام یا عالم نے اپنی کتاب میں لکھا ہے، اور وہاں اس کے حرام ہونے کا ذکر نہیں کیا تو اس کا یہ استدلال درست ہوگا؟ اور یہ کوئی فرضی مثال بھی نہیں، شیخ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ امت کے کیسے بڑے عالم ہیں، علوم شرعیہ میں شاید کوئی فن نہیں چھوٹا جس پر ان کی تصانیف نہ ہوں، ان کی بزرگی اور تقدس میں کسی کو کلام نہیں؛ مگر موضوع طب پر ان کی تصنیف "کتاب

الرحمة فی الطب والحکمة" دیکھ لیجئے اس میں متعدد امراض کے علاج اور منافع کی تحصیل کے لیے جو نسخے لکھے ہیں، ان میں بہت سی حرام چیزیں بھی شامل ہیں، اب اگر کوئی شخص اس کتاب کے حوالہ سے ان کو جائز ثابت کرنے لگے اور سیوطی کی طرف اس کو منسوب کرے تو کیا کوئی صحیح الحواس آدمی اس کو درست باور کر سکتا ہے؟ اسی طرح اور بہت سے علماء فقہاء جن کی تصانیف فن طب وغیرہ میں ہیں، سب میں حرام چیزوں کے خواص وآثار اور طریق استعمال ذکر کیا جاتا ہے، خون اور انسانی بول وبراز اور شراب وخنزیر سبھی چیزوں کے خواص لکھے جاتے ہیں اور اس جگہ وہ اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتے کہ ان کا حرام یا نجس ہونا بھی اس جگہ لکھ دیں، کیوں کہ یہ موضوع طب سے خارج ہے اور دوسری کتب میں بیان ہو چکا ہے، ان کی کتب طب سے کوئی آدمی حرام چیزوں کو ان کا نام لے کر حلال کرنے لگے تو اس میں قصور ان کا یا علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کا نہیں کہ انھوں نے فن طب کی کتاب میں حرام اشیاء کے خواص کیوں لکھے؟ کیوں کہ اس فن کا مقتضا اور موضوع ہی یہ ہے کہ سب چیزوں کے خواص وآثار لکھے جاویں، حلال وحرام ہونے کی بحث کا یہ موقع نہیں، اور جہاں اس کا موقع ہے وہ ان کے حرام ہونے کو لکھ چکے ہیں، قصور اس عقلمند کا ہے جو اس حقیقت کو نظر انداز کر کے طبی کتاب سے حلال وحرام کے مسائل نکالنے لگے۔ (ایضا ۴۳ تا ۴۴)

امید کہ اب آپ کا یہ اشکال کہ تمام مفسرین نے قران شمس وقمر اور محاق کا تذکرہ کیا ہے اور ﴿قدره منازل﴾ کی تفسیر میں تمام اس کو لکھتے چلے آئے ہیں تو یہ کیسے غلط ہو گیا؟ حل ہو گیا ہوگا۔ ان حضرات مفسرین کے اس کو لکھنے کی حیثیت وجہ اول میں بتلا چکا ہوں، پھر بھی ان کے اس کو لکھنے سے یہ ہرگز لازم نہیں آتا کہ ان بیانات کی بنیاد پر

شریعت کے اصول شہادت میں ترمیم کی جائے، اسی لیے فقہائے کرام نے بھی باوجود ان اصطلاحات ومسلمات ہیئت سے واقفیت کے ان کی وجہ سے شہادت کو قابل رد نہیں قرار دیا؛ اس لیے کہ یہ میدان احکام شرعیہ کا میدان ہے، اس کا مقتضی یہ ہے کہ وہاں دلائل شرعی سے جو بات ثابت ہوتی ہو اسی کو اختیار کیا جائے۔ میں نے اپنے سابق جواب کی تمہید میں علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ کی جو عبارت نقل کی تھی اس میں صراحۃً یہ مذکور ہے کہ ۲۹ کی صبح کو افق مشرق میں طلوع شمس سے پہلے چاند نظر آیا اور پھر اسی شام کو (یعنی ۳۰ کی شب میں) افق مغرب پر غروب شمس کے بعد چاند نظر آنے کی شہادت میسر آنے پر شہادت پر ہی عمل ہوگا، (بلکہ علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ کا اس موضوع پر مستقل رسالہ ہے) آپ بتلائیے کہ اس صورت میں محاق کہاں گیا؟ حالاں کہ شہادت مان لینے کا مطلب یہ ہوا کہ فقہاء نے ہیئت کے محاق والے اصول پر عمل نہیں کیا، اور اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ یہ بات ریب وشک فی الشہادۃ میں داخل نہیں؛ اس لیے کہ اگر یہ چیز موجب ریب ہوتی تو فقہائے کرام اس شہادت کو کسی صورت میں معتبر نہ مانتے۔ اس سے آپ کا وہ نقطۂ نظر جو آپ نے حضرات مفتیان کرام کی الجھن دور کرنے کے لیے اپنے عنایت نامہ میں ظاہر فرمایا ہے اس کی صاف تردید ہوتی ہے۔

الحاصل آپ نے فلکی حساب کے عدم امکان رویت کے دعوی کی بنیاد پر شہادت رد کرنے کا جو موقف اختیار فرمایا ہے وہ درست نہیں، آپ کے ہاں برطانیہ میں عید الفطر کے چاند کا جو واقعہ پیش آیا اس نے بھی تو آپ کے موقف کی تغلیط کر دی، میرے سابق جواب میں یہی بات میں نے ثابت کی ہے کہ محض فلکی حساب کے یہ بتلا دینے سے کہ رویت ممکن نہیں، شہادت رد نہیں کی جاسکتی، رد شہادت کے لیے اصول شرع ہی سے

کام لینا ہوگا، فقہائے کرام بھی اسی بات کو صراحۃً کہتے ہیں: المعمول به فی المسائل الثلاث ما شهدت به البينة لأن الشهادة نزلها الشارع منزلة اليقين. (شامی ۲/ ۱۰۰)

اب مجھے کیا حق پہنچتا ہے کہ میں فقہائے کرام کی اس تصریح کے خلاف فتویٰ دوں؟ میں تو مقلد محض ہوں، میرے لیے کسی حال میں تصریحات فقہاء کے خلاف فتویٰ دینے کی اجازت نہیں ہے۔

ایک ضروری وضاحت: میں نے اپنے سابق جواب میں جو کچھ لکھا اور اس افہام وتفہیم میں بھی جو عرض کیا اس سے میرا مقصد سعودیہ کے اعلان کی حمایت نہیں ہے؛ بلکہ نفس مسئلہ کی وضاحت اور شرعی حیثیت کا تعین ہے، رہا سعودی اعلان درست ہے یا نہیں؟ تو جب تک ان کے طریق کار کا علم نہ ہو جائے اس سے پہلے اس سلسلہ میں کچھ کہنا یا لکھنا قبل از وقت ہے، اور آپ سے بھی یہ عرض کرنے کی جسارت کرتا ہوں کہ سعودی اعلان کی تغلیط کے لیے آپ جو طریقہ اختیار فرمائے ہوئے ہیں، وہ درست نہیں، اس کے بجائے اگر آپ یہ تفصیل معلوم کریں کہ وہاں کس طریقہ سے ثبوت ہلال کا فیصلہ ہوتا ہے، شہادت کہاں سے آتی ہے، شاہدین عموماً کون ہوتے ہیں؟ اور پھر اس میں کوئی شرعی قباحت ہو تو اس کو ظاہر فرمائیں۔

(ب) آپ نے دوسرا اشکال کر کے جو تجزیہ پیش فرمایا ہے اس کی بھی وضاحت پیش خدمت ہے۔ چاند کی اسبق رویت پر عمل کو میں نے جو جائز لکھا اس کے ساتھ شرط بھی ذکر کی ہے کہ وہ بطریق موجب پہنچی ہو، حالاں کہ گجرات میں دہلی کی خبر بطریق موجب نہیں پہنچی تھی؛ نیز دیوبند میں جو عید ہوئی تھی تو یہ یاد رہے کہ وہاں ہلال شعبان

کی شہادت اواخر شعبان میں موصول ہونے پر شعبان کی تاریخ کو مؤخر کیا گیا تھا، جس کا گجرات میں بھی پتہ نہ چلا، پھر جب دیوبند میں وہاں کی ۲۹/ شعبان (جو گجرات میں ۲۸ تھی) کے حساب سے رمضان کی اطلاع ملی تو ان حضرات نے اس کو قبول کرتے ہوئے رمضان کا اعلان کیا جب کہ گجرات میں اس کی گنجائش ہی نہ تھی؛ اس لیے آپ کے تجزیہ سے ہم پر کوئی اشکال وارد نہیں ہوتا۔

(ج) کسوف شمس کے سلسلہ میں خود میں نے ''فتح الباری'' کی جو عبارت نقل کی ہے، اس میں مختلف تاریخیں مذکور ہیں، لیکن میں نے وہاں تصریح کردی ہے کہ ان تاریخوں میں سے حافظ رحمۃ اللہ علیہ نے جس تاریخ کے متعلق والاکثر انہا وقعت الخ فرما کر ترجیح دی ہے، اسی پر میں نے اپنے کلام کی بنیاد رکھی ہے؛ نیز دورِ نبوی میں واقع کسوف شمس کی جتنی بھی تاریخیں کتب شروح حدیث میں مذکور ہیں ان میں سے کوئی بھی اصول ہیئت پر صحیح نہیں ٹھہرتی، اس کا کیا علاج؟ فقط والسلام۔

العبد: احمد عفی عنہ خانپوری، ۷/ صفر المظفر ۱۴۰۸ھ

ضمیمہ:

(۱) (یوم مات ابراهیم) یعنی ابن النبی ﷺ، وذکر جمهور اهل السیر انه مات فی السنة العاشرة من الهجرة، قیل فی ربیع الاول، وقیل فی رمضان، وقیل فی ذی الحجة، والاکثر علی انها وقعت فی عاشر الشهر، وقیل فی رابع، وقیل فی رابع عشرة (فان قلت) الکسوف فی الشمس انما یکون فی الثامن والعشرین اوالتاسع والعشرین من آخر الشهر العربی فکیف تکون وفاته فی العاشر؟ (قلت): هذا التاریخ یحکی عن الواقدی وهو ذکر ذلك بغیر اسناد فقد تکلموا فیما یسنده الواقدی

فكيف فيما يرسله؟ وقال البيهقى فى باب ما يحول على جواز الاجتماع للعيد وللخسوف لجواز وقوع الخسوف فى العاشر: ثم روى عن الواقدى ما ذكرناه عن تاريخ وفاة ابراهيم وقال الذهبى فى مختصر السنن لم يقع ذلك ولن يقع، والله قادر على كل شىء لكن امتناع وقوع ذلك كامتناع رؤية الهلال ليلة الثامن والعشرين من الشهر (عمدة القارى ٦/ ٦٩)

اس میں علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ نے دس چاند والا قول واقدی کا ہونے کی وجہ سے نا قابل اعتبار ٹھہرایا ہے، لیکن خود علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ نے اہل ہیئت کی بات کی دوسرے موقع پر تردید کی ہے جیسا کہ اصل مضمون میں ''اوجز'' کی عبارت میں ان کا قول مذکور ہے، جو عمدۃ القاری ۷/ ٦٦، ٦٧ میں موجود ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ کے پیش نظر حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کی تردید مقصود ہے۔ دونوں کا کلام دیکھنے سے یہی معلوم ہوتا ہے۔

② ''فتح الملہم'' میں علامہ عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے محمود پاشا فلکی کی کتاب سے کسوف کا ۲۹/ شوال ۱۰ھ کو ہونا تحریر فرمایا ہے، لیکن یہ بھی حساب سے اخذ کردہ نتیجہ ہے۔ اہل سیر میں سے کسی کا کوئی قول نہیں۔

قال بعض الفضلاء المصريين فى تعليقه على المحلى ولقد حاولت كثيرا ان اجد من العلماء بالفلك من يظهر لنا بالحساب الدقيق عدد الكسوفات التى حصلت فى مدة اقامة النبى ﷺ بالمدينة وتكون رؤيتها بها ممكنة وطلبت ذلك من بعضهم مرارا فلم اوفق الى ذلك الا انى وجدت للمرحوم محمود باشا الفلكى جزءاً صغيرا سماه "نتائج الافهام فى تقويم العرب قبل الاسلام" ألّفه باللغة الفرنسوية، وترجمه الى العربية

الاستاذ العلامة احمد زکی باشا وطبع فی بولاق ١٣٠٥ھ وقد حقق فیه بالحساب الدقیق یوم الکسوف الذی حصل فی السنة العاشرة، وهو الیوم الذی مات فیه ابراهیم ومنه اتضح ان الشمس کسفت فی المدینة المنورة فی یوم الاثنین ٢٩/ شوال سنة ١٠، الموافق لیوم ٢٧/ینایر سنة ٦٣٢ میلادیة فی الساعة ٨ والدقیقة ٣٠ صباحا وهو یرد اکثر الاقوال التی نقلت فی تحدید یوم موت ابراهیم (فتح الملهم ٢/ ٤٥٢)

اس پر دوسرا اشکال یہ ہے کہ ماہ جنوری میں سخت سردی پڑتی ہے (اس لیے کہ جنوری میں مدینہ منورہ کا درجۂ حرارت ''٦ سی'' رہتا ہے یو۔پی کے اکثر مقامات کا درجۂ حرارت یہی ہے۔ (جزیرۃ العرب ص ٤٤) اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت میں صراحت ہے کہ یہ گہن سخت گرمی کے موسم میں واقع ہوا تھا۔

کسفت الشمس علی عهد رسول الله ﷺ فی یوم شدید الحر فصلی باصحابه فاطال القیام حتی جعلوا یخرون. (ابو داؤد ١/ ١٦٧، مسلم ١/ ٢٩٧)

(٣) ولقد بالغ الشیعة فی یوم عاشوراء، فوضعوا احادیث کثیرة کذبا فاحشا من کون الشمس کسفت یومئذ حتی بدت النجوم، وما رفع یومئذ حجر الا وجد تحته دم، وان ارجاء السماء احمرت وان الشمس کانت تطلع وشعاعها کانه الدم، وصارت السماء کانها علقة، وان الکواکب ضرب بعضها بعضا، وامطرت السماء دما احمر وان الحمرة لم تکن فی السماء قبل یومئذ، ونحو ذلك وروی ابن لهیعة عن ابی قبیل المعافری ان الشمس کسفت یومئذ حتی بدت النجوم وقت الظهر وان رأس حسین لما دخلوا به قصر الأمارة جعلت الحیطان تسیل

دما وان الارض اظلمت ثلاثة ايام ولم يمس زعفران ولا ورس لما كان معه يومئذ الا احترق من مسه ولم يرفع حجرمن حجارةبيت المقدس الا ظهر تحته دم عبيط، وان الابل التى غنموها من ابل الحسين حين طبخوها صار لحمها من العلقم الى غير ذلك من الأكاذيب والأحاديث الموضوعة التى لا يصح منها شيء. (البداية والنهاية ٨ /٢٠١)

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے موقع پر کسوف کے بارے میں علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ کی رائے مندرجہ بالا ہے، اوجز میں دیگر مواقع کا تذکرہ اجمالی ہے ورنہ اس کی باقی تحقیق کرلی جاتی۔

رویتِ ہلال میں سعودیہ کا فیصلہ مسلکِ حنفی کی نظر میں

سوال: کیا فرماتے ہیں علماءِ دین ومفتیانِ شرع متین مندرجۂ ذیل ہلال کے بارے میں؟

① سعودی عربیہ میں ہمیشہ سب سے پہلے چاند کی رویت ہوتی ہے، کبھی اس کے خلاف نہیں ہوتا۔

② پوری دنیا سے ہمیشہ ایک دن پہلے رویتِ ہلال ہوتی ہے، ہندو پاک سے اکثر دو دن اور ہمیشہ ایک دن قبل رویت کا اعلان ہوتا ہے۔

③ سعودیہ سے مغربی ملک مراکش میں باقاعدہ چاند دیکھنے کا انتظام ہے، اور اس کے لیے وزارۃ الاوقاف بھی ہے، وہاں سے بھی سعودیہ ہمیشہ ایک روز قبل رویت کا اعلان کرتا ہے اور امسال جمادی الاولیٰ میں دو روز مؤخر تھا۔

④ سعودیہ کی رویت کے بارے میں بعض حضرات کا کہنا ہے کہ وہاں چاند دیکھ کر فیصلہ نہیں کرتے، بلکہ قران شمس وقمر (نیومون) ہوتے ہی رویت مان لی جاتی ہے۔

⑤ وہاں رویت کا فیصلہ ہمیشہ شہادت پر ہوتا ہے کبھی عمومی رویت نہیں ہوتی۔

⑥ نیومون (قران شمس وقمر) کے فوراً بعد یا چار چھ گھنٹے اور کبھی تو نیومون سے پہلے سے ہی رویت ہو جاتی ہے۔ (اوقات نیومون کی فہرست سے اس کا مکمل ثبوت ہوتا ہے)۔

⑦ کئی شہادتیں موجود ہیں کہ صبح مشرق میں چاند نظر آیا اور اسی شام کو سعودیہ نے رویت کا اعلان کیا۔

⑧ سورج گہن میں لگا ہوا ہے اور اسی وقت سعودیہ نے رویت کا اعلان کر دیا، حالاں کہ یہ ناممکن ہے (ثبوت کے لیے سورج گہن اور تاریخ سعودیہ کی فوٹو کاپی پیش خدمت ہے)۔

⑨ سعودیہ کی رویت کے مطابق کبھی چودھویں، پندرھویں تاریخ کو بدر نہیں ہوتا بلکہ پندرھویں اور سولھویں کو بدر ہوتا ہے۔ (ہر مشاہدہ کرنے والے کو اس کا بخوبی علم ہے)۔

⑩ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ وہاں رویتِ ہلال کمیٹی ہے اور دیکھ کر فیصلہ کرتے ہیں تو کیا:

(الف) یہ رویت صحیح ہے؟ اور اس سے ہم برطانیہ والے رویت کی اطلاع لے سکتے ہیں؟

(ب) اطلاع لینے کا شرعی معتبر طریقہ کیا ہے؟

رمضان وشعبان بہت قریب ہے؛ اس لیے جلد جواب مرحمت فرمائیں، ہم لوگوں کی تراویح اور روزے اور عیدین کا اہم مسئلہ ہے۔

از: مولوی حسن محمد ٹنکاروی

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

جب چاند کی رویت عام نہ ہوسکے صرف دو چار آدمیوں نے دیکھا ہو تو یہ صورتِ حال اگر ایسی فضا میں ہو کہ مطلع صاف ہو، چاند دیکھنے سے کوئی بادل یا دھواں غبار وغیرہ نہ ہو، تو ایسی صورت میں صرف دو تین آدمیوں کی رویت اور شہادت شرعاً قابلِ اعتماد نہ ہوگی جب تک مسلمانوں کی بڑی جماعت اپنے دیکھنے کی شہادت نہ دے چاند کی رویت تسلیم نہ کی جائے گی، جو دیکھنے کی شہادت دے رہے ہیں اس کو ان کا مغالطہ یا جھوٹ قرار دیا جائے، ہاں اگر مطلع صاف نہیں تھا، غبار آلود تھا، دھواں، بادل وغیرہ افق پر ایسا تھا جو چاند دیکھنے میں مانع ہوسکتا ہے ایسی حالت میں رمضان کے لیے ایک ثقہ کی اور عیدین وغیرہ کے لیے دو ثقہ مسلمانوں کی شہادت کا اعتبار کیا جاسکتا ہے۔ (جواہر الفقہ ۱/ ۳۹۹، ۴۴۰)

یہ وہ طریق کار ہے جو رویتِ ہلال کے فیصلہ کے لیے احناف کے نزدیک ضروری ہے، حکومت سعودیہ میں رویتِ ہلال کا فیصلہ جس انداز سے ہو رہا ہے وہ اہلِ علم کے درمیان موضوعِ نزاع ہے، حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب مدظلہم نے اس سلسلہ میں جو رائے قائم فرمائی ہے وہ ایک موزون اور صائب رائے ہے وہ فرماتے ہیں: ’’حکومت سعودیہ میں رویتِ ہلال کا فیصلہ مسلک حنفیہ کے خلاف ہونے کے علاوہ بداہت کے بھی خلاف ہوتا ہے؛ اس لیے وہ پاکستان کے لیے حجت نہیں‘‘۔ (احسن الفتاویٰ ۴/ ۴۱۶)

جب وہ فیصلہ مسلکِ حنفی کے خلاف ہونے کی وجہ سے پاکستان کے لیے حجت نہیں تو برطانیہ میں مقیم احناف کے لیے کیسے حجت ہوگا؟

② برطانیہ کے حالات کے پیش نظر اہلِ برطانیہ کے لیے جو طریق کار مفتیٔ گجرات حضرت مولانا مفتی سید عبدالرحیم صاحب مدظلہم نے تحریر فرمایا ہے وہ یہ ہے: ''اپنے نزدیک کے ممالک جہاں پر طلوع وغیرہ میں زیادہ تفاوت نہ ہو اور انتیسویں کا چاند نظر آتا ہو، ایسے ملک سے رابطہ اور تعلق رکھنا چاہیے اور یہ زیادہ مناسب ہے، اور اس کی صورت یہ ہو کہ ہلالِ رمضان کے بارے میں وہاں کے تین چار دین دار اور معتمد آدمیوں کے فون کی خبر پر جب تم ان کی آواز اچھی طرح پہچان سکو اور تمھیں چاند نظر آنے کا یقین پیدا ہو جائے تو رمضان کا فیصلہ کر دو؛ لیکن ہلالِ عید کے لیے شہادت شرط ہے، اس کے لیے ایسا انتظام کیا جائے کہ وہاں کے دو دین دار معتمد آدمی خود چاند دیکھ کر بذریعۂ طیارہ (ہوائی جہاز) آکر شہادت دیں، یا یہاں سے دو دین دار معتمد آدمی جا کر خود چاند دیکھنے والوں کی گواہی لیں یا وہاں کے مفتی، قاضی، خطیب یا ہلال کمیٹی کے صدر معتمد علیہ کا سندی فرمان لے آئیں جس کو یہاں کے معتمد علماء قبول کر لیں تو اس پر عمل کر سکتے ہیں۔ (فتاویٰ رحیمیہ ۳/۷۷،۷۸)

اس سلسلہ میں مزید تفصیلات مطلوب ہوں تو فتاویٰ رحیمیہ ۵/ ۱۸۲ تا ۱۸۶، جواہر الفقہ ۱/ ۴۰۰ تا ۴۰۲ کا مطالعہ فرمائیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری عفی عنہ، ۱۹/ جمادی الاخری ۱۴۱۲ھ

الجواب صحیح: عباس داود بسم اللہ

ٹنکاریہ میں چاند دکھائی دینے پر راندیر چاند کمیٹی کا فیصلہ

ضلع بھروچ کے گاؤں موٹا ٹنکاریہ میں (۱) جناب ماسٹر ابراہیم اسماعیل بھوتا صاحب (۲) جناب احمد اسماعیل مؤذن صاحب (۳) جناب عبداللہ موسی احمد صاحب نے ۲۹ ویں ذی القعدہ ۱۴۰۶ھ بدھ کی شام کو مغرب کی نماز کے بعد اپنے چاند دیکھنے کی شہادت دارالعلوم کنتھاریہ کے مفتی صاحب وغیرہ کے سامنے دی، یہ اطلاع ہمیں بذریعہ اشتہار موصول ہوئی تو راندیر سے جناب موسی ماسٹر صاحب، حافظ سید مرغوب، حاجی نذیر ابراہیم قریشی مذکورہ گواہوں کو لینے کے لیے گئے یہ حضرات پہلے دارالعلوم کنتھاریہ پہنچے اور مذکورہ تینوں گواہوں کے معتبر ہونے اور شہادت دینے کی تحقیق وتصدیق حاصل کر کے موٹا ٹنکاریہ گئے اور وہاں سے دو گواہوں (۱) احمد اسماعیل مؤذن صاحب (۲) عبداللہ موسی احمد صاحب کو لے کر راندیر پہنچے (تیسرے گواہ جناب ماسٹر ابراہیم بھوتا صاحب ان کے ہمراہ نہ آسکے وہ دوسرے دن راندیر تشریف لائے) ان دونوں حضرات نے مجلس شہادت کے حاضرین کے روبرو خدا کو حاضر وناظر رکھ کر قسمیہ شہادت دی کہ ہم نے ۲۹/ ویں ذی قعدہ ۱۴۰۶ھ بدھ کی شام کو مغرب کی نماز کے بعد یکم ذی الحجہ کا چاند دیکھا ہے اور اس پر ہم کو پورا وثوق واطمینان ہے، جناب ماسٹر ابراہیم اسماعیل بھوتا صاحب دوسرے دن راندیر تشریف لائے اور انھوں نے بھی ہمارے سامنے قسمیہ شہادت دی، دارالعلوم کنتھاریہ کے علماء کا مذکورہ گواہوں پر اعتماد اور شہادت کی تصدیق نیز ہمارے سامنے قسمیہ شہادت دینے کی بناء پر ہمیں اطمینان حاصل ہوا جس کی بنیاد پر ہم نے بروز جمعرات ۷/ اگست ۱۹۸۶ء کو یکم ذی الحجہ ہونے

کا اور ۱۶ / اگست ۱۹۸۶ء بروز سنیچر کو عید الاضحیٰ (بقر عید) ہونے کا فیصلہ کیا ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔ وصلّی اللہ علی خیر خلقه محمد وآله واصحابه اجمعین.

حاضرین مجلس شہادت کی دستخط:

① سید عبد الرحیم لاجپوری غفرلہ ② محمد رضا اجمیری
③ عبد الغنی کاوی ④ اسماعیل واڈی والا
⑤ سید ابراہیم حاجی میروفائی ⑥ ایم۔ اے۔ صالح بھائی
⑦ عارف حسن

دار الافتاء جامعہ ڈابھیل کی تائید:

تاریخ ۶ / ۸ / ۱۹۸۶ء بدھ کو مغرب کی نماز کے بعد ماہ ذی الحجہ کا چاند دیکھنے کی معتبر گواہی کے موصول ہونے کی بنیاد پر راندیر چاند کمیٹی نے عید الاضحیٰ (بقر عید) تاریخ ۱۶ / ۸ / ۱۹۸۶ء سنیچر کو ہونے کا فیصلہ کیا ہے؛ اس لیے سنیچر کو عید کی جائے۔ راندیر چاند کمیٹی اطلاع دے رہی ہے۔

گجرات سماچار ۱۱ / اگست ۱۹۸۶ء

یہ نقل مطابق اصل ہے، ہم اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

العبد: احمد عفی عنہ خانپوری

محمد سعید عفی عنہ، مہتمم جامعہ اسلامیہ ڈابھیل

عباس داؤد بسم اللہ

مذکورہ فیصلہ پر مولانا منت اللہ رحمانی کے چند شبہات

مکرم ومحترم جناب مولانا اکرام علی صاحب زید مجدہم

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا خط عید الاضحیٰ کے چاند کے سلسلہ میں ایک فیصلہ اور اعلان موصول ہوا، جواب حسب ذیل ہے:

اس فیصلہ میں ساری تفصیلات درج ہیں، لیکن یہ معلوم نہ ہوسکا کہ ۲۹/ ذی قعدہ کو موٹا ٹنکاریہ میں مطلع صاف تھا یا ابر آلود؟ مفتی صاحبان اور مدرس حضرات نے جو فیصلہ کیا ہے اس میں بھی اس کا کوئی ذکر نہیں ہے؛ اس لیے ہم پر مطلع کا معاملہ قطعاً غیر واضح ہے، جس کی اس موقعہ پر اہم ضرورت ہے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ خط اور یہ اشتہار شہادۃ علی کتاب القاضی ہے لیکن یہ خط اور اشتہار کے لانے والے نے لا کر آپ کو دیا ہے مجھے نہیں، ظاہر ہے کہ جتنے واسطے بڑھیں گے اسی قدر اشتباہ زیادہ ہوگا۔ لانے والے سے میں واقف ہوں لیکن مجھے اس سے واقفیت نہیں ہے کہ وہ شہادت کے اہل ہیں یا نہیں؟

مولانا اکرام علی صاحب زید مجدہم، جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کے شیخ الحدیث ہیں، اور ابھی دو تین دن پہلے وہاں سے مکان آئے ہیں؛ مگر ان کی دستخط اس تحریر پر نہیں ہے، قاری احمد اللہ صاحب بھی غالباً عالم ہیں؛ مگر ان کی دستخط بھی اس تحریر پر نہیں ہے۔

ان سارے حالات کے جمع ہو جانے کے بعد اس تحریر کو گجرات کے سوا دوسرے علاقہ کے لیے عید الاضحیٰ کی رویت سے متعلق ایک فیصلہ تسلیم کرنا صحیح نہیں ہے؛ اس

لیے میں اپنے سابقہ فیصلہ ہی پر قائم ہوں کہ رویت ۲۹ / ذی قعدہ کی ثابت نہیں ہے؛ اس لیے عیدالاضحیٰ کی نماز ۱۷/ اگست بروز اتوار کو ہوگی۔ آپ اس پر غور فرمالیں کہ اگر رویت ۳۰ / ۲۹ میں دائر ہوگئی ہے تو احتیاط اسی میں ہے کہ نماز ۱۷/ اگست کو ادا کی جائے۔ والسلام

منت اللہ، مقیم: خانقاہ رحمانی مونگیر

۸/ ذی الحجہ ۱۴۰۶ھ یوم جمعہ استاذ خانقاہ رحمانی مونگیر

مجھے اس خط کے مضمون سے اتفاق ہے۔ محمد ظفیر الدین (مفتی دارالعلوم دیوبند)

معروضاتِ فقیر بر گرامی نامۂ امیر:

گجرات میں واقع اہل علم کی مشہور بستی راندیر (سورت) میں حضرت مولانا مفتی سید عبدالرحیم لاجپوری صاحب دامت برکاتہم (صاحب فتاوی رحیمیہ) اور حضرت مولانا محمد رضا اجمیری صاحب دامت برکاتہم (گجرات کی مشہور بزرگ شخصیت اور شیخ الحدیث دارالعلوم اشرفیہ راندیر) اور مولانا مفتی عبدالغنی صاحب مدظلہم (مفتی دارالعلوم اشرفیہ راندیر) اور مولانا مفتی اسماعیل واڈی والا صاحب مدظلہم (مفتی جامعہ حسینیہ راندیر) اور دیگر حضرات کے سامنے ذوالحجہ کے رویت ہلال کی شرعی شہادت پیش ہونے پر ان حضرات نے ثبوت رویت کا فیصلہ صادر فرما کر بذریعۂ پوسٹر مع دستخط حضراتِ فیصلہ کنندگان ومہر حضرت مفتی لاجپوری صاحب دامت برکاتہم اعلان کیا، اور اسی اعلان کی بنیاد پر پورے علاقہ میں عیدالاضحیٰ یوم شنبہ کو منائی گئی۔ جامعہ ڈابھیل کے دارالافتاء نے اسی فیصلہ واعلان کی بنیاد پر عیدالاضحیٰ یوم شنبہ کو ہونے

کا اعلان کیا، جامعہ کے شیخ الحدیث حضرت مولانا اکرام علی صاحب مد ظلہم تو اس اعلان سے قبل ہی وطن کے لیے روانہ ہو چکے تھے؛ البتہ مولانا قاری احمد اللہ صاحب (مجود وصدر شعبۂ قراءت وتجوید جامعہ ڈابھیل) اس وقت تک وطن کے لیے روانہ نہیں ہوئے تھے: اس لیے انہوں نے چاہا کہ میں اس اعلان کی ایک کاپی اپنے ساتھ لے جاؤں اور وہ وہاں امارت شرعیہ بہار کے سامنے پیش کی جائے، لیکن چوں کہ اس اعلان کی زبان اگر چہ اردو تھی؛ مگر رسم الخط گجراتی تھا اور یہ حضرات گجراتی رسم الخط سے واقف نہیں؛ اس لیے ضرورت محسوس ہوئی کہ اس کو اردو رسم الخط میں منتقل کیا جائے، چناں چہ اس اعلان کو اردو رسم الخط میں تحریر کر کے بطور تصدیق جامعہ ڈابھیل کے دارالافتاء کی مہر اور مفتیان کی دستخط اور مہتمم صاحب کی دستخط ثبت کیے گئے۔

اس تفصیل سے یہ واضح ہو گیا کہ جامعہ کے شیخ الحدیث حضرت مولانا اکرام علی صاحب مد ظلہم کی دستخط اس لیے نہیں تھی کہ وہ اس وقت یہاں موجود ہی نہیں تھے، اور وہ ہوتے تب بھی ان کی دستخط اس پر نہیں لی جاسکتی؛ اس لیے کہ تصدیق کے لیے ضرورت تھی کہ تصدیق کنندگان اردو اور گجراتی دونوں رسم الخط سے واقف ہوں جو مولانا موصوف میں نہیں، چناں چہ یہی وجہ ہے کہ مولانا قاری احمد اللہ صاحب زید مجدہم موجود تھے پھر بھی ان کی دستخط بحیثیت تصدیق کنندہ نہیں لی گئی، اس تفصیل کو مد نظر رکھتے ہوئے حضرت امیر شریعت دامت برکاتہم کی تحریر پر غور فرمائیں، اولاً تو اس تحریر کی حیثیت طے کرنا ضروری تھا کہ یہ اعلان فیصلہ ہے کہ کتاب القاضی؟ فقہ سے معمولی مناسبت رکھنے والا شخص بھی کہہ سکتا ہے کہ اس کی حیثیت اعلان محض کی ہے، کتاب القاضی کی نہیں۔ چناں چہ حضرت امیر شریعت مد ظلہم کی تحریر سے بھی یہی مترشح ہوتا ہے کہ

انھوں نے بھی یہی سمجھا ہے؛ اس لیے کہ انھوں نے اپنے گرامی نامہ کی ابتداء ہی ان الفاظ سے کی ہے: ''آپ کا خط اور عیدالاضحیٰ کے چاند کے سلسلہ میں ایک فیصلہ اور اعلان موصول ہوا'' جب کہ کتاب القاضی ہونے والی بات محض ایک احتمال کے درجہ میں لکھی ہے، یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ خط اور یہ اشتہار شہادت علی کتاب القاضی ہے۔ اور اس تحریر کو کتاب القاضی پر محمول بھی کیسے کیا جاسکتا ہے، جب کہ کتاب القاضی والی بات اس میں نہیں ہے، مثلاً: کتاب القاضی میں مکتوب الیہ کی تعیین اور اس سے خطاب ضروری ہے؛ چناں چہ جس میں ابتداء ہی عمومی انداز میں ہو وہ کتاب القاضی معتبر ہی نہیں، ہاں مخاطب کسی متعین شخصیت کو بنا کر بعد میں عموم کر دیا ہو تو جائز ہے۔ اس کا کاتب ہی کی طرف سے سر مہر ہونا ضروری ہے، وغیر ذلک؛ اس لیے اس بناء پر اس کا رد کرنا سمجھ میں نہیں آتا۔

اب یہ طے ہو جاتا ہے کہ یہ اعلان ہے، اور اعلان میں اس کی تصریح ضروری نہیں کہ مطلع صاف تھا یا ابر آلود؛ بلکہ اعلان تو بذریعہ مدافع وقنادل بھی معتبر ہے، جس میں کسی بھی قسم کی کوئی تصریح نہیں ہوتی؛ اس لیے اعلان تسلیم کر لینے کے بعد یہ اشکال بے معنی ہو جاتا ہے۔ اگرچہ موسم باراں کا ہونا جس میں عموماً مطلع ابر آلود رہتا ہے اور فیصلہ کنندگان کا قبول شہادت کے شرائط کا ماہر ہونا اس بات کی بین دلیل ہے کہ اس اشکال کی گنجائش نہیں، غالباً اسی لیے حضرت مدظلہم نے کتاب القاضی والا احتمال پیدا کر دیا؛ حالاں کہ کتاب القاضی میں قاضی کاتب سے وصول کرنے والے حضرات ہی مکتوب الیہ کو وہ خط خود پہنچائیں یہ ضروری ہے اگر درمیان میں انھوں نے کسی کو دے دیا تو وہ کتنے ہی ثقہ کیوں نہ ہوں وہ خط قابل قبول نہیں پھر یہ جملہ ''ظاہر ہے

جتنے واسطے بڑھیں گے اسی قدر اشتباہ زیادہ ہوگا'' بے معنی ہے۔

پھر حضرت امیر مدظلہم کے کلام میں تدافع ہے، ایک طرف تو فرما رہے ہیں: لانے والے سے میں واقف ہوں لیکن مجھے اس سے واقفیت نہیں کہ وہ شہادت کے اہل ہیں یا نہیں؟ اور بعد میں یوں بھی رقم طراز ہیں: ''قاری احمد اللہ صاحب بھی غالباً عالم ہیں؛ مگر ان کے دستخط بھی اس تحریر پر نہیں ہیں''۔

نیز یہ بھی قابل غور ہے کہ جس مقام پر فیصلہ کیا گیا ہو کیا وہاں موجود ہر عالم کا اس میں شریک ہونا ضروری ہے یا فیصلہ کرنے والی جماعت علماء چاہے وہ قلیل ہو اس کا معتبر ہونا کافی ہے؟ ہر عالم کے موجود و شریک ہونے کا مطالبہ تو نظیر ہے اس مطالبہ کی کہ مثلاً اسی مقدمہ میں مدعی علیہ یوں کہے کہ فلاں عالم صاحب یا بزرگ صاحب اس معاملہ میں شہادت دیں گے تب ہی میں قبول کروں گا ورنہ نہیں، کیا اس کے اس مطالبہ کو درست کہا جا سکتا ہے؟۔

اور آخر میں حضرت امیر مدظلہم کے اس ارشاد ''اس تحریر کو گجرات کے سوا دوسرے علاقہ کے لیے عیدالاضحیٰ کی رویت سے متعلق ایک فیصلہ تسلیم کرنا صحیح نہیں ہے'' کا مطلب اگر یہ ہے کہ بطریق جواز و اعتبار صحیح نہیں ہے، تو جواب نمبر تین میں مذکور تفصیل و تنبیہ سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ یہ بات جمعیت علماء کے متفقہ فیصلہ اور علماء پاکستان کے متفقہ فیصلہ کے خلاف ہے، اور اگر اس کا مطلب یہ ہے کہ بطریق وجوب عمل و نفاذ، تو جیسے کہ جواب سے معلوم ہوا ہوگا یہ مسئلہ فیصل شدہ نہیں؛ اس لیے کہ اس کی بنیاد حدود اختیار کی تحدید پر ہے، اور ظاہر ہے کہ ہندوستان میں یہ تحدید قانونی تو ہے نہیں، صرف اعتماد اور مرجعیت کی بنیاد پر ہے، تو اعتماد کے لیے حضرت مفتی سید عبدالرحیم صاحب مدظلہم

کی شخصیت کافی ہے؛اس لیے کے آپ کے فتاویٰ پر ہند و پاک کے اکابر کا اعتماد ہے، اور ملک میں پیش آنے والے اہم اور پیچیدہ مسائل میں آپ کو مرجعیت بھی حاصل ہے، ہاں عمومی مسائل لوگ مقامی علماء سے ہی دریافت کرتے ہیں۔

آخر میں ایک اشکال جو حضرت امیر مدظلہم کی تحریر میں نہیں، لیکن ہوسکتا ہے کہ کسی کو پیش آوے؛ اس لیے اس کی جواب دہی ضروری سمجھتا ہوں وہ یہ کہ اصل اعلان گجراتی رسم الخط میں تھا اس کو اردو رسم الخط میں منتقل کیا گیا، کیا یہ بات موجب اشتباہ ہوسکتی ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ایک نوع کی ترجمانی ہے، کامل ترجمانی تو یہ ہوتی ہے کہ ایک زبان (لغت) سے دوسری زبان میں منتقل کیا جائے، جب کہ یہاں زبان تو اصل اعلان کی اردو ہی تھی صرف رسم الخط گجراتی تھا اس کو اردو رسم الخط کا جامہ پہنایا گیا، اور ترجمانی اصل کے قائم مقام ہے؛ اس لیے حدود وقصاص جہاں شہادت علی الشہادت اور کتاب القاضی کو بھی "الحدود تندرأ بالشبهات" کے اصول کے پیش نظر کافی نہیں سمجھا جاتا وہاں بھی ترجمانی سے کوئی شبہ واشتباہ پیدا نہیں ہوتا، تفصیل کے لیے دیکھیے: الاشباہ والنظائر ص ۱۲۸ مطبوعه بیروت قبیل القاعدة السابعة من النوع الثانی

هذا ما سنح لی ان کان صوابا فمن الرحمن، وان کان خطأ فمنی ومن الشیطان وما ابری نفسی ان النفس لامارة بالسوء.

اس تحریر سے حضرت امیر شریعت مدظلہم کی تنقیص حاشا وکلا، ہرگز مقصود نہیں صرف علمی محاسبہ مقصود ہے۔ والله علیم بذات الصدور. فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

حررہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۶/ محرم الحرام ۱۴۰۸ھ

مفتیٔ گجرات حضرت مفتی سید عبد الرحیم لاجپوری رحمۃ اللہ علیہ کی تائید:

محترم المقام حضرت مولانا مفتی احمد صاحب دامت برکاتہم

بعد سلام مسنون! آپ کا رقعہ موصول ہوا۔ آج ہی آپ کا پورا مضمون اور جواب حضرت اقدس مفتی صاحب مد ظلہم کو سنایا، گو حضرت مفتی صاحب کی طبیعت مضمحل ہے؛ مگر بہت دلچسپی سے سنا اور آخر میں اس پر اطمینان کا اظہار فرمایا۔ اور فرمایا کہ بہت خوب لکھا ہے۔ حضرت مفتی صاحب کے متعلق آپ نے جو لکھا ہے کہ مفتی صاحب کو ملک گیر مرجعیت حاصل ہے، اس کے ثبوت کے لیے آپ نے جو لکھا ہے وہ کافی ہی ہے۔ مزید حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی مدظلہ کا ایک تازہ مکتوب (جو مستقل طبع کرالیا ہے) ارسال ہے، انشاء اللہ اس سے حضرت مفتی صاحب کی ملک گیر شخصیت ہونے کے ثبوت پر مزید تقویت حاصل ہوگی، آپ مناسب سمجھیں تو اپنے جواب کے ساتھ یہ مطبوعہ پرچہ بھی بھیج دیں۔ حضرت مفتی صاحب سلام عرض فرما رہے ہیں، طالب دعا بھی ہیں، ناکارہ بھی دست بستہ سلام عرض کر کے طالب دعا ہے۔ فقط والسلام۔

ناکارہ: اکرام الحق غفرلہ، ۵/ صفر المظفر ۱۴۰۷ھ

مطبوعہ پرچہ حضرت مفتی صاحب مدظلہ کے مشورہ سے ارسال خدمت ہے۔

تحدیث نعمت

''فتاویٰ رحیمیہ'' کے متعلق مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی مدظلہ کے تائثرات وکلمات طیبات

جناب مولانا محمد مرتضی صاحب ناظم کتب خانہ ندوۃ العلماء لکھنؤ گجرات کے

دورہ سے واپسی کے بعد تحریر فرماتے ہیں: ''میں (مولانا محمد مرتضی صاحب) نے حضرت مولانا علی میاں صاحب مدظلہ کو آپ کا سلام و پیام پہنچایا مولانا علی میاں نے فرمایا کہ حضرت مفتی صاحب کی خدمت میں سلام لکھ دو اور لکھ دو کہ:

''میں مفتی صاحب کے لیے ان کی صحت و عافیت اور درازئ عمر کے لیے با قاعدہ مداومت کے ساتھ دعا کرتا ہوں کہ الحمد للہ اس وقت آپ محقق، فقیہ اور ماہر فن ہیں اور آپ کی تحقیق سے پورے ملک کو مستفید ہونے کا شرف حاصل ہو رہا ہے، آپ کی تحقیق عمیق ہر خاص و عام کے لیے اطمینان بخش ہے۔ اللہ تعالیٰ زمانۂ دراز تک آپ کے فیوض و برکات کو قائم رکھیں''۔ آمین

ناچیز خادم: مرتضی ۱۵ ربیع الثانی ۱۴۰۶ھ

بذریعۂ خط چاند کی خبر کی شرعی حیثیت

سوال: ضروری تحریر یہ ہے کہ گجرات کی رویت ہلال والی تحریر جس پر مفتیان کرام کے دستخط ثبت ہیں، جامعہ تعلیم الدین ڈابھیل کے مہتمم جناب مولانا سعید احمد صاحب بزرگ نے مولانا قاری احمد اللہ صاحب استاذ تجوید جامعہ تعلیم الدین کی معرفت مولانا اکرام علی صاحب کے پاس چمپانگر بھاگلپور بھیجی، یہ تحریر حضرت امیر شریعت مدظلہ کی خدمت میں دو عالم دین کی معرفت بھیجی گئی تا کہ وہ بحیثیت امیر کے اس کا اعلان فرماویں، حضرت امیر شریعت مدظلہ کا جواب بھی ارسال خدمت ہے ان کے جواب کی روشنی میں درج ذیل سوالات کے جواب مطلوب ہیں، امید کہ مدلل جواب دینے کی زحمت گوارہ فرمائیں گے۔

① یہ تحریر محض ایک اعلان اور اشتہار ہے یا اس کی حیثیت فتوی کی ہے؟

② بقول حضرت امیر شریعت بہار واڑیسہ اگر یہ تحریر شہادت علی کتاب القاضی ہے تو بذریعہ ڈاک موصول ہونے پر عید الفطر وعید الاضحیٰ کا اعلان کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ اور اگر یہ تحریر کسی کی معرفت موصول ہو تو لانے والے شخص میں کن اوصاف کا ہونا ضروری ہے، کیا عدد وعدالت بھی شرط ہے؟

③ یہ تحریر ریڈیو، ٹیلی فون، تار کی خبر کے مساوی ہے یا زائد یا کم؟

④ جب مفتیان کرام نے عید الاضحیٰ کا اعلان محض تین آدمیوں کی حلفیہ شہادت پر کیا ہے تو اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مطلع ابر آلود ہوگا ورنہ جم غفیر کا ہونا ضروری ہے، کیا ایسی صورت میں تحریر میں مطلع کی تصریح نہ ہونے کی بنیاد پر اس کو مسترد کر دینا صحیح ہوگا؟

⑤ جو ادارہ ریڈیو، ٹیلی فون کی خبر پر رمضان وعیدین کا اعلان کرتا ہو اگر وہاں کا ذمہ دار اس تحریر کو مسترد کر دے تو اس کا یہ فعل شرعی نقطۂ نظر سے صحیح ہوگا یا غلط؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

① اس تحریر کی حیثیت محض اعلان کی ہے، اعلان جس طرح منادی کے ذریعہ ہوتا ہے، اسی طرح دور حاضر میں پوسٹر وغیرہ بھی اعلان ہی کا ایک طریقہ ہے۔ یہ شہادت یا خبر نہیں ہے؛ اس لیے اس میں ان تمام شرائط وقیود جن کی شہادت یا خبر میں رعایت کی جاتی ہے، رعایت ضروری نہیں ہے؛ البتہ اس میں اتنا ضروری ہے کہ جس کمیٹی یا شخصیت کی طرف سے یہ اعلان کیا جا رہا ہے اسی کا یہ اعلان ہے اس کا غلبۂ ظن ہو۔

خبر منادی السلطان مقبول عدلا کان او فاسقا، کذا فی جواھر

الاخلاطی. (فتاوی عالمگیری، کتاب الکراهیة ٥/ ٣٠٩)

قلت: والظاهر انه يلزم اهل القرى الصوم بسماع المدافع او رؤية القنادل من المصر؛ لانه علامة ظاهرة تفيد غلبة الظن وغلبة الظن حجة موجبة للعمل كما صرحوا به، واحتمال كون ذلك لغير رمضان بعيد اذ لا يفعل مثل ذلك عادة فى ليلة الشك الا لثبوت رمضان(شامی ٢/ ٩١)

چناں چہ اس تحریر میں دارالافتاء کی مہر اور اراکین کمیٹی کے دستخط اسی لیے ثبت ہیں کہ مطلوبہ غلبۂ ظن حاصل ہو اور تزویر و جعل سازی کا احتمال باقی نہ رہے، بلکہ غور کرنے سے واضح ہو جائے گا کہ توپ کے گولوں اور قنادل کی روشنی سے حاصل ہونے والے غلبۂ ظن (جس کی تصریح علامہ شامی کی عبارت میں موجود ہے) کے مقابلے میں اس قسم کی تحریر سے حاصل ہونے والا غلبۂ ظن زیادہ مضبوط ہے؛ اس لیے کہ اول الذکر کی دلالت عقلی ہے جب کہ ثانی الذکر کی دلالت وضعی ہے، اور افادۂ علم کی جو شان وضعی میں ہے وہ عقلی میں نہیں۔

② یہ شہادت علی کتاب القاضی نہیں ہے جیسا کہ معلوم ہو چکا۔ ہاں شہادت علی کتاب القاضی میں عدد وعدالت شرط ہے؛ اس لیے اگر وہ بذریعہ ڈاک موصول ہو تو عید کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ جیسا کہ کتب فقہ میں "باب کتاب القاضی الی القاضی" میں اس کی تفصیلات موجود ہیں۔ (دیکھیے درمختار مع الشامی ۴/ ۳۵۰ تا ۳۵۵)

③ اس کے جواب سے پہلے بطور تمہید دو باتیں جاننا ضروری ہے:

(الف): شہادت اور خبر دو چیزیں الگ الگ ہیں، ان دونوں میں بہت بڑا فرق ہے، بعض کلام بحیثیت خبر کے معتبر اور قابل اعتماد ہوتے ہیں؛ مگر بحیثیت شہادت

نا قابل قبول ہوتے ہیں، شریعت اسلام میں تو ان کا فرق بہت واضح اور صاف ہے ہی، آج کل تمام دنیا کی عدالتوں میں بھی ان دونوں چیزوں کا فرق قانونی حیثیت سے محفوظ ہے، ٹیلی گراف، ٹیلیفون، ریڈیو، اخبارات اور خطوط کے ذریعے جو خبریں دنیا میں نشر ہوتی ہیں ان کا نشر کرنے والا، لکھنے والا اگر کوئی قابل اعتماد شخص ہے تو بحیثیت خبر کے وہ سارے جہاں میں قبول کی جاتی ہے، اس پر اعتماد کر کے لاکھوں کروڑوں کے کاروبار ہوتے ہیں، دنیا بھر کے معاملات ان خبروں پر چلتے ہیں، عدالتیں بھی بحیثیت خبر کے ان کو تسلیم کرتی ہیں؛ لیکن کسی مقدمہ اور معاملہ کی شہادت کی حیثیت سے ان خبروں کو کوئی دنیا کی عدالت قبول نہیں کرتی اور ایسی خبروں کی بنیاد پر کسی مقدمہ کا فیصلہ نہیں دیتی؛ بلکہ یہ ضروری قرار دیتی ہے کہ گواہ مجسٹریٹ کے سامنے حاضر ہو کر گواہی دے، تاکہ اس پر جرح کی جاسکے اور چہرہ بشرہ کی کیفیت سے اس کو پرکھا جاسکے یہی حکم شریعت اسلام کا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ خبر کوئی حجت ملزمہ نہیں جو دوسرے کو ماننے پر اور اپنا حق چھوڑنے پر مجبور کر دے جس کو خبر دینے والے کی دیانت اور سچائی پر بھروسہ ہو وہ مانے گا جس کو نہ ہو وہ ماننے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا، بخلاف شہادت کے کہ وہ حجت ملزمہ ہے، جب شرعی شہادت سے کسی معاملہ کا ثبوت قاضی یا جج نے تسلیم کر لیا تو قاضی یا جج اس پر مجبور ہے کہ اس کے موافق فیصلہ دے اور فریق مخالف اس پر مجبور ہے کہ اس کو تسلیم کرے یہ اجبار و الزام صرف خبر سے نہیں ہوتا اسی لیے صرف خبر کی تصدیق پر کوئی پابندی بجز ثقہ اور قابل اعتماد ہونے کے نہ شرعاً ہے نہ موجودہ عدالتوں کے قانون میں، اور شہادت کے لیے عام عدالتی قوانین میں بہت سی پابندیاں دنیا میں رائج ہیں، اور اسلامی شریعت نے بھی اس کے لیے نصاب شہادت کا مکمل ہونا

اور شاہد کے حالات کا جائزہ لے کر شرائط شہادت کا جانچنا ضروری قرار دیا ہے۔
(رویت ہلال، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ ۳۴:۳۵)

رمضان کے علاوہ دوسرے ہر چاند کی شہادت کے لیے نصاب شہادت اور اس کی تمام شرائط کو ضروری قرار دیا گیا اور سب فقہاء امت کا اس پر اتفاق ہے۔ (ایضا ۳۶)

شہادت ہلال کے لیے آٹھویں شرط مجلسِ قضاء ہے یعنی شاہد کے لیے ضروری ہے کہ قاضی کی مجلس میں خود حاضر ہو کر شہادت دے پسِ پردہ یا دور سے بذریعۂ خط یا ٹیلیفون یا وائرلیس ریڈیو وغیرہ جدید آلات کے ذریعہ کوئی شہادت دے تو وہ شہادت نہیں؛ بلکہ محض ایک خبر کا درجہ رکھے گی، جن معاملات و مسائل میں خبر کافی ہے ان میں اس پر عمل جائز ہوگا، اور جن معاملات میں ثبوت کے لیے شہادت ضروری ہے ان میں یہ خبر کافی نہ سمجھی جائے گی اگرچہ آواز پہچانی جائے اور بولنے والا ثقہ اور قابلِ شہادت ہو۔ (ایضا ۴۰)

(ب): اسی طرح فیصلہ اور فیصلہ کا اعلان اور فیصلہ کی خبر؛ تینوں الگ الگ چیزیں ہیں:

فیصلہ کا مطلب تو یہ ہے کہ قاضی یا ہلال کمیٹی کے سامنے رویت کی شہادتیں گذریں، اور ان کی روشنی میں وہ فیصلہ کریں، اس کے لیے ضروری ہے کہ ضابطۂ شہادت کی پابندی کی جائے جس کی شریعت میں تین صورتیں ہیں: ① شہادت علی الرؤیۃ ② شہادت علی شہادت الرؤیۃ ③ شہادت علی القضاء۔ (اس کی تفصیل کتب فقہ میں موجود ہے، اجمالا دیکھنا چاہیں تو جواہر الفقہ ۱/۴۰۰، ۴۰۱ میں دیکھئے)۔

اعلان کا مطلب یہ ہے کہ قاضی یا ہلال کمیٹی نے جو فیصلہ کیا ہے اس کو لوگوں کے

درمیان شائع وعام کرنے کے لیے جو طریقہ اختیار کیا جائے اس کے لیے ضابطۂ شہادت کی کوئی پابندی نہیں ہے؛ بلکہ ہر وہ طریقہ جس کے ذریعہ لوگوں کو (اس بات کا) غلبۂ ظن حاصل ہو جائے (کہ یہ اعلان متعلقہ قاضی یا ہلال کمیٹی کی طرف سے کیا جارہا ہے) اس کا اختیار کرنا کافی ہے چناں چہ اس کے لیے توپ کے گولے یا پوسٹر وغیرہ (بشرطیکہ احتمال تزویر نہ ہو) بھی کافی ہے جیسا کہ نمبر ا میں گذر چکا۔ اس مقصد کے لیے ریڈیو بھی استعمال کیا جاسکتا ہے؛ اور اس میں غلبۂ ظن پیدا کرنے اور احتمال تزویر سے بچانے کی صورت وہ ہوگی جو حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے لکھی ہے: ''ریڈیو کو اس کا پابند کیا جائے کہ وہ چاند کے متعلق مختلف خبریں نشر نہ کرے صرف وہ فیصلہ نشر کرے جو اس شہر کے قاضی یا ہلال کمیٹی نے اس کو دیا ہے اور اس کو نشر کرنے میں پوری احتیاط سے کام لے جن الفاظ میں فیصلہ دیا گیا ہے وہ الفاظ بعینہ نشر کیے جائیں''۔ (آلات جدیدہ کے شرعی احکام ص ۱۸۹)

دیکھئے اس میں حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جو قیود لگائی ہیں وہ اسی غلبۂ ظن پیدا کرنے اور احتمال تزویر سے بچانے کے لیے ہیں۔ علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ کی جواب نمبر ا میں منقولہ عبارت کا یہ جملہ ''واحتمال ذلك لغير رمضان بعيد اذ لا يفعل مثل ذلك عادة في ليلة الشك الا لثبوت رمضان'' اسی مقصد کی طرف مشیر ہے۔ اور اسی لیے اجلاس جمعیۃ علمائے ہند منعقدہ ۱۴ / ۱۵ ذو القعدہ ۱۳۷۰ھ (بمقام مراد آباد میں باتفاق علماء واکابر یہ فیصلہ کیا گیا) ''مجلس نے بالاتفاق طے کیا کہ اگر ریڈیو کے ذریعہ آنے والی خبر کے متعلق یہ اطمینان ہو جائے کہ جس جگہ سے ریڈیو کی خبر دی جارہی ہے وہاں کے علماء نے چاند ہونے کی باقاعدہ شہادت لے کر چاند ہونے کا حکم

کر دیا ہے، خبر دینے والا بھی متعین ہو کہ کوئی مسلم معتمد خبر دیتا ہو تو اس اعلان پر اعتماد کر کے دوسرے مقامات میں بھی چاند ہو جانے کے حکم پر عمل کیا جانا جائز ہے، اور تمام ہندوستان کے شہروں اور قصبوں میں متعین ذمہ دار جماعات اس کے موافق حکم کریں تو اس پر عمل کیا جائے۔ یہ حکم تمام ہندوستان اور پاکستان کے لیے ہے"۔ (کفایت المفتی ۹/ ۵۰۷)

تیسری چیز خبر ہے، اور اس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک رویت کی خبر اور دوسری فیصلہ کی خبر، رویت کی خبر بذریعہ ریڈیو یا ٹیلی فون کے ملی ہے تو عید میں اس کی بنیاد پر فیصلہ نہیں کیا جا سکتا؛ اس لیے کہ اس کے لیے شہادت شرط ہے اور وہ موجود نہیں ہے؛ چناں چہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں "ہلال رمضان کے علاوہ عید، بقر عید یا کسی دوسرے مہینہ کے لیے ثبوت ہلال با قاعدہ شہادت کے بغیر نہیں ہو سکتا، اور شہادت کے لیے شاہد کا حاضر ہونا لازمی ہے، غائبانہ خبروں کے ذریعہ شہادت ادا نہیں ہو سکتی خواہ وہ قدیم طرز کے آلات خبر رسانی خط وغیرہ ہو، یا جدید طرز کے ریڈیو، ٹیلیفون وغیرہ"۔ (آلات جدیدہ کے شرعی احکام ص ۱۸۸)

دوسری فیصلہ کی خبر ہے وہ ان آلات کے ذریعہ ملی اور خبر دینے والا ثقہ آدمی ہے، اور قرائن قویہ سے اس کی تعیین ہو جاتی ہے، تو وہ معتبر ہے۔ اور اس پر عمل جائز ہونے کے ساتھ ساتھ مقامی کمیٹی اسی کی بنیاد پر فیصلہ کرنے کے بجائے اس فیصلہ کا اعلان کر سکتی ہے۔ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں: "دوسرا کلام ٹیلی فون کے واسطہ میں ہے اور یہی مقصود بسوال ہے سو اس کا جواب ظاہر ہے کہ جن احکام میں حجاب مانع قبول ہے، اس میں غیر معتبر ہے، اور جن میں حجاب مانع نہیں اس میں اگر قرائن قویہ سے متکلم کی تعیین معلوم ہو جائے تو معتبر ہے۔ (آلات جدیدہ کے شرعی احکام ص ۲۰۹)

اسی سلسلہ میں جواہر الفقہ میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا محمد یوسف بنوری صاحب رحمۃ اللہ علیہ، اور حضرت مولانا مفتی رشید احمد لدھیانوی صاحب مدظلہم، کا متفقہ فیصلہ موجود ہے کہ ''ذیلی کمیٹی اگر باقاعدہ شہادتیں لے کر کوئی فیصلہ کرتی ہے تو فیصلہ شہادت کی بنیاد پر ہو چکا، اب صرف اعلان کا کام باقی ہے اس کے لیے شہادت ضروری نہیں؛ بلکہ ذیلی کمیٹی کا کوئی ذمہ دار آدمی مرکزی کمیٹی کو ٹیلی فون پر محتاط طور پر جس میں کسی مداخلت کا خطرہ نہ رہے ذیلی کمیٹی کے اس فیصلہ کی اطلاع دیدے، اور مرکزی کمیٹی اس صورت میں اس کو اپنا فیصلہ کہہ کر نہیں بلکہ ذیلی کمیٹی کا فیصلہ بتلا کر اس طرح نشر کرے کہ مرکزی کمیٹی کے سامنے اگرچہ کوئی شہادت نہیں آئی، بلکہ فلاں ذیلی کمیٹی نے جس میں فلاں فلاں علماء شریک ہیں شہادت کی بنیاد پر یہ فیصلہ کیا ہے، ہم اس فیصلہ پر اعتماد کر کے اعلان کر رہے ہیں، اس صورت میں مرکزی کمیٹی کا یہ اعلان ٹیلی فون سے آئی ہوئی اطلاع پر درست ہے''۔ (جواہر الفقہ ۱/ ۴۰۲، ۴۰۳)

ریڈیو کا حکم بھی یہی ہے جیسا کہ فیصلہ مرادآباد کے اس جملہ ''اور تمام ہندوستان کے شہروں اور قصبوں میں متعین ذمہ دار جماعات اس کے موافق حکم کریں تو اس پر عمل کیا جائے'' سے ظاہر ہے؛ اس لیے کہ ذمہ دار جماعات کا یہ حکم ان کا اپنا فیصلہ نہیں، (کہ اس کے لیے شہادت ضروری ہے جو یہاں موجود نہیں) بلکہ جو فیصلہ ہو چکا ہے اس کی تعمیل اور اعلان محض ہے۔

علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ حاشیہ البحر الرائق میں فرماتے ہیں:

لم یذکروا عندنا العمل بالامارات الظاہرۃ الدالۃ علی ثبوت الشہر

کضرب المدافع فی زماننا والظاهر وجوب العمل بها علی من سمعها ممن کان غائبا عن المصر کاهل القری ونحوها کما یجب العمل بها علی اهل المصر الذین لم یروا الحاکم قبل شهادة الشهود. (منحة الخالق۲/ ۲۹۱)

اسی تفصیل سے تحریری اطلاع بھی اگر مختلف بالقرائن ہے تو اس کا حکم یہی ہونا ظاہر ہوتا ہے اس جگہ یہ بات ذہن نشین رہے کہ ”کاهل القری ونحوها“ کی قید سے قاضی یا حاکم کا یہ حکم جن حدود میں نافذ ہوتا ہے وہ علاقہ مراد ہے؛ اس لیے فیصلہ کرنے والے کا یہ فیصلہ کن حدود میں نافذ اور واجب العمل ہے، یہ بھی معلوم ہونا چاہیے اس کا مدار حاکم وقاضی کے حدودِ اختیار پر ہے، چناں چہ اگر وہ والی سلطنت ہے تو تمام حدود سلطنت میں، اور اگر کسی محدود علاقہ کا حاکم وقاضی ہے تو اسی علاقہ میں؛ لیکن یہ بات وہاں ممکن ہے جہاں اسلامی حکومت ہو، اگر کسی علاقہ یا ملک میں غیر مسلم حکومت ہو تو وہاں علماء یا منتخب ہلال کمیٹی حاکم وقاضی کے قائم مقام ہے۔

رہے اس کے حدودِ اختیار تو اس سلسلہ میں کوئی دوٹوک بات کتب فقہ میں یا ہمارے اکابر کے کلام میں نظر سے نہیں گزری اور اس کی وجہ بھی دراصل یہ ہے کہ یہاں قانونی اختیار تو حاصل نہیں ہے جس کے حدود متعین کیے جائیں، ہاں! علماء کی کسی جماعت یا فرد کو عوام مؤمنین کا اعتماد حاصل ہوتا ہے وہی اس قانونی اختیار کا قائم مقام ہوتا ہے لیکن اس کی حد بندی دشوار ہے، ہاں جس نوع کا اعتماد ہو اسی نوع کی تحدید کی جاسکتی ہے، مثلاً کسی عالم یا مفتی یا علماء کی جماعت یا ہلال کمیٹی کو ایک مخصوص علاقہ کا اعتماد اور اس میں مرجعیت حاصل ہے تو اس کا فیصلہ اسی علاقہ تک واجب العمل اور نافذ ہوگا۔ اور اگر ان میں سے کسی کو ملک گیر اعتماد و مرجعیت حاصل ہے تو اس کا

فیصلہ ملک گیر پیمانہ پر واجب العمل و نافذ ہونا چاہیے۔

تنبیہ: یہ یاد رہے کہ یہ کلام وجوب عمل و نفاذ میں ہے، جواز عمل و اعتبار میں نہیں؛ اس لیے کہ جواز عمل و اعتبار کا پورے ملک میں ہونا جمعیتِ علماء کے متفقہ فیصلہ اور ''جواہر الفقہ'' کی عبارت سے صراحۃً معلوم ہوتا ہے۔

مذکور الصدر تمہید کے بعد آپ کے سوال کا جواب واضح ہو گیا۔

(الف) شہادت کے لیے ریڈیو، ٹیلی فون اور اس قسم کی تحریر تینوں میں سے کوئی بھی کافی نہیں۔

(ب) اعلان کے لیے ریڈیو اور اس قسم کی تحریر دونوں کام دے سکتے ہیں بشرطیکہ تمہید میں مذکور امور کا لحاظ کیا جائے؛ البتہ ٹیلی فون اپنی وضع اور استعمال کے لحاظ سے یہ کام نہیں دے سکتا۔

(ج) خبر و اطلاع کا مقصد تینوں سے حاصل ہو سکتا ہے، جب کہ اس میں مذکور فی التمہید شرائط کا خیال رکھا جائے۔

④ اعلان اور خبر میں اس تصریح کی ضرورت نہیں، اس کے بغیر بھی واجب العمل ہے، کتاب القاضی میں اگر اس کی تصریح نہ ہو پھر بھی مکتوب الیہ کو اگر فیصلہ کی صحت پر اعتماد ہے تو اس کی بنیاد پر فیصلہ کر سکتا ہے ورنہ نہیں۔

⑤ علماء کو چاہیے کہ اس ادارہ نے تحریر ہذا کو جن وجوہات کی بنیاد پر رد کیا ہے اگر وہ صحیح ہے، تو مان لیں، اور اگر وہ وجوہات درست نہیں تو ذمہ داران ادارہ سے گفتگو کر کے آئندہ ایسا نہ ہو اس کا لحاظ رکھنے کی تاکید کریں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم وعلمہ اتم واحکم۔

حررہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۶/ محرم الحرام ۱۴۰۰ھ

انگلینڈ والے رویت ہلال میں مراکش کی خبر کا اعتبار کریں یا سعودیہ عربیہ کی خبر کا؟

سوال: انگلینڈ میں موسم کی خرابی کی وجہ سے عام طور پر آسمان ابر آلود رہتا ہے، خصوصاً بوقت شام آسمان اور زیادہ ابر آلود ہو جاتا ہے، اس وجہ سے رمضان المبارک شروع کرنے کے لیے اور عیدین ادا کرنے کے لیے ہمیشہ دوسرے ملکوں سے چاند کی خبر معلوم کرنے کی محتاجی رہتی ہے، ایسا کبھی نہیں ہوا ہے کہ انگلینڈ ہی میں چاند دیکھ کر رمضان المبارک شروع کیا گیا ہو یا عیدین ادا کی گئی ہو، اسی وجہ سے یہاں کے علماء کرام نے برسوں پہلے انڈیا اور پاکستان کے مفتیان کرام سے رجوع فرما کر فتاوی دریافت فرمائے ہیں، مفتیان کرام کے جوابات کا ماحصل یہ ہے کہ قریب ترین اسلامی ملک پر عمل کرنا احوط ہے اور دوسرے تمام ملکوں پر عمل کرنا جائز ہے، ان تمام جوابات کی روشنی میں مراکش انگلینڈ سے قریب ہونے کی وجہ سے اور احتیاط پر عمل کرنے کے جذبہ سے صحیح العقائد تمام مسلمانوں نے بالاتفاق مراکش پر عمل شروع کیا اور تقریباً سولہ سترہ سال اس پر عمل پیرا رہے؛ مگر بدقسمتی سے مراکش سے چاند کی خبر جلد دستیاب نہیں ہوتی ہے، بعض مرتبہ شب میں دس گیارہ بجے، اور بعض مرتبہ دو تین بجے، اور بعض مرتبہ دوسرے روز صبح میں خبر ملتی ہے، اس وجہ سے عوام میں انتشار پیدا ہو جاتا ہے، اس طرح کی پریشانیوں کی وجہ سے چاند کے مسئلہ میں صحیح العقائد مسلمانوں کے دو فریق بن چکے ہیں، ایک فریق علماء اور عوام یہ مانتے ہیں کہ کسی بھی غیر متعین ملک پر

عمل کرنا جائز ہے، جب کہ دوسرے فریق کے علماء اور عوام یہ مانتے ہیں کہ کسی بھی ایک ملک کو معین کر کے اس پر عمل کرنا جائز ہے؛ لہذا مراکش ہی پر عمل کرنا چاہیے۔

جو فریق دنیا بھر کے کسی بھی غیر معین ملک پر رمضان المبارک شروع کر دیتا ہے، اور کسی بھی غیر معین ملک کی خبر پر عید الفطر مناتا ہے، ان کے ہمیشہ ۲۹ روزے ہوا کرتے ہیں، کوئی ملک معین نہ کرنے کی وجہ سے اور اسی طرح شعبان اور عید الاضحیٰ بھی دنیا بھر میں سے کسی بھی غیر معین ملک پر مناتے ہیں، اور اس فریق کے علمائے کرام کا یہ کہنا ہے کہ اس طرح پر عمل کرنے کے لیے ہمارے پاس مفتیان کرام کے فتاوے ہیں؛ مگر ہماری ناقص رائے سے ہم یوں سمجھتے ہیں کہ اس طرح عمل کرنے سے یہ لازم آتا ہے کہ گویا ان حضرات نے شریعت سے آزاد ہو کر رمضان المبارک اور عیدین جیسی عظیم الشان عبادات کو اپنے ہی کنٹرول میں کر لیا ہے، جب کہ دوسرے فریق کے مسلمان رمضان المبارک اور عیدین جیسی عظیم الشان عبادات کو اپنے قبضہ میں لینے کے بجائے شریعت مطہرہ کا تابع بن کر چاند کے بارے میں انگلینڈ کو دوسرے کوئی معین ملک کا تابع بنانا ضروری سمجھ کر آج تک مراکش پر عمل کرتے رہے ہیں، اور مراکش سے دیر پا خبر موصول ہونے کی وجہ سے واقع ہونے والی تمام پریشانیاں برداشت کرتے ہوئے بھی رمضان المبارک اور عیدین جیسی عظیم الشان عبادات کو ادا کرتے رہے ہیں؛ مگر کسی بھی غیر معین ملک پر عمل کرنے والے فریق کی طرف سے عموماً مغرب سے متصل چاند کی خبر شائع ہو جانے کی وجہ سے مراکش پر عمل کرنے والے مسلمانوں میں سے بھی کتنے حضرات مراکش کی خبر کا انتظار چھوڑ کر اس فریق کے ساتھ ہو لیتے ہیں، اس وجہ سے ایک ہی شہر میں بسنے والے اور ایک ہی مسلک پر چلنے والے بلکہ ایک

ہی مسجد کے مصلیوں میں اور ایک ہی گھر میں رہنے والے باپ، بیٹوں، اور بھائیوں میں اختلاف ہو جاتا ہے، ان تمام وجوہات کی بناء پر مراکش پر عمل کرنے والے مسلمان مورد لعن وطعن بنتے ہیں، افتراق بین المسلمین کا مذموم الزام بھی ان پر تھوپا جاتا ہے، ان تمام مشکلات کو مدنظر رکھ کر مراکش پر عمل کرنے والے مسلمان مراکش پر عمل ترک کر کے دوسرے معین ملک پر عمل کرنے کی غرض سے آیا سعودی عربیہ ہی پر رمضان المبارک اور عیدین میں عمل کریں تو اس میں کوئی حرج ہے؟ سعودی عربیہ کی خبر پر رمضان المبارک اور عیدین منانا جائز ہے؟ سعودی عربیہ اسلام کا مرکز ہے، اور بفضلہٖ تعالیٰ حرمین شریفین کی وجہ سے عالم اسلام کے تمام مسلمانوں کے دلوں میں اس کا احترام ہے، اور چاند کا فیصلہ بھی حکومت کی طرف سے معین کردہ قاضی القضاۃ کی طرف سے علمائے کرام پر مشتمل ہلال کمیٹی چاند کی باقاعدہ شہادتیں ملنے ہی کے بعد کرتی ہے، رمضان المبارک اور عیدین جیسی عظیم الشان عبادات میں محکمۂ موسمیات کی گنتی کا قطعاً اعتبار نہیں کرتی ہے۔

آپ محترم کے مطالبہ کی غرض سے وہاں کی ہلال کمیٹی کی طرف سے چاند کے فیصلہ کرنے کے طور وطریق کیا ہیں، اور وہاں کے علمائے کرام کو محکمۂ موسمیات سے کس قدر انقباض ہے، اس کا مواد آپ محترم پر ارسال کرتے ہیں، سعودی عربیہ کا ٹائم انگلینڈ کے ٹائم سے دو تین گھنٹے آگے ہونے کی وجہ سے چاند کی رویت کی خبر بہت جلد بڑی سہولت سے یہاں فراہم ہو جاتی ہے اور سعودی عربیہ جیسے ایک معین ملک پر عمل پیرا ہونے کی وجہ سے ہمیشہ ۲۹ روزے ہونے کا خطرہ بھی نہیں رہے گا، جیسا کہ مراکش پر عمل کرنے کی وجہ سے نہیں رہتا تھا، اور سعودی عربیہ پر عمل کرنے کی وجہ سے امید

ہے کہ وہ فریق جو دنیا بھر کے کسی بھی غیر معین ملک پر عمل کر کے رمضان المبارک اور عیدین مناتا رہتا ہے وہ بھی سعودی عربیہ کی خبر پر عمل کرنا شروع کر دے اس طرح صحیح العقائد مسلمانوں کا دوبارہ انشاء اللہ اتفاق واتحاد بھی ہو جاوے، جس کے لیے آج لوگ بڑے متمنی ہیں، مذکورہ بالا بیان کردہ تمام پہلوؤں کو مدنظر فرما کر سعودی عربیہ کی خبر پر رمضان المبارک اور عیدین منانے کے بارے میں شریعت کا حکم کیا ہے؟

اس کے متعلق آپ محترم ہم ناکاروں کی رہنمائی فرما کر ممنون ومشکور ہوں، یہی ہماری آپ محترم سے مؤدبانہ عرض ہے، قوی امید ہے کہ جناب والا ہماری روئیداد کا بغور مطالعہ فرما کر تشفی بخش جواب مرحمت فرماویں گے۔ فقط۔

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

دراصل اس مسئلہ کی بنیاد اختلاف مطالع کے اعتبار وعدم اعتبار پر ہے، امام اعظم حضرت ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے ظاہری روایت یہ ہے کہ اختلاف مطالع کا اعتبار نہ کیا جائے اسی کو عام فقہائے حنفیہ نے راجح قرار دیا ہے؛ یہاں تک کہ مشرق ومغرب کے فاصلے میں اختلاف مطالع کو غیر معتبر قرار دے کر ایک جگہ کی رویت کو دوسری جگہ کے لیے حجت قرار دیا ہے۔

''درمختار'' میں ہے: واختلاف المطالع ورؤيته نهاراً قبل الزوال و بعده غير معتبر على ظاهر المذهب، وعليه اكثر المشائخ وعليه الفتوى، بحر عن الخلاصة فيلزم اهل المشرق برؤية اهل المغرب اذا ثبت عندهم برؤية اولئك بطريق موجب كما مرّ (در مختار علی ہامش الشامی ۲/ ۹۶)

حضرت اقدس مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے فتاوی رشیدیہ ۱/ ۱۴۱ میں اور

حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے فتاوی دار العلوم (مطبوعہ کراچی) ۱/ ۳۶۷ میں اور حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے امداد الفتاوی ۲/ ۱۱۲ میں اور حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے کفایت المفتی ۴/ ۲۰۹، ۲۱۱، ۲۱۲ میں اسی کو اختیار فرمایا؛ البتہ فقہائے حنفیہ کی ایک جماعت نے بلاد بعیدہ میں اختلاف مطالع کا اعتبار کیا ہے، جن میں سے علامہ فخر الدین زیلعی رحمۃ اللہ علیہ صاحب تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق ۱/ ۳۲۱ اور علامہ کاسانی رحمۃ اللہ علیہ صاحب بدائع الصنائع ۲/ ۸۳ میں حضرت العلامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ العرف الشذی ۱/ ۲۰۳ میں اور علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے فتح الملہم ۳/ ۱۱۳ میں اور حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے رسالہ رویت ہلال صفحہ ۴۸، ۴۹ میں اسی کو اختیار کیا ہے؛ البتہ اس صورت میں بلاد بعیدہ اور بلاد قریبہ میں قرب وبعد کا معیار کیا اور کتنا ہوگا؟ یہ ایک حل طلب مسئلہ ہے تو اس سلسلہ میں مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں: جن بلاد میں اتنا فاصلہ ہو کہ ایک جگہ کی رویت دوسری جگہ اعتبار کرنے کے نتیجہ میں مہینہ کے دن ۲۸ رہ جائیں یا ۳۱ ہو جائیں وہاں اختلاف مطالع کا اعتبار کیا جائے گا اور جہاں اتنا فاصلہ نہ ہو وہاں نظر انداز کیا جائے گا۔ (رسالہ رویت ہلال ص ۴۹)

مولانا محمد برہان الدین سنبھلی صاحب مدظلہ اس سلسلہ میں فرماتے ہیں: کہ یہی بات قول فیصل کا درجہ رکھتی ہے اور عملاً تمام علمائے عصر نے اسی کو اختیار بھی کیا ہے، مزید برآں یہ کہ اس قول کو اختیار کرنے سے دونوں پہلوؤں (عام فقہائے احناف کے مشہور مسلک کی فی الجملہ ترجیح اور ایک مشاہد ومحسوس حقیقت کا کسی قدر اعتراف) کی یک گونہ رعایت بھی ہو جاتی ہے۔ (رویت ہلال کا مسئلہ ص ۹۹)

اس لیے آپ کے یہاں جب مطلع ہمیشہ غیر صاف رہتا ہے تو جہاں سے خبر بطریق موجب آوے اور اس کو ماننے سے مہینہ ۲۸ یا ۳۱ کا لازم نہیں آتا تو اس پر عمل کریں، اور مختلف جگہوں سے خبر آنے کی صورت میں اگر چہ کسی بھی ایک غیر معین کو اختیار کر سکتے ہیں لیکن اس میں لوگوں میں شدید خلفشار رہتا ہے کہ ایک ہی بستی اور ایک ہی مسجد میں بلکہ ایک ہی گھر میں کوئی صائم ہے اور کوئی غیر صائم ہے، کوئی عید منا رہا ہے اور کوئی رمضان پر عامل ہے، جس کے نتیجہ میں نااہل لوگوں کی طرف سے مسائل فقہ پر زبان طعن دراز کی جاتی ہے، اور ایک دوسرے کے خلاف فتویٰ حاصل کرنے کا سلسلہ جاری ہو جاتا ہے تو ایسے خلفشار اور فتنۂ عوام سے بچنے کے اور عوام کو بچانے کے لیے کسی ایک مقام کی خبر کو عمل کے لیے سب مل کر متعین کرلیں تو کوئی حرج نہیں ہے۔

تنبیہ ضروری: چوں کہ آپ کا مقصد وہاں مقیم مسلمانوں کے مختلف گروہوں میں واقع اختلاف کی خلیج کو ختم کرنا ہے، تو مناسب یہ ہے کہ تمام گروہوں کے سربرآوردہ حضرات مل کر ایک استفتاء تیار فرمائیں، اور اس کے بعد مفتیان کرام کی خدمت میں پیش کریں تاکہ عمل کے لیے اتفاق کی کوئی صورت وجود میں آسکے، ورنہ انفرادی طور پر ایک استفتاء بھیج کر جواب حاصل کرنے سے یہ مقصد حاصل نہ ہوگا، خصوصاً جب کہ سعودیہ کے متعلق بعض حضرات کا اصرار ہے کہ وہ لوگ حساب پر چلتے ہیں رویت اور شہادت محض عقلی تسلی ہے، اس صورت میں اس پر مدار رکھنا بھی موجب خلفشار ہو سکتا ہے آپ نے جن دو مضامین کی فوٹو کاپی ارسال فرمائی ہے وہ یہاں کے لیے رکھ لی ہیں؛ اس لیے کہ آپ کے پاس تو اصل موجود ہی ہوگی۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

نقل مطابق اصل ہے۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۳ / ربیع الاول ۱۴۰۷ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ

مکتوب گرامی حضرت مفتی سید عبد الرحیم صاحب لاجپوری رحمۃ اللہ علیہ

مکرمی زید لطفکم!

سلام مسنون! سعودیہ کے متعلق حضرت مولانا منظور نعمانی صاحب دامت برکاتہم نے خوب وکالت کی ہے، تاہم ہندوستان اور پاکستان وغیرہ میں بعض حضرات کا اصرار ہے کہ سعودیہ حساب پر چلتے ہیں رویت اور شہادت محض عقلی تسلی ہے، اس صورت میں اس پر مدار رکھنا بہر حال سبب خلفشار ہوگا۔ هذا ما ظهر لی الان. فقط والسلام۔

احقر سید عبد الرحیم لاجپوری غفرلہ

دیوبند سے مولانا سعید صاحب کا خط ہے بھائی عبد الاحد سلمہ کو کاتب کے سلسلہ میں جواب لکھ دیا ہے، اغلب یہ ہے کہ اثبات میں دیا ہوگا۔ کتابت شدہ کاپیاں اور مسودہ فراہم کرنے کی سعی کیجیے۔

سید عبد الرحیم

دوربین سے رویتِ ہلال

سوال: دوربین سے چاند دیکھنا کیسا ہے؟ ممکن ہے آنکھوں سے نظر نہ آئے اور دُوربین سے نظر آجائے، تو کیا دوربین سے نظر آنے کے بعد رمضان کا فرض روزہ رکھا جاسکتا ہے؟ اور کیا یہ "صوموا لرویته" کے خلاف نہ ہوگا؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

اس مسئلہ پر تفصیلی کلام حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے، حدیث پاک "صوموا لرویته" الخ پیش کر کے تحریر فرماتے ہیں: "جس کا حاصل یہ ہے کہ: ریاضی کی تدقیقات اور ہیئت ونجوم کے حسابات میں جائے بغیر ہر شہر کے آدمی سادہ طور پر اپنی اپنی جگہ پر چاند دیکھنے کی کوشش کریں، چاند نظر نہ آئے تو تیس دن پورے کر کے مہینہ ختم کرلیں، چاند دیکھنے کے لیے اہتمام بھی صرف اتنا کہ کسی ایسی جگہ جہاں مطلعِ قمر میں کوئی چیز حائل نہ ہو، کھڑے ہو کر دیکھ لیں، اس سے زیادہ اہتمام کو پسند نہیں فرمایا"۔ (آلات جدیدہ ۱۷۳)

آگے فرماتے ہیں: "عہدِ رسالت اور خلافتِ راشدہ اور قرونِ خیر کے اس تعامل کی بناء پر ہمارے نزدیک کسی طرح مستحسن اور پسندیدہ نہیں کہ ہوائی جہازوں میں اڑکر (یا دوربین کے ذریعہ) چاند دیکھنے کا اہتمام کیا جائے"۔ (۱۷۴)

اپنے ایک دوسرے رسالہ "رویتِ ہلال" میں تحریر فرماتے ہیں: "حاصل اس ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ہوا کہ تمام احکامِ شرعیہ جو چاند کے ہونے یا نہ ہونے سے متعلق ہیں، ان میں چاند کا ہونا یہ ہے کہ عام آنکھوں سے نظر آئے، معلوم ہوا کہ مدارِ احکام چاند کا افق پر وجود نہیں؛ بلکہ رویت ہے، اگر چہ چاند افق پر موجود ہو؛ مگر کسی وجہ سے قابلِ رویت نہ ہو تو احکامِ شرعیہ میں وجود کا اعتبار نہ کیا جاوے گا۔ (۱۶-۱۵)

اب یہ بات کہ دوربین کے ذریعہ چاند دیکھا گیا تو اس کا اعتبار ہوگا یا نہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر وہ چاند اس قدر تھا کہ بغیر دوربین کے دیکھنے والے بھی اگر

اہتمام وتوجہ سے کام لیتے تو انہیں نظر آجاتا تو اس صورت میں دور بین سے دیکھا گیا بھی معتبر ہوگا، ورنہ نہیں؛ اس لیے کہ بعض وہ دور بین جو آفتاب کی شعاع کو انسانی نگاہ کے درمیان حائل نہیں ہونے دیتی، ان کے ذریعہ تو چاند کسی بھی تاریخ کو دیکھا جاسکتا ہے۔ (ماخوذ از رویت ہلال ۱۳)

چناں چہ ہوائی جہاز سے متعلق اسی قسم کی ایک صورت کے متعلق حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اتفاقی طور پر کوئی ہوائی جہاز کا مسافر چاند دیکھ لے اور آکر شہادت دے تو اس کی شہادت قبول نہ کی جائے، کیوں کہ اس کی شہادت کو رد کرنے کی کوئی وجہ نہیں؛ بلکہ نیچے کی ہوا میں گرد وغبار اور بخارات کی وجہ سے مستبعد نہیں کہ چاند نظر نہ آئے اور بلند جگہ پر ہوا صاف ہونے کی وجہ سے نظر آجائے۔ کما قال الشامي: وقد یری الھلال من أعلی الأماکن مالا یری من الأسفل فلا یکون تفردہ بالرویۃ خلاف الظاھر (۲/ ۱۲۷) شرط یہ ہے کہ ہوائی پرواز اتنی اونچی نہ ہو کہ جہاں تک زمین والوں کی نظریں پہنچ ہی نہ سکیں؛ کیوں کہ شرعاً رویت وہی معتبر ہے کہ زمین پر رہنے والے اپنی آنکھوں سے اس کو دیکھ سکیں، اس لیے اگر بیس تیس ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کر کے کوئی شخص چاند دیکھ آئے، تو اس بستی کے لیے وہ رویت معتبر نہیں، جس سے عام انسان باوجود مطلع صاف ہونے کے اس کو نہیں دیکھ سکتے۔ (آلات جدیدہ ۱۷۴، ۱۷۵) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

غائبانہ خبروں سے اور ہوائی جہاز میں اڑ کر رویتِ ہلال کا شرعی حکم

سوال: (۱) ہمارے یہاں (بوتسوانہ) میں ۲۹/ شعبان اور ۲۹/ رمضان کو رویت نہ ہوسکی؛ نیز ہمارے پڑوسی ممالک مثلاً جنوبی افریقہ، زامبیا، زمبابوے وغیرہ میں بھی رویت نہ ہوئی؛ البتہ ملاوی جو ہمارے ملک سے تقریباً ہزار سے ڈیڑھ ہزار میل دور ہے، وہاں رویت ہوئی، اور ہمیں معتبر ذریعہ سے خبر ملی تو ہم ملاوی کی خبر سے عید الفطر کر سکتے ہیں یا نہیں؟ اس سے مطلع فرمائیں۔

(۲) ہوائی جہاز کے ذریعہ فضاء میں جا کر رمضان اور عید کے چاند کو تلاش کر سکتے ہیں یا نہیں؟

(۳) زمین پر رویت نہ ہوسکی؛ البتہ دو معتبر حضرات نے ہوائی جہاز کے ذریعہ فضاء میں جا کر رویت کی تو اس رویت کی وجہ سے عید اور رمضان کر سکتے ہیں یا نہیں؟ اس سے مطلع فرمائیں۔

(۴) مطلع ہمارے یہاں صاف تھا اور رویت نہ ہوسکی، تو ہم رویت کے سلسلے میں دوسرے شہروں اور ملکوں میں تحقیق کر سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً

(۱) ہلال رمضان کے علاوہ عید، بقر عید یا کسی دوسرے مہینہ کے لیے ثبوتِ ہلال باقاعدہ شہادت کے بغیر نہیں ہوسکتا، اور شہادت کے لیے حاضر ہونا لازمی ہے، غائبانہ

خبروں کے ذریعہ شہادت ادانہیں ہوسکتی، خواہ وہ قدیم طرز کے آلات خبر رسانی خط وغیرہ ہوں یا جدید طرز کے ریڈیو ٹیلیفون وغیرہ۔ (رویتِ ہلال ص ۵۰ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ)

اس لیے محض ملاوی کی خبر پر آپ حضرات کے لیے عیدالفطر کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

② ③ رویتِ ہلال کے لیے شریعتِ مطہرہ نے جس طریقہ کی نشان دہی فرمائی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہوائی جہاز میں اڑ کر چاند تلاش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، اس قسم کا اہتمام شرعاً مطلوب نہیں، اس کے باوجود اگر کچھ لوگوں نے اس طرح چاند دیکھ کر اگر اس کی شہادت دی، تو شریعتِ مطہرہ کے مقرر فرمودہ ضابطۂ شہادت اور ثبوتِ رویت کے قانون کا لحاظ کرتے ہوئے اس شہادت پر عمل ہوسکتا ہے۔ (ماخوذ از قدیم نظام الفتاویٰ ۱/ ۲۲۸،۲۲۹)

④ یہ طریقہ بھی شرعاً مطلوب نہیں ہے۔ (فتاویٰ رحیمیہ ۴/ ۱۱۳) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۹/ شوال المکرم ۱۴۰۸ھ

ثبوتِ رؤیتِ ہلال میں آلاتِ رصدیہ اور فلکی حساب معتبر نہیں

محترم المقام استاذ المکرم حضرت مولانا مفتی احمد صاحب خانپوری

دامت برکاتکم و مد ظلکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوں گے، میں بھی الحمدللہ حضرت والا کی دعا اور اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے خیر وعافیت سے ہوں۔

غرض تحریر اینکہ امسال برطانیہ میں سعودی کی ۲۹ شعبان کی شام کو بعد نماز مغرب تین حضرات نے چاند دیکھنے کا دعوی کیا ہے، جبکہ فلکیاتی اعتبار سے اس دن رؤیت کا کوئی امکان نہ تھا بلکہ چاند غروب آفتاب سے پہلے ہو چکا تھا، ایسی حالت میں اکی دکی گواہی کی بنیاد پر رمضان کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے؟ اس سلسلہ میں حضرت والا کے فتاوی کی عبارت اور دیگر اکابرین کی عبارت میں بظاہر تعارض نظر آ رہا ہے۔

چوں کہ جو حضرات سعودیہ کے متبعین ہیں وہ آپ کی عبارت سے اپنا موقف اور منشاء ثابت کرنے میں اور سعودیہ کی تائید میں کہ وہاں کی رؤیت کا نظام درست ہے اس کا سہارا لینے کا قوی امکان ہے اور ایسی گواہیاں کہیں سے بھی لا کر پیش کر دیں گے، اس لیے ایک استفتاء ارسال خدمت ہے تاکہ اس کی توضیح وتشریح وانطباق فرما دیں۔ امید ہے کہ جناب عنایت فرما کر ممنون فرمائیں گے۔

احقر یوسف ساچا باٹلی انگلینڈ

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

آپ کے سوال کا خلاصہ احقر نے یہ سمجھا ہے کہ رؤیت ہلال کے ثبوت میں فلکی حساب کو دخل ہے یا نہیں؟ اگر دخل ہے تو محمود الفتاوی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فلکی حساب کا ثبوتِ رؤیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا یعنی ثبوت رؤیت صرف اور صرف شہادتِ شرعیہ میں منحصر ہے، صرف فلکی حساب سے ثبوت رؤیت نہیں ہوسکتا۔ جبکہ دیگر اکابر علماء کے فتاوی سے معلوم ہوتا ہے کہ ثبوت رؤیت میں فلکی حساب کو بڑا دخل ہے۔

اصل جواب سے پہلے چند امور بطور تمہید پیش کئے جاتے ہیں:

(الف)عن ابن عمر قال قال رسول الله ﷺ:انا امة امية لانكتب ولا نحسب،الشهر هكذا وهكذا وهكذا وعقد الابهام في الثالثة ثم قال الشهر هكذا وهكذا وهكذا يعني تمام الثلاثين متفق عليه.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ہم تو امت امیہ ہیں، اوقات کی تعیین کے لیے حساب کتاب کی ضرورت نہیں، (بس اتنا جان لو کہ) مہینہ کبھی اتنا، اتنا، اتنا ہوتا ہے، دونوں ہاتھوں سے اشارہ فرمایا اور تیسری مرتبہ ایک انگلی بند فرمائی یعنی انتیس کا۔ اور کبھی اتنا، اتنا، اتنا ہوتا ہے یعنی پورے تیس دن کا۔

(فتاوی بینات ۳/۱۹)

حدیث بالا میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لا نكتب ولا نحسب (ہم حساب کتاب نہیں کیا کرتے) کہہ کر اوقات کی تعیین کے باب میں حسابی تخمینوں کی حوصلہ شکنی فرمائی، کہیں دونوں ہاتھوں کے اشارہ سے الشهر هكذا وهكذا (مہینہ اتنا اتنا اور اتنا ہوتا ہے) کہہ کر ماہ وسال کے سلسلہ میں حساب پر بالکلیہ بے اعتمادی کا اظہار فرمایا؛ ورنہ ظاہر ہے کہ اس مضمون کو سمجھانے کے لیے مہینہ کبھی ۲۹ کا ہوتا کبھی ۳۰ کا، دونوں ہاتھوں کو چھ دفعہ اٹھانے اور ھکذا کا لفظ چھ دفعہ دہرانے کی بہ نسبت ۲۹، ۳۰ عدد مختصر بھی تھا اور واضح بھی، اور آپ کے مخاطب ان ہندسوں سے نا آشنا بھی نہیں تھے۔

اكمال المعلم شرح صحيح مسلم لابي عبدالله محمد بن خلفه الوشتاني الأبي المالكي (المتوفى ٨٢٧)٣/٢٢٤ط. (دار الكتب العلمية١٣٣٧) مانصه: وفي احاديث الاشارة الارشاد الى تقريب الاشياء بالتمثيل وهو الذي قصده ﷺ ولم يصنع ذلك لأجل ما وصفهم به من الامية لايحسبون

ولا يكتبون لأنهم لا يجهلون الثلاثين والتسع والعشرين مع ان التعبير عنها باللفظ اخف من الاشارة المكررة وانما وصفهم بذلك سدا لباب الاعتداد بحساب المنجمين الذى تعتمده العجم فى صومها وفطرها وفصولها.(حاشيه فتاوى بينات ٣ /٢٦)

(٢) عن عبد الله بن عمر ان رسول الله ﷺ ذكر رمضان فقال لاتصوموا حتى تروا الهلال، لاتفطروا حتى تروه فان غم عليكم فاقدروا له (متفق عليه)

حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آں حضرت ﷺ نے رمضان کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا (انتیس کا) چاند دیکھے بغیر نہ تو روزہ رکھنا شروع کرو اور نہ چاند دیکھے بغیر روزے موقوف کرو اور ابر یا غبار کی وجہ سے نظر نہ آئے تو اس کے لیے (تیس دن کا) اندازہ رکھو۔(ایضاً:۱۴)

حدیث بالا میں رؤیت کے بغیر کسی نوع کے حسابی تخمینہ پر اعتماد کرتے ہوئے روزہ رکھنے اور افطار کرنے سے صاف صاف منع فرمایا، نیز رؤیت سے مراد سر کی آنکھوں سے چاند دیکھنا مراد ہے، آسمان میں چاند کا وجود اور امکان کافی نہیں۔

خود ماہرین فلکیات کے یہاں بھی رؤیت ہلال کے معنی سر کی آنکھوں سے دیکھنا ہی آتے ہیں، مزید یہ کہ ان کے یہاں اس رؤیت کے دو درجے ہیں۔ طبعی، ارادی۔ اگر ہلال افق سے اتنی بلندی پر ہو کہ وہ بلا تکلف دیکھا جاسکے اسے وہ ’’طبعی رؤیت‘‘ قرار دیتے ہیں اور اگر اتنی بلندی پر نہ ہو بلکہ اتنا نیچے اور باریک ہو کہ اعلیٰ قسم کی دوربینوں کے بغیر اس کا دیکھنا ممکن نہ ہو اسے ’’رؤیت ارادی‘‘ کا نام دیا جاتا ہے۔ فلکیات کی

تصریحات کے مطابق قابل اعتبار طبعی رؤیت ہے نہ کہ ارادی۔ اور حضرات فقہاء کرام رحمۃ اللہ علیہم جو شریعت اسلامیہ کے حقیقی ترجمان ہیں وہ بھی اسی پر متفق ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد "صوموا لرؤيته وأفطروا لرؤيته" میں رؤیت حسی یعنی سر کی آنکھوں سے دیکھنا ہی مراد ہے اور اسی پر تمام مسلمانوں کا اجماع واتفاق ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ رویتِ ہلال کے معنیٰ سر کی آنکھوں سے دیکھنا قطعی طور پر متعین ہیں، اس میں کسی شک شبہ اور تردید کی گنجائش نہیں۔ یہی معنی آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مبارک عہد سے آج تک لیے جاتے رہے ہیں، یہی ائمہ لغت کی تصریح سے میل کھاتے ہیں، یہی فلکیات کی اصطلاح کے مطابق ہیں، یہی مزاج شناشانِ نبوت (فقہائے کرام رحمۃ اللہ علیہم) نے حدیث سے سمجھے ہیں اور چودہ صدیوں کی امت مسلمہ بھی اسی پر متفق ہے۔ (ایضاً:۱۱، ۱۲، ۱۳)

(ب) اگر یہ کہا جائے کہ شریعت نے احکام ہلال کا مدار رؤیت پر کیوں رکھا، فلکیاتی تحقیق پر کیوں نہیں رکھا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بحیثیت مسلمان ہمارا کام یہ ہے کہ ہم اچھی طرح بلا چوں وچرا شرعی حکم مان لیں اور عمل کریں۔

حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہ تحریر فرماتے ہیں:

اس میں تو کوئی شک شبہ نہیں کہ اصل مدار، ثبوت احکام شرعیہ فرعیہ کا، نصوص شرعیہ ہیں، جن کے بعد ان کے امتثال اور قبول کرنے میں ان میں کسی مصلحت و حکمت کے معلوم ہونے کا انتظار کرنا بالیقین حضرت حق سبحانہ وتقدس کے ساتھ بغاوت ہے۔ (احکام اسلام عقل کی نظر میں:۲۵)

لیکن اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ احکام شرعیہ میں بہت سے مصالح اور اسرار

مستور ہیں، ان کا معلوم ہو جانا بعض طبیعتوں کے لیے عمل کے لیے معین اور ضعفاء کے لیے تسلی بخش ثابت ہوتا ہے، اسی بناء پر احکام ہلال کا مدار رؤیت پر رکھنے کی مصلحتیں بیان کی جاتی ہیں، یہ مصالح صرف رؤیت پر مرتب ہو سکتی ہیں فلکیات پر نہیں۔

(۱) دوسری قوموں کی ماہ وسال کا مدار تقویمی حسابوں پر تھا، شارع نے اس امت کی انفرادیت کو محفوظ رکھنے کے لیے جس طرح اور بہت سی چیزوں میں ان کی مشابہت سے امت کو بچانا چاہا اسی طرح ان کی تقویمی مشابہت سے بھی امت کو محفوظ رکھنا چاہا؛ اس لیے ان کو ایک مستقل نظام تقویم دیا۔

(۲) یا ہو سکتا ہے کہ چوں کہ دوسرے حسابی طریقوں سے سال کی تعیین فطری اور تحقیقی نہیں تھی بلکہ اختراعی اور تقریبی تھی، چناں چہ انہیں اس کی کمی بیشی کو برابر کرنے لیے ''لیپ'' کی اصطلاح ایجاد کرنی پڑی، اس کے برعکس اسلام دین فطرت تھا، اس نے چاہا کہ امت اسلامیہ کے ماہ وسال کی تعین کے لیے ''رؤیت'' اور مشاہدہ کا فطری طریقہ مقرر کیا جائے، کیوں کہ یہ اختراعی اور تقریبی طریقے اس کی فطرت سے میل نہیں کھاتے تھے۔

(۳) یا ممکن ہے اس امر کی رعایت رکھی گئی ہو کہ اسلام کے پورے نظام کی بنیاد تکلف اور تعمق پر نہیں ہے بلکہ سادگی اور سہولت پر رکھی گئی ہے، اس لیے اسلام کے نظام تقویم کو بھی مشاہدہ اور رؤیت جیسے آسان اور سادہ اصول پر مبنی کیا گیا؛ تاکہ اس نظام کے ''جز وکل'' میں مناسبت رہے اور اس باب میں امت تکلیف اور مشقت میں مبتلا نہ ہو جائے۔

(۴) یا ممکن ہے کہ اس چیز کا لحاظ رکھا گیا ہو کہ نظام تقویم بہر حال اوقات کی تعیین

کا ایک ذریعہ ہے اور جو قوم ذرائع میں منہمک ہو کر رہ جائے اکثر و بیشتر مقاصد اس کی نظر سے اوجھل ہو جاتے ہیں اور فطری طور پر ان کی صلاحیتیں ذرائع ہی میں کھپ کر ضائع ہو جاتی ہیں، اس لیے چاہا گیا کہ امت مسلمہ کو نظام تقویم ایسا دیا جائے جس میں منہمک ہو کر مقصدی صلاحیتیں کھو بیٹھنے کا ذرا بھی اندیشہ نہ ہو، بس آنکھ کھولی، چاند دیکھ لیا، تقویم درست ہوگئی اور سب اپنے اپنے کام میں لگ گئے، نہ ضرب کی ضرورت نہ تقسیم کی، نہ محکمۂ موسمیات قائم کرنے کی ضرورت نہ اس پر ریسرچ کی۔

⑤ یا ممکن ہے کہ یہ امر پیش نظر ہو کہ اس امت میں امیر ہوں گے، غریب بھی، عالم بھی، جاہل بھی، مرد بھی اور عورتیں بھی، اور بیشتر عبادات اور معاملات کا مدار نظام تقویم پر ہے، اس لیے چاہا گیا کہ جس طرح نظام تقویم سے متعلقہ احکام کے مکلف امت کے سب ہی طبقات ہیں اسی طرح ان کو نظام تقویم بھی ایسا دیا جائے جس پر ہر شخص اپنے مشاہدہ کی روشنی میں پورے شرح صدر کے ساتھ یقین کر سکے۔

⑥ یا ممکن ہے کہ شارع کو جو یقین ہلال کے باب میں مطلوب ہے وہ رؤیت اور مشاہدہ پر ہی مرتب ہو سکتا ہے، اس کی نظر میں حسابی جنتری اس یقین کے پیدا کرنے میں ناکافی ہو۔

⑦ یا ہو سکتا ہے کہ شارع نے اس امر کو پسند نہ فرمایا ہو کہ روزہ و افطار سب کریں؛ مگر ان کے اوقات کی تعیین ایک خاص گروہ کے رحم و کرم پر ہو، اس لیے نظام تقویم ایسا مقرر فرمایا کہ ایک عامی بھی اپنے وقت کی تعیین ٹھیک اسی طرح کر سکتا ہے جس طرح ایک ماہر فلکیات، اور بدوی بھی اسی طرح اپنے اوقات کا حساب لگا سکتا ہے جس طرح ایک شہری؛ بلکہ بعید نہیں کہ ماہر فلکیات یا عالم کی نظر کمزور ہو اور ایک عامی بدوی کی نظر

تیز ہو، اس صورت میں خود ماہر فلکیات یا عالم کو مسکین ان پڑھ کی طرف رجوع کرنا پڑے۔ (فتاویٰ بینات ۳/۲۹، ۳۰)

(ج) ہر دور میں فقہاء نے رمضان وعیدین کا دارومدار رؤیت ہلال پر رکھا ہے، تدقیقات فلسفیہ اور قواعد ریاضیہ یا آلات رصدیہ اور حساب پر نہیں رکھا۔ ذیل میں معتبر کتب کی چند عبارتیں پیش کی جاتی ہیں:

چوتھی صدی کے مشہور حنفی فقیہ مفسر اور اصولی عالم امام ابوبکر جصاص رازی رحمۃ اللہ علیہ (م ۳۷۰ھ) اپنی تفسیر میں تحریر فرماتے ہیں:

وقد اختلف فی معنی قول النبي ﷺ فان غم علیکم فاقدروا له فقال القائلون اراد به اعتبار منازل القمر فان کان فی موضع القمر لو لم یحل دونه سحاب وقترة وروی یحکم بحکم الرؤیة فی الصوم والافطار وان کان علی غیر ذلك لم یحکم له بحکم الرؤیة وقال آخرون فعدوا شعبان ثلاثین یوما اما التا ویل الاول فساقط الاعتبار لامحالة لایجابه الرجوع الی قول المنجمین ومن تعاطی معرفة منازل القمر ومواضعه و هو خلاف قول الله تعالیٰ ﴿یسئلونك عن الاهلّة قل هی مواقیت للناس﴾ فعلق الحکم فیه برویة الاهلة ولما کانت هذه عبادة تلزم الکافة لم یجزان یکون الحکم فیه متعلقا بما لایعرفه الا خواص من الناس ممن عسی لا یسکن الی قولهم والتاویل الثانی هو الصحیح وهو قول عامة الفقهاء وابن عمر راوی الخبر وقد ذکر عنه فی الحدیث انه لم یکن یا خذ بهذا الحساب (احکام القرآن: ۱/ ۲۰۱، دارالکتب العربی بیروت)

پانچویں صدی کے مشہور حنفی فقیہ شمس الائمۃ الحلوانی رحمۃ اللہ علیہ (م ۴۴۸ھ)

فرماتے ہیں:

من قال بانه يرجع الى قول اهل الحساب عند الاشتباه بعيد واستدل بحديث من اتى كاهنا (الى قوله) الشرط عندنا فى وجوب الصوم والافطار رؤية الهلال ولا يوخذ فيه بقول المنجمين ثم رقم لمجدالائمة الترجمانى وقال فقد اتفق اصحاب ابى حنيفة والشافعى انه لا اعتماد على قول المنجمين فى هذا. (شرح منظومه ابن وهبان/١ ٩٢ مطبوعة الوقف المدنى ديوبند)

آٹھویں صدی کے مشہور فقیہ علّامہ عالم ابن علاء انصاری اندرپتی دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (م ۷۸۶ھ) فرماتے ہیں:

ذكر فى التهذيب فى كتاب الصوم: يجب صوم رمضان برؤية الهلال او باستكمال شعبان ثلاثين، ولا يجوز تقليد المنجم فى حسابه لا فى الصوم ولا فى الافطار وهل للمنجم ان يعمل بحساب نفسه؟ ففيه وجهان احدهما انه يجوز والثانى لا يجوز.

(الفتاى التاتارخانيه ٢/ ٣٥٧ مطبوعه مجلس دائرة المعارف عثمانيه حيدرآباد)

نویں صدی کے مشہور محدث علامہ ابن حجر عسقلانی شافعی رحمۃ اللہ علیہ (م ۸۵۲ھ) تحریر فرماتے ہیں:

والمراد بالحساب هنا حساب النجوم وتسييرها، ولم يكونوا يعرفون من ذلك ايضاً الا النزراليسير، فعلق الحكم بالصوم وغيره بالرؤية لرفع الحرج عنهم فى معاناة حساب التسيير واستمر الحكم فى الصوم ولو حدث بعدهم من يعرف ذلك، بل ظاهرالسياق يشعر بنفى تعليق الحكم بالحساب اصلاً، ويوضحه قوله فى ا لحديث ا لماضى "فان غم عليكم فاكملوا العدة ثلاثين" ولم يقل فسئلوااهل الحساب، والحكمة

فیه کون العدد عند الاغماء یستوی فیه المکلفون فیرتفع الاختلاف والنزاع عنهم، وقد ذهب قوم الی الرجوع الی اهل التسییر فی ذلك وهم الروافض،ونقل عن بعض الفقهاء موافقتهم، قال الباجی:واجماع السلف الصالح حجة علیهم،وقال ابن بزیزة: وهو مذهب باطل فقد نهت الشریعة عن الخوض فی علم النجوم لانها حدس وتخمین لیس فیها قطع ولاظنّ غالب،مع انه لو ارتبط الامر بها لضاق اذ لا یعرفها الا القلیل.(فتح الباری٤/ ١٢٧ مطبوعه دار المعرفة بیروت)

دسویں صدی کے مشہور حنفی فقیہ ابن نجیم مصری رحمۃ اللہ علیہ (م ۹۷۰ھ) اپنی مشہور کتاب "النهر الفائق" میں تحریر فرماتے ہیں:

ان صوم رمضان لا یلزمه الا باحد هذین فلا یلزم بقول المؤقتین انه یکون فی السماء لیلة کذا وان کانوا عدولا فی الصحیح کما فی الایضاح، قال مجد الائمة (الترجمانی) وعلیه اتفق اصحاب ابی حنیفة و الشافعی الخ (النهر الفائق ٢ /١٠ مطبوعه دار الکتب العلمیة بیروت)

لاعبرة بقول المنجمین قال فی غایة البیان و من قال یرجع فیه الیٰ قولهم فقد خالف الشرع لانه روی عنه ﷺ انه قال من اتی کاهنا او منجما فصدقه بما قال فهو کافر بما انزل علی محمد.

(البحر الرائق ٢ /٢٨٤ دارالمعرفه بیروت)

گیارہویں صدی کے مشہور حنفی فقیہ علامہ عبد الرحمٰن بن محمد رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۰۷۸ھ) -جوداماد کے لقب سے مشہور ہیں-تحریر فرماتے ہیں:

وفی القهستانی ان ما قال اهل التنجیم غیر معتبر فمن قال انه

يرجع فی ذلك الیٰ قولهم فقد خالف الشرع.

(مجمع الانهر فی شرح ملتقی الابحر: ۱/۲۳۷ مطبوعه دار احیاء التراث بیروت)

بعینہ یہی عبارت ''جامع الرموز: ۱/۳۵۶ مطبوعہ ایچ ایم کراچی'' میں ہے۔

بارہویں صدی کے مشہور عالم ربانی اسرار شریعت کے ماہر حضرت شاہ ولی صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۱۷۶ھ) رقمطراز ہیں:

مبنی الشرائع علی الامور الظاهرة عند الامیین دون التعمق والمحاسبات النومية، بل الشريعة واردة باخمال ذكرها وهو قوله ﷺ: انا امة امية لا نكتب ولا نحسب.

(حجة الله البالغة۲/ ۵۱ مطبوعة ادارة الطباعة المنيرية دمشق)

تیرہویں صدی کے مشہور فقیہ عالم خاتم الفقہاء علامہ سید محمد امین ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۲۵۲ھ) تحریر فرماتے ہیں:

(لا عبرة بقول الموقتين) ای فی وجوب الصوم علی الناس بل فی المعراج لايعتبر قولهم بالاجماع. (رد المحتار علی الدر المختار۲/ ۱۰۰ مطبوعة كوئثة)

علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک رسالہ ''تنبيه الغافل و الوسنان علی احكام هلال رمضان'' تحریر فرمایا ہے، اس میں ایک مستقل فصل قائم فرما کر اس مسئلہ پر کلام کیا ہے، جس میں مذاہب اربعہ کی معتبر کتابوں کی عبارتوں سے اجماع ثابت کیا ہے کہ رؤیت ہلال میں اہل حساب کا قول معتبر نہیں، ملاحظہ کیجئے:

الفصل الثالث فی بيان حكم قول علماء النجوم و الحساب: فنقول قد صرح علماؤنا و غيرهم بوجوب التماس الهلال ليلة الثلاثين من شعبان فان رأوه صاموا والا اكملوا العدة فاعتبروا الرؤية او اكمال

العدة اتباعا للاحاديث الآمرة بذلك دون الحساب والتنجم وقد اتفقت عبارات المتون وغيرها من كتب علمائنا الحنفية على قولهم يثبت رمضان برؤية هلاله و بعد شعبان ثلاثين (الى قوله)فلا يلزم بقول الموقتين انه يكون فى السماء ليلة كذا وان كانوا عدولا فى الصحيح كما فى الايضاح قال مجد الأئمة وعليه اتفق اصحاب ابى حنيفة الا النادر و الشافعى الخ (رسائل ابن عابدين ١/ ٢٤٤، ٢٤٥)

آگے مالکیہ کا مذہب نقل کرتے ہوئے لکھا ہے:

وا ما عند المالكية ففى مختصر الشيخ خليل ا نه لا يثبت بقول المنجم الخ.

اسی صفحہ پر شافعیہ کے بارے میں رقمطراز ہیں:

(واما عند الشافعية) ففى الانوار للاردبيلى ولا يجب بمعرفة منازل القمر لا على العارف بها ولا غيره انتهى وفى ينابيع الاحكام ولا عبرة بقول المنجم مطلقا فلا يصوم وان علم بالحساب انه اهل على الاظهر اذ تحكيمه قبيح شرعاً. (ايضاً١/ ٢٤٧)

حنابلہ کا مسلک بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

ففى الغاية وشرحهامن باب صلاة الكسوف ولاعبرة بقول المنجمين فى كسوف ولا غيره مما يخبرون به ولا يجوز العمل به لا نه من الرجم بالغيب فلا يجوز تصديقهم فى شئ من المغيبات انتهى (ايضاً١ /٢٤٩)

چودہویں صدی میں سائنس نے خوب ترقی کی۔ چاند، سورج اور سیاروں کے بارے میں نت نئی تحقیقات پیش کیں، قرآن اور احادیث کے بہت سے وہ واقعات

اور احوال جو سابق دور میں سمجھ سے بالاتر تھے، جدید سائنس کی تحقیقات نے ان کا سمجھنا آسان کر دیا۔ بایں ہمہ چودھویں صدی کے علماء ومفتیان کرام نے بھی رؤیت ہلال کا دارومدار شرعی ثبوت پر رکھا، حساب وآلات رصدیہ پر نہیں۔

ذیل میں چودھویں صدی کے علماء کرام ومفتیان کرام کی عبارت پیش کی جاتی ہے:

امام العصر علامہ انورشاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۳۵۲ھ) فرماتے ہیں:

قوله (فان غم عليكم فا قدروله)فالفطرو الصوم عندنا يدور بالرؤية حقيقة،او نقلها المعتبر شرعاً، ولاعبرة عندنا بالتقويم، الخ.

(فیض الباری ۳ /۱۵۲ مطبوعه المجلس العلمی دابیل)

خاتم الفقہاء حضرت مولانا محمد عبدالحی فرنگی محلی لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۳۰۴ھ) تحریر فرماتے ہیں:

احادیث صحیحہ بکثرت اس باب میں وارد ہیں کہ مدار صوم وافطار رؤیت ہے، اس وجہ سے بدون ثبوت رؤیت کے صرف ارباب توقیت کے قول پر اعتماد کرنا ناجائز ہوگا اور صحیح اور معتبر قول انہیں فقہاء کا ٹھہرے گا جو ارباب توقیت کے قول پر اعتماد نہیں کرتے ہیں۔

قال النبی ﷺ صوموا لرؤيته وافطروا لرؤيته فان اغمى عليكم فاكملوا العدد (اخرجه مسلم)

وقال ﷺ الشهر تسع وعشرون ليلةً فلا تصوموا حتى تروه فان غم عليكم فاكملوا العدة ثلاثين (اخرجه البخاری)

وقال ﷺ: صوموا لرؤيته وافطروا لرؤيته فان حالت دونه غيابة فاكملوا ثلثين يوما (اخرجه الترمذی)

وقال ﷺ انا امة امية لا نكتب ولا نحسب الشهر هكذا وهكذا وهكذا. (الحديث)

الغرض ان احادیث سے یہ ثابت ہے کہ شرعاً مدار صوم وافطار رؤیت ہے، ورنہ اکمال سی یوم۔ پس اعتبار قول منجمین میں مخالفت احادیث کی لازم آتی ہے اور قول ارباب توقیت بوجہ ورودان روایات کے حجت ملزمہ نہیں ہوسکتا۔

(مجموعہ فتاویٰ کتاب الصوم:۱/ ۲۸۰، ۲۸۱، مطبوعہ یوسفی پریس لکھنؤ)

مولانا عبدالحی صاحب لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ نے رؤیت ہلال کے موضوع پر ایک مستقل رسالہ "القول المنشور فی هلال خير الشهور" تحریر فرمایا اس میں لکھتے ہیں:

لااعتبار لحساب المنجمين والحاسبين في الهلال وقد اختلفوا في ذلك، فالذي عليه الاكثرون هو عدم اعتبار قولهم لا في حق نفسه ولا في حق غيره (مجموعه رسائل لكهنوى ٢/ ٥)

دارالعلوم کے سب سے پہلے مفتی حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۳۴۷ھ) کے کئی فتاویٰ اس پر شاہد ہیں، فرماتے ہیں:

"اصل چیز رؤیت وشہادت ہے، علم ہیئت کے قواعد اور جنتری پر دارومدار غلط ہے، ملاحظہ کیجئے: فتاوی دارالعلوم دوسرا باب رؤیت ہلال کے ذیل میں عناوین: (۱) حساب ہیئت کی بنا پر روزہ شروع کردینا کیسا ہے؟ (۲) باعتبار ہیئت چاند کا اعتبار درست ہے یا نہیں؟ (فتاوی دارالعلوم مدلل:۶/ ۳۶۷ تا ۳۷۰ مطبوعہ دارالعلوم دیوبند)

عزیز الفتاوی میں بعنوان ثبوت ہلال کے بارہ میں قواعد ریاضیہ شرعاً معتبر نہیں۔

(عزیز الفتاوی:۱/ ۳۸۳، مطبوعہ دارالاشاعت کراچی)

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۳۷۷ھ) کا ایک فتویٰ

ملاحظہ کیجئے:

سوال: کیا فرماتے ہیں علماءِ دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ اس ملک جنوبی افریقہ میں رؤیت ہلال کے متعلق جدید تعلیم یافتہ حضرات کا اصرار ہے کہ چاند کی پیدائش کے متعلق سائنس جدید نے جونئی دریافت اور تحقیق کی ہے اسی پر عمل کرتے ہوئے رمضان وعید وغیرہ کرتے رہنا چاہیے۔ اور ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ''صوموا لرؤیتکم و افطروا لرؤیتکم'' پر اس وقت تک عمل ضروری تھا جب تک اس تحقیق جدید کا انکشاف نہیں ہوا تھا مگر اب مذکورہ حدیث پر عمل متروک ہونا چاہئے اور چاند کی پیدائش کی پیروی کرنی چاہیے، جو تحقیق کبھی غلط نہیں ہوسکتی ہے، کیا ان حضرات کی دلیل قابل تسلیم ہے؟

جواب: یہ کوئی نئی تحقیق اور نیا نظریہ نہیں ہے۔ سائنس قدیم میں بھی اسکی تحقیق ہو چکی ہے لیکن احکام کی بنیاد پیدائش ہلال پر نہیں رکھی گئی، بلکہ رؤیت ہلال پر رکھی گئی ہے، روزے، حج، زکوۃ وغیرہ جملہ مسائل اسی رؤیت پر مبنی ہیں، پیدائش ہلال پر نہیں۔

ولاعبرة بقول الموقتين ولو عدولاً على المذهب (در مختار ۲/ ۳۸۷)

(فتاویٰ شیخ الاسلام: ۵۶: ۵۷ مطبوعہ مکتبہ دینیہ دیوبند)

مفتیٔ اعظم پاکستان حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۳۹۶ھ) کا ایک رسالہ ''رؤیت ہلال'' کے نام سے ہے۔ اس میں عنوان ''ریاضی کے حسابات اور آلات رصدیہ کے نتائج بھی یقینی نہیں'' کے ذیل میں لکھا ہے:

چوتھی صدی ہجری کا مشہور اسلامی فلاسفر اور ماہر نجوم وفلکیات ابوریحان البیرونی جو شہاب الدین غوری کے زمانہ میں ایک مدت دراز تک ہندوستان میں بھی رہا ہے

اوران فنون کا بے نظیر امام مانا جاتا ہے۔اس نئی روشنی اور نئی تحقیقات کے دور میں بھی اس کی امامت سب کے نزدیک مسلّم ہے، روسی ماہرین نے اس کی تحقیقات سے راکٹ وغیرہ کے مسائل میں بڑا کام لیا ہے۔

ان کی مشہور کتاب ”الآثار الباقية عن القرون الخالية“ ایک جرمن ڈاکٹر سی ایڈورڈ سخاؤ کے حاشیہ کے ساتھ لیزک میں چھپ کر شائع ہوئی ہے اس میں آلات رصدیہ کے ان نتائج کے غیر یقینی ہونے کے مسئلہ کو تمام ماہرین فن کا اجماعی اور اتفاقی نظریہ بتلایا ہے۔اس کے الفاظ یہ ہیں:

ان علماء الهيئة مجمعون علٰى ان المقادير المفروضة فى اواخر اعمال رؤية الهلال هى ابعاد لم يوقف عليها الا بالتجربة وللمناظر احوال هندسية يتفاوت لاجلها المحسوس بالبصر فى العظم والصغر و فى ما اذ تأملها متأمل منصف لم يستطع بت الحكم على وجوب رؤية الهلال اوامتناعها.(آثار باقيه، ص:۱۹۸،طبع ۱۹۲۳ء،ليزك)

ترجمہ: علمائے ریاضی وہیئت اس پر متفق ہیں کہ رؤیت ہلال کے عمل میں آنے کے لیے جو مقداریں فرض کی جاتی ہیں وہ سب ایسی ہیں جن کو صرف تجربہ ہی سے معلوم کیا جاسکتا ہے۔اور مناظر کے احوال مختلف ہوتے ہیں جن کی وجہ سے آنکھوں سے نظر آنے والی چیز کے سائز میں چھوٹے بڑے ہونے کا فرق ہوسکتا ہے۔اور فضائی وفلکی حالات ایسے ہیں کہ ان میں جو بھی ذرا غور کرے گا تو رؤیت ہلال کے ہونے یا نہ ہونے کا کوئی قطعی فیصلہ ہرگز نہ کرسکے گا۔

اور کشف الظنون میں بحوالۂ زیج شمس الدین محمد بن علی خواجہ کا چالیس سالہ تجربہ

یہی لکھا ہے کہ ان معاملات میں کوئی صحیح اور یقینی پیشین گوئی نہیں کی جاسکتی جس پر اعتماد کیا جاسکے۔ (کشف الظنون ۲/۹۶۹)

اور جب یہ ثابت ہو گیا کہ رصد گاہوں اور آلات رصدیہ کے ذریعہ حاصل کردہ معلومات بھی رؤیت ہلال کے مسئلہ میں کوئی یقینی فیصلہ نہیں کہلاسکتی، بلکہ وہ بھی تجرباتی اور تخمینی معاملہ ہے، تو اس اصول کے حکیمانہ اصول ہونے کی اور بھی تائید ہوگئی جو رسول امی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس معاملہ میں اختیار فرمایا کہ ان کاوشوں اور باریکیوں میں امت کو الجھائے بغیر بالکل سادگی کے ساتھ رؤیت ہونے یا نہ ہونے پر احکام شرعیہ کا مدار رکھ دیا جس پر ہر شخص ہر جگہ ہر حال میں آسانی سے عمل کرسکے۔ (رؤیت ہلال: ۳۰، ۳۲)

علامہ ظفر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۳۹۴ھ) تحریر فرماتے ہیں:

ویدل علی بطلان تاویلهم قوله ﷺ ”فان حال بينكم وبين منظره سحاب اوقترة فعدوا ثلاثين“، فامر عليه السلام بعد ثلاثين (مطلقاً) مع جواز الرؤية لو لم يحل بيننا وبينه سحاب او قترة، ولم يوجب الرجوع الى قول المنجمين، فا لقا ئل باعتبار منازل القمر وحساب المنجمين خارج عن حكم الشريعة وليس هذاالقول مما يسوغ الاجتهاد فيه، لدلالة الكتاب ونص السنة، واجماع الفقهاء بخلافه.

(احكام القرآن ۱/ ۱۹۱:۵ مطبوعه ادار القرآن والعلو م الاسلامية كراچی)

حضرت مولانا محمد یوسف بنوری صاحب رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۳۹۷ھ) نے بیان ان العبرة للرؤية لا للحساب عنوان کے ذیل میں لکھا ہے:

والعبرة عندالائمة الثلاثة للرؤية وما يقوم مقامها وعند بعضهم

يعتبر حساب منازل القمر عند اهل الحساب ايضاً كما ذكره فى العمدة. (معارف السنن ٦/ ٧)

فقیہ الامت حضرت مفتی محمود حسن گنگوہی نور اللہ مرقدہ (م ۱۴۱۷ھ) تحریر فرماتے ہیں:

احکام وارکان اسلام کو ایسے سادہ طریقہ پر قائم کیا گیا ہے جس کا سمجھنا بلا تکلف آسان ہو، ہیئت وحساب یا دیگر دقیق علوم پر قائم نہیں کیا گیا ہے کہ جن کے سمجھنے کے لیے بڑے آلات وتکلفات کی ضرورت پیش آئے۔ اگر ایسے علوم پر قائم کرنا مقصود ہوتا تو حضرت نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ان کی بھی وحی آتی اور آپ اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ان کی بھی تعلیم دیتے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ان کی تبلیغ واشاعت فرماتے۔ علامہ سبکی شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اہل توقیت کے قول کو معتبر مانا ہے مگر خود شوافع ابن حجر، رملی، شہاب، رحمہم اللہ تعالی وغیرہ نے ہی ان کی تردید کی ہے اور علامہ ابن عابدین رحمۃ اللہ علیہ نے "معراج" سے اجماع نقل کیا ہے کہ اہل توقیت کا قول معتبر نہیں۔ (فتاوی محمودیہ کراچی ۱۰/ ۱۱۸)

مفتیٔ گجرات حضرت سید مفتی عبد الرحیم لاجپوری رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۴۲۲ھ) اپنے ایک طویل فتوے میں تحریر فرماتے ہیں:

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مہینہ کی آمد کو رؤیت ہلال پر موقوف رکھا ہے، نئے چاند کے افق پر موجود ہونے یا اس کے نظر آنے کے صرف عقلی اور حسابی امکان کو دارومدار نہیں بنایا۔ (فتاوی رحیمیہ: ۷/ ۳۷۷ مطبوعہ رحیمیہ راندیر)

حضرت مولانا مفتی محمد یوسف لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۴۲۱ھ) فرماتے ہیں:

قمری مہینے کا شروع ہونا چاند دیکھنے پر موقوف ہے، فلکیات کے فن سے اس میں

اتنی مدد تو لی جاسکتی ہے کہ آج چاند ہونے کا امکان ہے یا نہیں، لیکن جب تک رؤیت کے ذریعہ چاند ہونے کا ثبوت نہ ہو جائے محض فلکیات کے حساب سے چاند ہونے کا فیصلہ نہیں ہوسکتا، مختصر یہ کہ چاند ہونے میں رؤیت کا اعتبار ہے، فلکیات کے حساب کا اعتبار بغیر رؤیت کے نہیں۔ (آپ کے مسائل اور ان کا حل ۳/۲۶۱ مطبوعہ نعیمیہ بکڈپو دیوبند)

فقیہ العصر حضرت مفتی رشید احمد صاحب لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۴۲۲ھ) فرماتے ہیں:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں اگرچہ ناخواندہ عوام کی اکثریت تھی مع ہذا حساب داں بھی موجود تھے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی قضاء کا واقعہ مشہور ہے سترہ اونٹوں کو جس اسلوب سے تقسیم فرمایا ہے اس سے آج کل کے دورِ ترقی کے اکثر محاسبین بھی ناواقف ہیں، بہت کم لوگ اس کی حقیقت جانتے ہیں۔ غرضیکہ وہ زمانہ محاسبین سے بالکل خالی نہ تھا اس کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ثبوت ہلال میں حساب کو باطل قرار دے کر رؤیت کو شرط قرار دینا اس پر کھلی دلیل ہے کہ شرعاً اثبات ہلال کے لیے حسابی طریقہ استعمال کرنا جائز نہیں اور اس پر پوری امت مسلمہ کا اجماع ہے۔

(احسن الفتاوی ۴/۴۹۲ مطبوعہ دار الاشاعت دہلی)

علماء وفقہاء کی عبارات بالا کا مضمون مشترک ہے، ان عبارات پر غور کرنے سے حسب ذیل امور مستفاد ہوتے ہیں:

① قمری مہینہ کی تبدیلی میں دار ومدار چاند نظر آنے (یعنی چاند سر کی آنکھوں سے دیکھنے) پر ہے۔

② صرف فلکی حساب اور آلات رصدیہ پر ثبوت ہلال کا مدار رکھنا شرعاً جائز نہیں۔

③ آلات رصدیہ کے ذریعہ ثبوت ہلال میں مدد لی جاسکتی ہے۔

④ تعارض کے وقت یعنی رؤیت ہلال کا شرعی ثبوت نہ ہو اور اہل حساب کی تحقیق اس کے برعکس ہو تو ترجیح شق اول (شرعی ثبوت) کو حاصل ہوگی۔ لان مبنی الشرائع علی الامور الظاهرة.

آلات رصدیہ یہ سائنسی ایجاد کے کرشمے اور تجربے ہیں جن کے بارے میں خود ان کے موجد برملا اظہار کر چکے ہیں کہ یہ حرف آخر نہیں، بلکہ ہر تجربہ دوسرے نئے تغیرات کا پیش خیمہ ہوتا ہے اور ہر نئی تحقیق سابق تحقیق کو باطل کر دیتی ہے جبکہ شرعی قوانین مستحکم ہوتے ہیں اور سائنسی تغیرات کے سامنے رُو بہ زوال نہیں ہوتے۔ اگر حساب اور آلات کے نتائج کو شرعی قوانین کی طرح قطعی اور یقینی کا درجہ دے دیا گیا تو شرعی قوانین میں شکوک وشبہات پیدا ہونا مستبعد نہیں۔

ذیل کے واقعہ سے امکان شبہات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے: حضرت علامہ سید محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ کے سفر مصر وشام کا تذکرہ کرتے ہوئے حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم تحریر فرماتے ہیں:۔

اسی دوران ایک مشہور عربی رسالہ کے دفتر میں مولانا بنوری کی ملاقات علامہ جوہری طنطاوی مرحوم سے ہوگئی، جن کی تفسیر الجواہر اپنی نوعیت کی منفرد تفسیر ہے، بعض لوگوں نے تو امام رازی کی تفسیر کبیر پر یہ فقرہ چست کیا ہے کہ فیه کل شيء الا التفسير (یعنی اس میں تفسیر کے سوا سب کچھ ہے) لیکن واقعہ یہ ہے کہ "تفسیر کبیر" کے بارے میں یہ جملہ بہت بڑا ظلم ہے، ہاں! اگر موجودہ دور میں کسی کتاب پر یہ جملہ کسی درجہ میں صادق آسکتا ہے تو وہ علامہ طنطاوی مرحوم کی "تفسیر الجواہر" ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ یہ کتاب تفسیر کی نہیں؛ بلکہ سائنس کی کتاب ہے اور سائنس کی باتوں

کو قرآن کریم سے ثابت کرنے کے شوق میں علامہ طنطاوی مرحوم نے بعض جگہ آیات قرآنی کی تفسیر میں ٹھوکریں بھی کھائی ہیں۔

علامہ طنطاوی مرحوم سے حضرت مولانا بنوری کا تعارف ہوا، تو انہوں نے مولانا سے پوچھا کہ کیا آپ نے میری تفسیر کا مطالعہ کیا ہے؟ مولانا نے فرمایا کہ ہاں! اتنا مطالعہ کیا ہے کہ اس کی بنیاد پر کتاب کے بارے میں رائے قائم کرسکتا ہوں۔ علامہ طنطاوی رحمۃ اللہ علیہ نے رائے پوچھی تو مولانا نے فرمایا آپ کی کتاب اس لحاظ سے تو علماء کے لیے احسان عظیم ہے کہ اس میں سائنس کی بے شمار معلومات عربی زبان میں جمع ہوگئی ہیں، سائنس کی کتابیں چوں کہ عموماً انگریزی زبان میں ہوتی ہیں، اس لیے عموماً علمائے دین ان سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے، آپ کی کتاب علماء دین کے لیے سائنسی معلومات حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ ہے؛ لیکن جہاں تک تفسیر قرآن کا تعلق ہے اس سلسلے میں آپ کے طرزِ فکر سے مجھے اختلاف ہے، آپ کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ عصر حاضر کے سائنس دانوں کے نظریات کو کسی نہ کسی طرح قرآن کریم سے ثابت کر دیا جائے۔ اور اس غرض کے لیے آپ بسا اوقات تفسیر کے مسلمہ اصولوں کی خلاف ورزی سے بھی دریغ نہیں کرتے، حالاں کہ سوچنے کی بات یہ ہے کہ سائنس کے نظریات آئے دن بدلتے رہتے ہیں، آج آپ جس نظریہ کو قرآن سے ثابت کرنا چاہتے ہیں، ہوسکتا ہے کل وہ خود سائنس دانوں کے نزدیک غلط ثابت ہو جائے، کیا اس صورت میں آپ کی تفسیر پڑھنے والا شخص یہ نہ سمجھ بیٹھے گا کہ قرآن کریم کی بات معاذ اللہ غلط ہوگئی، مولانا نے یہ بات ایسے مؤثر اور دل نشیں انداز میں بیان فرمائی کہ علامہ طنطاوی مرحوم بڑے متأثر ہوئے اور فرمایا: ایها الشيخ لست عالماً هندياً وانما انت ملك انزل

اللہ من السماء لاصلاحی (مولانا آپ کوئی ہندوستانی عالم نہیں ہیں بلکہ آپ کوئی فرشتے ہیں جسے اللہ تعالیٰ نے میری اصلاح کے لیے نازل کیا ہے) یہ واقعہ میں نے مولانا سے بارہا سنا اور شاید بینات کے کسی شمارے میں بھی مولانا نے اسے نقل کیا ہے۔ (نقوش رفتگاں:۹۱،۹۲)

اس تمہید کے بعد آپ کے سوالات کے جوابات لکھے جاتے ہیں:

آپ کے استفتاء کا خلاصہ تین امور پر مشتمل ہے:

① فلکیاتی اعتبار سے رؤیت ہلال کا امکان نہ ہو تو چاند دیکھنے والوں کی گواہی قابل قبول ہے یا نہیں؟

② سعودیہ کے متبعین "محمود الفتاویٰ" کی عبارت سے اپنا موقف ثابت کرنے میں غلط فائدہ اٹھاویں اس کا قوی امکان ہے، لہٰذا اس کا انسداد کیجئے۔

③ "محمود الفتاویٰ" اور دیگر اکابر کی عبارات میں بظاہر تعارض ہے۔ "محمود الفتاویٰ" سے معلوم ہوتا ہے کہ رؤیت ہلال کے سلسلے میں حساب داں یعنی فلکی تحقیقات کا اعتبار نفیاً صحیح ہے نہ اثباتاً، جبکہ دیگر اکابر کی تحریرات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حضرات فلکی تحقیقات کو نفیاً معتبر مانتے ہیں، اس میں کونسی بات صحیح ہے؟ (سوال کی تنقیح پوری ہوئی)۔

پہلے سوال کا جواب:

احکام شرعیہ کا دارومدار حجت شرعی پر ہے، گواہی شرعی حجت ہے، فلکی حساب حجت شرعی نہیں محض تخمینہ ہے، تخمینہ سے کسی امر کا ثبوت نہیں ہوسکتا، البتہ قبول شہادت کے لیے محل شہادت ہونا ضروری ہے اور شہادت کا محل انتیس شعبان ہے، لہٰذا اٹھائیس

شعبان کو اگر گواہوں نے گواہی دی کہ ہم نے آنکھوں سے چاند دیکھا ہے تو ثقہ و عادل ہونے کے باوجود ان کی گواہی قابل قبول نہیں ہے جیسے دو آدمی اس بات کی گواہی دیں کہ زید نے عمرو کو قتل کیا، گواہ ثقہ بھی ہیں؛ مگر تحقیق سے پتہ چلا کہ عمرو تو زندہ ہے تو یہ گواہی قابل قبول نہیں؛ اس لیے کہ عمرو محل شہادت نہیں۔

لو شهد الشاهدان بخلاف ما قامت عليه القرينة فالمعتبر هو الشهادة ما لم يكذبها الحس كما لو شهدا بان زيداً قتل عمروا ثم جاء عمرو حيا (رسائل ابن عابدين/١٢٩)

اس جزئیہ سے معلوم ہوا کہ قرائن اور شہادت میں تعارض کی صورت میں ترجیح شہادت کو حاصل ہے نہ کہ قرائن کو، بشرطیکہ وہ شہادت برمحل ہو اور اگر وہ شہادت بے محل ہو جیسا کہ مذکورہ مثال میں تو ایسی شہادت قابل قبول نہیں۔

فقیہ الامت حضرت مفتی محمود حسن گنگوہی نور اللہ مرقدہ تحریر فرماتے ہیں:

''چاند کا نکلنا سب مقامات پر بیک وقت نہیں ہے، بلکہ اس میں قدرت کا پیدا کیا ہوا اختلاف ہے، کہیں ایک دن پہلے طلوع ہوتا ہے، کہیں دو دن پہلے اگر شرعی اصول کے مطابق ایک ملک میں چاند کی رؤیت ثابت ہو جائے اور دو عادل شاہد بذریعۂ ہوائی جہاز ایسے ملک میں آ کر شہادت دیں جہاں اس روز اٹھائیس تاریخ ہو تو شاہدوں کے عادل و ثقہ ہونے کے باوجود ان کی شہادت قابل سماعت نہیں ہوگی، شہادت کے لیے محل ہونا ضروری ہے، اس کا محل یوم الشک ہے یعنی ۲۹/تاریخ۔ اور ۲۸/تاریخ کو تو شہادت لی بھی نہیں جائیگی، نہ شاہد کاذب قرار دیا جائیگا، اگر چار آدمی عادل معتبر کسی شخص کے متعلق گواہی دیں کہ ہم نے اس کو زنا کرتے ہوئے دیکھا ہے،

لیکن تفتیش سے معلوم ہوا کہ وہ شخص مجبوب ہے یعنی اس کے پاس آلہ ہی موجود نہیں بلکہ مقطوع ہے تو ان شاہدوں کی وجہ سے اس شخص کو سنگسار نہیں کیا جائے گا، نہ شاہدوں پر حدِ قذف جاری ہوگی۔

وکذا لو شھدوا علی زناہ فوجدوہ مجبوبا(لم یحد) (الدر المختار کتاب الحدود باب الشھادت علی الزنا؟ /۳۳) (بحوالہ فتاوی محمودیہ کراچی ۱۰ / ۶۳ محمود الفتاوی ۲ / ۹۳)

فلکیاتی حساب سے ۲۹ ر تاریخ کو چاند کی رؤیت کا امکان نہ ہو اور شرعی گواہ سر کی آنکھوں سے چاند دیکھنے کی گواہی دیں تو نئے ماہ کا ثبوت ہو جائے گا۔

علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تصریح بایں الفاظ فرمائی ہے:

و فی فتاویٰ الشھاب الرملی الکبیر الشافعی سئل عن قول السبکی لو شھدت بینۃ برؤیۃ الھلال لیلۃ الثلاثین من الشھر و قال الحساب بعدم امکان الرؤیۃ تلک اللیلۃ عمل بقول اھل الحساب لان الحساب قطعی و الشھادۃ ظنیۃ و اطال فی ذلک فھل یعمل بما قالہ ام لا وفیما اذا رؤی الھلال نھاراً قبل طلوع الشمس یوم التاسع و العشرین من الشھر و شھدت بینۃ برؤیۃ ھلال رمضان لیلۃ الثلاثین من شعبان فھل تقبل الشھادۃ ام لا لان الھلال اذا کان الشھر کاملاً یغیب لیلتین او ناقصاً یغیب لیلۃ او غاب الھلال لیلۃ الثالثۃ قبل دخول وقت العشاء لا نہ ﷺ کان یصلی العشاء لسقوط القمر الثالثۃ ھل یعمل بالشھادۃ ام لا؟ فاجاب بان المعمول بہ فی المسائل الثلاث ما شھدت بہ البینۃ لان الشھادۃ نزلھا الشارع منزلۃ الیقین و ما قالہ السبکی مردود ردہ علیہ جماعۃ من المتأخرین.(شامی۲ /۱۰۰، رسائل ابن عابدین۱/ ۲۴۸)

آپ نے تحریر فرمایا ہے:

''برطانیہ میں سعودی کی ۲۹ر شعبان کی شام کو بعد نماز مغرب تین حضرات نے چاند دیکھنے کا دعویٰ کیا ہے، جب کہ فلکیاتی اعتبار سے اس دن رؤیت کا امکان نہ تھا بلکہ چاند غروب آفتاب سے پہلے ہو چکا تھا''۔

آپ نے یہ نہیں لکھا کہ برطانیہ میں اس روز اسلامی کونسی تاریخ تھی؟ اگر برطانیہ میں ۲۸ر شعبان تھی تب تو یہ گواہی قابل سماعت نہیں جیسا کہ گذرا اور اگر برطانیہ میں ۲۹ر تاریخ تھی اور غروب آفتاب سے پہلے چاند دیکھا تھا تو ان کی گواہی سے رمضان کا ثبوت ہو جاتا ہے بشرطیکہ وہ گواہ دیندار ہوں اور مطلع غبار آلود ہو۔

عمدۃ الفقہ میں ہے:

رمضان کا چاند ابر وغبار وغیرہ کے دن ایک آدمی کی گواہی سے ثابت ہو جاتا ہے جیسا کہ متون وشروح میں اس کا بیان ہے (مؤلف) پس اگر آسمان پر (چاند کے مطلع کی جگہ پر) ابر وغیرہ کوئی علت ہو جو رؤیت سے مانع ہو تو رمضان کا چاند دیکھنے میں ایک شخص کی گواہی قبول کر لی جائے گی بشرطیکہ وہ عادل، مسلمان، عاقل اور بالغ ہو۔
(عمدۃ الفقہ ۳/ ۲۲۸)

اور اگر آسمان پر کوئی علت نہ ہو (یعنی مطلع صاف ہو) تو ایسی بڑی جماعت کی گواہی قبول ہوگی جن کے خبر دینے سے یقین حاصل ہو جائے، یعنی اس خبر سے غلبۂ ظن حاصل ہو جائے اور بڑی جماعت کے لیے کوئی تعداد مقرر نہیں ہے بلکہ یہ امام کی رائے پر موقوف ہے، یہی صحیح ہے۔ (ایضا ۳/ ۲۳۲)

ہدایہ میں ہے: واذا كان بالسماء علة قبل الامام شهادة الواحد

العدل فی رؤیة الهلال رجلا کان او امرأة حرا کان او عبدا لا نه امر دینی فأشبه روایة الاخبار ولهذا لا یختص بلفظ الشهادة وتشترط العدالة لان قول الفاسق فی الدیانات غیر مقبول إلخ واذا لم تکن بالسماء علةلم تقبل الشهادة حتی یراه جمع کثیر یقع العلم بخبرهم لان التفردبالرؤیة فی مثل هذه الحالة یوهم الغلط فیجب التوقف فیه حتی یکون جمعا کثیرا بخلاف ما اذا کان بالسماء علة لا نه قد ینشق الغیم عن موضع القمرفیتفق للبعض النظر(هدایه ۱/ ۲۱۵، ۲۱۶)

بدائع الصنائع میں ہے:

عن ابن عباس:ان رجلا جاء الیٰ رسول الله ﷺفقال ابصرت الهلال فقال: اتشهد ان لا الٰه الا الله و ان محمدا رسول الله؟ قال نعم قال قم یا بلال فأذن فی الناس فلیصوموا غدافقد قبل رسول الله ﷺ شهادة الواحد علی هلال رمضان ولنا فی رسول الله ﷺ أسوة حسنة .

(بدائع الصنائع۲۲۲،۲۲۱)

مذکورہ حدیث کے متعلق حاشیہ میں لکھا ہے:

"اخرجه ابو داؤد فی سننه فی الصوم" باب فی شهادة الواحد علی رؤیة الهلال برقم:۲۳۴۰ والترمذی فی جامعه فی الصوم"باب ما جاء فی الصوم بالشهادة برقم ۶۹۱ والنسائی فی المجتبی من السنن۴/ ۱۳۲ فی الصوم باب ما جاء فی الصوم بالشهادة وابن ماجة فی سننه فی الصیام باب ماجاء فی الشهادة علی رؤیة الهلال برقم۱۶۵۲.

(حاشیه بدائع الصنائع ۲ / ۲۲۲)

آپ نے تحریر فرمایا ہے: "جبکہ فلکیاتی اعتبار سے اس دن کو (۲۹ر شعبان کو)

رؤیت کا کوئی امکان نہ تھا"۔

فلکی حساب سے امکان ہو یا نہ ہو مگر شرعی حساب سے ۲۹/ شعبان کو چاند کا امکان بلکہ وقوع ہے، نص سے اس کا ثبوت ہے جیسا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت میں گزرا کہ ان آنے والے صحابی نے ۲۹ر شعبان کا چاند دیکھا تھا، نیز حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قول اور فعل دونوں سے ۲۹ر شعبان کو امکان رؤیت کا ثبوت ہے۔

قولی حدیث میں الشهر هكذا وهكذا وهكذا پیش کر دینا کافی ہے جیسا کہ سابق اوراق میں گذرا۔

فعلی احادیث میں ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ملاحظہ فرمالیجئے:

عن عائشة: كان رسول الله ﷺ يتحفظ من شعبان ما لا يتحفظ من غيره ثم يصوم لرؤية رمضان فان غم عليه عد ثلاثين يوما ثم صام.

(ابوداود كتاب الصوم ۱/ ۳۱۸)

ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: کہ حضرت نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جتنا ماہ شعبان کے چاند کا اہتمام فرماتے تھے اتنا کسی دوسرے ماہ کا نہیں فرماتے تھے، پھر (انتیس شعبان کا) چاند دیکھ کر رمضان کا روزہ رکھا کرتے تھے، لیکن مطلع غبار آلود ہونے (اور کہیں سے رؤیت کی اطلاع نہ ملنے) کی صورت میں (شعبان) کے تیس دن پورے کیا کرتے تھے۔

دیکھئے! آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ۲۹/ شعبان کو چاند کا اہتمام فرمانا خود امکان رؤیت پر صریح دلیل ہے۔ رہی یہ بات کہ غروب آفتاب سے پہلے چاند دیکھا جائے تو یہ چاند کس دن کا شمار ہوگا سابق دن کا یا آئندہ دن کا؟ اس کے متعلق حضرات فقہاء نے

تصریح فرمائی ہے کہ وہ چاند آنے والے دن کا ہے، مثلا بدھ کے روز انتیس شعبان کی تاریخ ہے اسی روز غروب آفتاب سے کچھ پہلے چاند دیکھا گیا تو جمعرات کو رمضان کی پہلی تاریخ شمار ہوگی۔

نورالایضاح میں ہے: ولا عبرة برؤية الهلال نهارا سواء كان قبل الزوال او بعده وهو لليلة المستقبلة فى المختار.

(نور الایضاح ۱۴۰ مطبوعه معراج بک ڈپو دیوبند)

بدائع الصنائع میں ہے:

وقال ابو يوسف:ان كان بعد الزوال فكذالك، وان كان قبل الزوال فهو لليلة الماضية ويكون ذالك اليوم من رمضان والمسألة مختلفة بين الصحابةوروى عن عمر، وابن مسعود، وابن عمر،وانس مثل قولهما وروى عن عمر رواية اخرىٰ مثل قوله،وهو قول على ، وعائشة، وعلىٰ هذا الخلاف هلال شوال اذا رأوه يوم الشك وهو يوم الثلاثين من رمضان قبل الزوال او بعده فهو لليلة المستقبلة عندهما ويكون اليوم من رمضان،وعنده ان رأوا قبل الزوال يكون لليلة الماضية ويكون اليوم يوم الفطر، والاصل عندهما انه لا يعتبر فى رؤية الهلال قبل الزوال ولا بعده وانما العبرة لرؤيته قبل غروب الشمس وعنده يعتبر (بدائع الصنائع۲/ ۲۲۴،۲۲۳)

خط کشیدہ الفاظ سے معلوم ہوا کہ غروب شمس سے پہلے دیکھا ہوا چاند معتبر ہے، لہذا ایسے چاند کی رؤیت کی بنیاد پر جو گواہی دی جاوے وہ بھی معتبر ہے۔

آپ کے استفتاء میں بظاہر تعارض ہے، پہلے تحریر فرمایا ''فلکیاتی اعتبار سے اس

دن رؤیت کا کوئی امکان نہ تھا" بعد میں لکھا "بلکہ چاند غروب آفتاب سے پہلے ہو چکا تھا" جب امکان ہی نہ تھا تو غروب آفتاب سے پہلے چاند کیسے پیدا ہوا؟ یہ بات سمجھ میں نہیں آئی۔

دوسرے سوال کا جواب:

ایسا لگتا ہے کہ جناب والا نے "محمود الفتاوی" کا بالاستیعاب مطالعہ نہیں کیا ہے، حضرت مفتی صاحب مدظلہ کے فتاوی میں کئی جگہ سعودیہ کا فیصلہ در باب رؤیت ہلال شرعی ضابطہ پر نہ اترنے اور قابل قبول نہ ہونے کی صراحت ہے، ملاحظہ کیجئے:

① ایک ضروری وضاحت: میں نے اپنے سابق جواب میں جو کچھ لکھا اور اس افہام اور تفہیم میں بھی جو عرض کیا، اس سے میرا مقصد سعودیہ کے اعلان کی حمایت نہیں ہے، بلکہ نفس مسئلہ کی وضاحت اور شرعی حیثیت کا تعین ہے، رہا سعودی اعلان درست ہے یا نہیں؟ تو جب تک ان کے طریق کار کا علم نہ ہو جائے اس سے پہلے اس سلسلہ میں کچھ کہنا یا لکھنا قبل از وقت ہے الخ۔ (محمود الفتاوی اردو ۲/ ۱۶۷، مطبوعہ مکتبۂ انور ڈابھیل)

② ایک اور جگہ رقم طراز ہیں:

حکومت سعودیہ میں رؤیت ہلال کا فیصلہ جس انداز سے ہو رہا ہے وہ اہل علم کے درمیان موضوع نزاع ہے، حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب مدظلہم نے اس سلسلہ میں جو رائے قائم فرمائی ہے، وہ ایک موزوں اور صائب رائے ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

"حکومت سعودیہ میں رؤیت ہلال کا فیصلہ مسلک حنفیہ کے خلاف ہونے کے علاوہ بداہت کے خلاف بھی ہوتا ہے؛ اس لیے وہ پاکستان کے لیے حجت نہیں"۔

(احسن الفتاویٰ ۴/ ۴۱۶)

جب وہ فیصلہ مسلک حنفی کے خلاف ہونے کی وجہ سے پاکستان کے لیے حجت نہیں تو برطانیہ میں مقیم احناف کے لیے کیسے حجت ہوگا؟۔ (محمود الفتاوی ۲/ ۱۸۰)

③ سعودیہ کے متعلق بعض حضرات کا اصرار ہے کہ وہ لوگ حساب پر چلتے ہیں، رؤیت اور شہادت محض عقلی تسلی ہے، اس صورت میں اس پر مدار رکھنا بھی موجب خلفشار ہوسکتا ہے۔ انتہی بلفظہ (محمود الفتاوی ۲/ ۲۰۵)

مذکورہ تینوں عبارتوں پر غور فرمالیں کہ ان عبارتوں سے سعودیہ کے متبعین کا منشاء ثابت ہورہا ہے یا متزلزل ہورہا ہے؟

حضرت مفتی صاحب مدظلہٗ کے فتاویٰ میں جہاں سعودیہ کی رؤیت اور فیصلہ کو تسلیم کیا گیا اور اس پر عمل کی گنجائش لکھی ہے وہ مقید ہے مطلق نہیں، حضرات فقہاء کا مسئلہ کو مقید کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ جہاں وہ قید نہ ہو اس کے لیے وہ حکم ثابت نہ ہوگا۔

وکذا یقال فی مفهوم الروایات، فان العلماء جرت عادتهم فی کتبهم، علی انهم یذکرون القیود و الشروط و نحوها تنبیها علی اخراج ما لیس فیه ذلك القید و نحوه، وان حکمه مخالف لحکم المنطوق، وهذا مما شاع و ذاع بینهم بلا نکیر و لذا لم یر من صرح بخلافه.

(شرح عقود رسم المفتی: ۱۷٤، زکریا)

محمود الفتاویٰ سے اس کی دو مثال پیش کرتا ہوں:

① سوال: بعض لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ عید الاضحیٰ سعودی عرب میں حج کے دوسرے دن برطانیہ میں منائی جائے، کیا حدیث شریف میں یا شریعت مطہرہ میں اس کی کوئی حقیقت ہے کہ سعودی عرب میں جس دن حج ہو اس کے دوسرے دن برطانیہ

میں عید الاضحیٰ منائی جائے؟

جواب: حدیث میں ایسی کوئی تصریح نہیں ہے، البتہ اگر سعودی رؤیت کی خبر بطریق موجب برطانیہ پہنچ گئی تو اس پر عمل کیا جاسکتا ہے۔ (محمود الفتاوی ۲/ ۱۳۰، ۱۵۲)

(۲) سوال: سعودی عربیہ میں قران شمس وقمر سے پہلے اور قران شمس وقمر کے وقت یا قران شمس وقمر کے چند گھنٹوں ہی کے بعد رؤیت ہلال کا فیصلہ کیا جاتا ہے، آیا اسے معتبر مانا جائے گا یا نہیں؟ (ملخصاً)

جواب: صورت مسئولہ میں حکومت سعودیہ کا یہ فیصلہ ۲۹؍ تاریخ کو شہادت رؤیت کی بنیاد پر ہے تو محل شہادت موجود ہے اس لیے قابل قبول ہے، ورنہ نہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔ حررہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری ۲/ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۷ھ (محمود الفتاوی ۲/ ۹۴)

مذکورہ دونوں فتاوی میں حضرت مدظلہ نے ''رؤیت'' و ''شہادت'' کی قید لگائی، رؤیت اور شہادت سے شرعی رؤیت اور شرعی شہادت مراد ہے، شرعی رؤیت ہے سر کی آنکھوں سے چاند دیکھنا، اور شرعی شہادت وہ ہے جو ضابطۂ شریعت کے مطابق ہو۔

تفصیل بالا سے معلوم ہوا کہ سعودیہ کے متبعین کے لیے حضرت مفتی صاحب کے فتاوی تائید کے طور پر پیش کرنے کی کوئی سبیل نہیں، پھر بھی توڑ موڑ کر اگر کوئی پیش کرے تو اس کی ذمہ داری اسی پر ہوگی نہ کہ صاحب فتاویٰ پر۔

تیسرے سوال کا جواب:

آپ نے تحریر فرمایا: ''حضرت والا کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ رؤیت ہلال کے سلسلہ میں حساب داں کی بات کا اعتبار نہ نفیاً صحیح ہے اور نہ اثباتاً جبکہ اور اکابر کے فتاوی ومضامین سے معلوم ہوتا ہے: وہ حضرات نفیاً اس کو معتبر مانتے ہیں''۔

غالباً آپ کی مراد نفیاً اور اثباتاً سے اگر یہ ہے کہ نفیاً یعنی شرعاً صرف آلات رصدیہ سے ہونے والے ثبوت ہلال کی نفی کرنا درست ہے اور اثباتاً یعنی عقلاً ان آلات سے رؤیت کا ثبوت درست وممکن ہے۔

اگر یہی مراد ہے تو حضرت مدظلہ اور اکابر کے فتاویٰ میں واقعی کوئی تعارض نہیں، باقی ہمارے اکابر میں اس کا کوئی قائل نہیں کہ صرف اور صرف آلات رصدیہ کی بنیاد پر ثبوت ہلال شرعاً معتبر ہے۔

موجودہ دور کے مفتیان کرام درحقیقت ناقل فتاویٰ ہیں:

المفتی المجتهد فی المذهب،وهو المفتی حقیقةاما غیره فهو ناقل.

(شرح عقود رسم المفتی:۱۳۲)

وان ما عداهم یکتفی بالنقل،وان علینا اتباع ما نقلوه لنا عنهم من استنباطاتهم غیر المنصوص عن المتقدمین ومن ترجیحاتهم.

(شرح عقود رسم المفتی:۱۳۸)

اسی وجہ سے مفتی کے لیے فتوے میں کتاب کا حوالہ دینا ضروری ہے،حوالہ کے بعد مفتی عہدہ برآ ہوجاتا ہے،اور ساری ذمہ داری محولہ کتاب کے مصنف پر عائد ہوتی ہے۔

مفتی صاحب مدظلہ نے ''محمود الفتاویٰ'' میں تحریر فرمایا ہے:

''فلکی حساب کا رؤیت پر مثبت ومنفی کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا،جس طرح فلکی حساب کے مثبت طور پر معتبر ومؤثر نہ ہونے کو آپ تسلیم کرتے ہیں،اسی طرح منفی طور پر بھی وہ مؤثر ومعتبر نہیں۔''لا عبرة بقول الموقتین فی الصوم''کا یہی مطلب فقہاء کرام نے لیا ہے۔''(انتہی بلفظہ)

ملاحظہ کیجئے: مفتی صاحب نے نفیاً مؤثر ہونا اپنی طرف سے نہیں لکھا فقہائے

کرام کی عبارات کی روشنی میں لکھا ہے، علّامہ شامی کی عبارت "ان الشارع لم یعتمد الحساب بل ألغاہ بالکلیۃ" (شامی ۲/۱۰۰) سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

جو حضرات علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ کی مشہور و معروف کتاب "رد المحتار" کو معتبر مانتے ہیں اور فقہ حنفی میں جامع و مستند سمجھتے ہیں، اپنے فتاویٰ میں اس کے حوالے دیتے ہیں، ان کو علّامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ کی بات تسلیم کر لینا چاہیے اور بصورت دیگر اس کا جواب دینا چاہیے۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہ اعتراض درحقیقت صاحبِ محمود الفتاویٰ پر نہیں بلکہ علامہ شامی اور دیگر فقہاء پر ہے۔ فافهم و تدبر. فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد عبد القیوم راجکوٹی، ۳۰/ ذی الحجۃ الحرام ۱۴۳۱ھ

الجواب صحیح: العبد احمد عفی عنہ خانپوری　　الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ

چاند کی شہادت کو فلکی حسابات کی بنیاد پر رد کرنا اور روزہ کی قضاء نہ کرنا

سوال: عرض یہ ہے کہ ہمارے یہاں برطانیہ میں رمضان ۱۴۳۱ھ کے موقع پر ۲۹ ویں شعبان ۱۴۳۱ھ بمطابق ۱۰ اگست ۲۰۱۰ء منگل کی شام "برمنگھم" شہر کے تین حضرات نے رمضان کا چاند دیکھا، جن کی گواہیاں مرکزی رویت ہلال کمیٹی برطانیہ کے وفد نے "برمنگھم" جا کر گواہوں سے روبرو مل کر لیں، ان گواہوں کی خصوصیات میں سے ایک تو یہ ہے کہ یہ تینوں صاحب ترتیب ہیں، جبکہ ایک گواہ عالم دین، دوسرا

حافظ قرآن ہے اور تیسرے گواہ تبلیغی جماعت میں عرصے سے دعوت کے کام میں جڑے ہوئے ہیں، ان تینوں حضرات کی گواہی چاند کمیٹی کے وفد نے ان سے مل کر سنی اور تحریری دستخط بھی لیے، جس کی تفصیل ساتھ میں روانہ کردہ گواہی کے کاغذات میں موجود ہے، یاد رہے کہ اس سے قبل بھی چاند کمیٹی کے اعلانات کے پچھلے پچیس سالہ ۲۹ / ویں دن کے تسلسل کی شام کو برطانیہ میں - جو کہ بہت چھوٹا ملک ہے، بہ شمول دارالعلوم بری کے ۸ / نیز دارالعلوم لیسٹر کے ۳ / طلباء - بیس مواقع پر چاند کی رویت وشہادت ہوئی ہے جن تمام کا ریکارڈ ہماری ویب سائٹ پر بھی موجود ہے۔

بہر حال بعض حضرات نے اس گواہی کو یہ کہہ کر تسلیم نہیں کیا کہ: یہ شہادت مفروضہ فلکیاتی نیومون تھیوری کے حسابات کے خلاف ہونے کی وجہ سے مشکوک ومتہم ہے؛ کیوں کہ فلکیاتی حساب کے مطابق اس چاند کے دکھائی دینے کے امکانات اس وقت بالکل نہ تھے، اس کے علاوہ چاند کمیٹی نے گواہوں سے جو گواہی لی وہ رمضان شروع ہونے کے ایک ہفتہ بعد لی وغیرہ! حالاں کہ نصوص وفتاویٰ کے مطابق مذکورہ وجوہ کی بنیاد پر اس شام رمضان کی ''عدمِ فرضیت'' کا شرعاً کوئی جواز نہیں۔

یاد رہے کہ چاند کمیٹی نے مذکورہ شہادت کے بعد اپنے اعلانات میں ''فقہاء ومفتیانِ کرام کے ثبوتِ ہلال کے مسئلہ میں فلکیات کے عمل دخل کی تردید میں جو فتاویٰ آپ حضرات کے ہیں (جو ہماری ویب سائٹ پر الگ سے وکتب میں بھی ہیں) انہیں پیش کرنے کے ساتھ ساتھ اس چھوٹ جانے والے روزہ کی قضاء کے لیے بھی عوام کو مطلع کیا، مگر بعض لوگ مفروضہ نیومون تھیوری کے حسابات جو (۱۳۱ھ ق م کیمیتون فلسفی کی سوچ ونظریہ ہے اور جو) اسلام کی آمد سے پہلے ۵۸ سنہ ۳ء کے یہودی ربائی

حالیل دوم نے دینِ موسوی میں تحریف کر کے جسے دخیل بنایا تھا، اسے شہادتِ ہلال کے لیے ''کسوٹی'' مانتے ہیں اور دلیلاً آیتِ شریفہ ﴿الشمس والقمر بحسبان﴾ پیش کرتے ہیں، اس طرح انہوں نے مذکورہ شہادت کو رد کر کے روزہ کی قضاء کرنے کا بھی انکار کر دیا! اس طرح نعوذ باللہ ماقبل اسلام اور ماقبل مسیح کی فلسفیانہ تھیوری کو نصوص کے خلاف استعمال کیا، جسے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حدیث امّی سے رد کر دیا تھا! اب وہ عوام جن کا روزہ شہادت کی بنیاد پر چھوٹ گیا ہے وہ گومگو کی حالت میں ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ ''ہمارا روزہ قضاء نہ کرنے کا وبال ان لوگوں پر ہوگا جنہوں نے اس کی قضاء کے لیے منع کیا ہے''!

اس تفصیل کے ضمن میں ذیل کے سوالات کے جوابات درکار ہیں:

① کیا برمنگھم کے مذکورہ گواہوں کی شہادت کو چاند کے فلکی حسابات اور اس کی نیومون تھیوری کی کسوٹی کی بنیاد پر رد کرنا جائز ہے؟

② جن لوگوں کا روزہ مذکورہ شہادت کی بنیاد پر چھوٹ گیا ہے اس کی قضا وہ یہ سمجھ کر نہ کریں کہ ''اس کا وبال ہم پر نہیں ہوگا بلکہ جنہوں نے منع کیا ہے ان پر ہوگا''، تو کیا ان کا یہ عذر شرعاً قابل حجت ہے؟ یا پھر ان پر قضاء ضروری ہے؟ بینوا و توجروا

بقلم: مولوی یعقوب احمد مفتاحی

(ناظم حزب العلماء یو کے و مرکزی رویتِ ہلال کمیٹی برطانیہ)

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

① فلکی حساب کی بنیاد پر شرعی شہادت کو رد کرنا جائز نہیں، ہر دور میں فقہاء نے رمضان وعیدین کا دار ومدار رؤیت ہلال پر رکھا ہے، تدقیقات فلسفیہ اور قواعد ریاضیہ

یا آلات رصد یہ اور حساب پر نہیں رکھا۔

(اس سلسلہ کی عبارات فقہیہ آپ کے مرسلہ دوسرے استفتاء کے جواب میں ملاحظہ فرمالیں)۔

جن لوگوں نے فلکی حساب کو معیار بنا کر آیت کریمہ ﴿الشمس والقمر بحسبان﴾ سے استدلال کیا ہے، یہ استدلال بھی درست نہیں۔ مذکورہ آیت کریمہ سورۂ رحمٰن میں ہے، انسان کے لیے حق تعالیٰ نے جو نعمتیں زمین وآسمان میں پیدا فرمائی ہیں، اس آیت میں علویات کی نعمتوں میں سے شمس وقمر کا ذکر خصوصیت سے شاید اس لیے آیا ہے کہ عالم دنیا کا سارا نظام کار اِن دونوں سیاروں کی حرکات اور ان کی شعاعوں سے وابستہ ہے، اور لفظ حسبان بضم الحاء بعض حضرات نے فرمایا کہ حساب کے معنی میں مصدر ہے، جیسے غفران، سبحان، قرآن، اور بعض نے فرمایا کہ حساب کی جمع ہے، اور مراد آیت کی یہ ہے کہ شمس وقمر کی حرکات جن پر انسانی زندگی کے تمام کاروبار موقوف ہیں، رات دن کا اختلاف، موسموں کی تبدیلی، سال اور مہینوں کی تعیین، ان تمام کی حرکات اور دوروں کا نظام محکم ایک خاص حساب اور اندازے کے مطابق چل رہا ہے، اور اگر حسبان کو حساب کی جمع قرار دیا جائے تو معنی یہ ہوں گے کہ ان میں سے ہر ایک کے دورے کا الگ الگ حساب ہے، مختلف قسم کے حسابوں پر یہ نظام شمسی اور قمری چل رہا ہے، اور حساب بھی ایسا محکم ومضبوط کہ لاکھوں سال سے اس میں ایک منٹ، ایک سیکنڈ کا فرق نہیں آیا۔ (معارف القرآن ۶/ ۲۴۴)

تفصیل بالا سے معلوم ہوا کہ شمس وقمر کی سیر ایک خاص حساب اور ضابطہ اور مضبوط نظام کے ماتحت ہے، یہ دونوں اس حساب سے سرمو تجاوز نہیں کر سکے، لیکن

اس خاص حساب کی تفصیل تو قرآن یا حدیث میں موجود نہیں، یہ کیا ضروری ہے کہ اہل ہیئت ور یاضی جس حساب کے دعوے دار ہیں وہی مراد ہو۔ (محمود الفتاویٰ ۲/ ۱۴۳)

اور اگر تھوڑی دیر کے لیے مان لیا جائے وہی حساب مراد ہے، تب بھی یہ دعوی کہ ''وہ حساب یقینی اور قطعی ہے'' محل نظر ہے، سائنس کے نظریات یقین اور مشاہدہ کے بجائے ظن اور تخمین پر مبنی ہیں، سائنس کی ایسی تحقیقات جو قرآن وحدیث کی تصریحات سے ٹکراتی ہوں قابل قبول نہیں، ایسے مواقع پر سیدھا اور صاف راستہ یہ ہے کہ قرآن و سنت کی تصریحات پر عمل کیا جائے اور سائنسی معلومات پر عمل نہ کیا جائے۔

کیوں چاند میں کھوئے ہو، الجھے ہو ستاروں میں
حل کو ڈھونڈ و قرآن و حدیث کے اشاروں میں

② شرعی شہادت کی بنیاد پر رمضان کا فیصلہ کیا گیا، فیصلہ کرنے والے حضرات نے یہ فیصلہ اصول شرع کی روشنی میں کیا ہو، تو جو لوگ ان کے متبعین ہیں ان کے لیے فیصلہ پر عمل کرنا ضروری ہے۔

ولو احتجم و ظن ان ذلك يفطره ثم اكل متعمدا عليه الكفارة لان الظن ماا ستند الى د ليل شرعى الا اذا افتاه فقيه بالفساد لان الفتوى دليل شرعى فى حقه (الىٰ قوله) لان على العامى الاقتداء بالفقهاء لعدم الاهتداء فى حقه الى معرفة الاحاديث. (هدايه اولين:٢٢٦)

ان کا یہ کہنا ''اس کا وبال ہم پر نہیں ہوگا بلکہ جنہوں نے منع کیا ہے ان پر ہوگا'' درست نہیں، اگر انہوں نے روزہ قضاء نہیں کیا تو گنہگار ہوں گے۔

فتاویٰ محمودیہ میں ہے:

سوال: اگر مطلع بالکل صاف ہو اور رؤیت ہلال عید الاضحیٰ کے لیے پورا پورا ہتمام کرنے کے باوجود دور نزدیک کہیں بھی کسی شخص نے ۲۹ کا چاند نہیں دیکھا؛ مگر قاضی نے بعض لوگوں کے کہنے پر ۵ یا ۶ تاریخ کو ۲۹ کی رؤیت ہلال کا اعلان کیا اور لوگوں نے اس کے مطابق ۱۰/ ذی الحجہ کو نماز وقربانی ادا کیا، تو ایسی صورت میں فریضۂ صلوۃ واضحیہ ادا ہو جائیں گے یا نہیں؟ اور اعلان قاضی کا وثوق نہ کر کے ۳۰ کے چاند کے مطابق صلوۃ واضحیہ ادا کرنے کا کیا حکم ہے؟ ملخصاً

الجواب: جو لوگ اس قاضی کے ماتحت ہیں اور قاضی نے شرعی شہادت سے اعلان کیا ہے تو ان کے ذمہ اس پر عمل واجب ہے، اس کے خلاف کرنے سے گنہگار ہوں گے۔ (ماخوذ از فتاوی محمودیہ جدید: ۱۰/ ۱۲۰ تا ۱۲۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد عبد القیوم راجکوٹی، ۱/ صفر ۱۴۳۲ھ

الجواب صحیح: عباس داود بسم اللہ　　　الجواب صحیح: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

چاند کے فیصلہ میں اختلاف کی صورت میں نماز عید میں تعدد اور اعتکاف کا حکم

سوال: یہاں باٹلی میں مسلمانوں کے چاند کے فیصلے میں دو جماعتیں ہیں، ایک گروہ جمعیۃ علماء یوکے (سعودی عربیہ) کی رویت کا اعتبار کرتے ہوئے رمضان اور عیدین کے تعین کا اعتبار کرتا ہے، جب کہ دوسرا گروہ باٹلی کے مفتیان کرام اور علماء عظام پر مشتمل چاند کمیٹی کے اعلان کا اعتبار کرتے ہوئے رمضان اور عیدین کا تعین کرتا ہے اور عموماً جمعیۃ العلماء کا اعلان دوسرے گروہ کے اعلان سے ایک دن پہلے

ہوتا ہے، اب دونوں گروہ ایک ہی شرعی مسجد میں اپنے اپنے اعلان کے مطابق عیدین ادا کرنا چاہتے ہیں، تو اب سوال یہ ہے کہ:

① اگر پہلے گروہ نے ایک دن پہلے عید کی نماز ادا کرلی، تو پھر دوسرے دن اسی مسجد میں دوبارہ وہی عید کی نماز دوسرا گروہ ادا کرسکتا ہے یا نہیں؟

② اور معتکفین کا کیا حال ہوگا؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

کسی مسئلہ میں معتبر علمائے کرام کی رائے میں اختلاف ہوتو عامی شخص کے لیے یہ حکم ہے کہ جن کی رائے پر اعتماد ہو اس پر عمل کرے۔

وان كان عامياً اتبع فتویٰ المفتی فیه الاتقیٰ الأعلم.

(شرح عقود رسم المفتی: ۱۰۷)

لیکن دوسرے گروہ کی رائے کی تغلیط اور ان پر تنقید نہ کرے، ہمارے اکابر کا ایسے مسائل میں یہی معمول رہا ہے، لہٰذا ہمیں ان کا اتباع کرنا چاہیے، جس سے دین پر ثابت قدمی میں بڑی تقویت ملتی ہے۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی نوراللہ مرقدہ آیت کریمہ ﴿وكلاً نقص عليك من أنبآء الرسل ما نثبت به فؤادك﴾(ھود) ترجمہ: اور پیغامبروں کے قصوں میں سے ہم یہ سارے قصے آپ سے بیان کرتے ہیں جن کے ذریعہ سے ہم آپ کے دل کو تقویت دیتے ہیں) کی تفسیر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں: اس میں دلیل ہے کہ مقبولین کے قصص کو قلوب کی تثبیت وتقویت وتنشیط میں خاص اثر اور دخل ہے؛ اسی لیے بزرگوں نے اولیاء کی حکایات جمع کرنے کا خاص اہتمام فرمایا

ہے۔(بیان القرآن ۵/ ۶۷)

مختلف فیہ مسائل میں عمل کی بجائے باوقار فقہی مسائل کی آڑ میں ذاتیات کو ہدف بنانا اسلامی تعلیم کے خلاف ہے۔

فقیہ الامت حضرت مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کو کون نہیں جانتا، ان کے محتاط طرز فکر وعمل سے شاید ہی کوئی نا آشنا ہوگا، ایک موقع پر حضرت انگلینڈ تشریف لے گئے، وہاں اہل علم کے مابین سحری کے آخری وقت کے متعلق اختلاف چل رہا تھا، اس کے حل کے لیے حضرت کی طرف رجوع کیا گیا، حضرت نے پانچ سو علماء کی موجودگی میں نہایت ہی محتاط فیصلہ صادر فرمایا، جو ہمارے لیے مشعل راہ ہے، اسی طرح عید الفطر کے چاند میں اختلاف کی صورت میں شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا محتاط عمل معتکفین کے لیے قابل توجہ وعمل ہے، لہٰذا اصل جواب سے پہلے حضرت فقیہ الامت رحمۃ اللہ علیہ کا فیصلہ اور حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کا عمل نقل کیا جاتا ہے، اس کو غور سے پڑھیے اور عملی جامہ پہنائیے، ملاحظہ کیجئے:

”کرامات وکمالات اولیاء“ (افادات حضرت شیخ الحدیث مولانا یوسف متالا صاحب دامت برکاتہم ومدظلہم) میں لکھا ہے:

حضرت مفتی محمود صاحب گنگوہی کا فیصلہ:

آج سے کوئی پچیس برس پہلے، حضرت مفتی محمود صاحب گنگوہی نور اللہ مرقدہ (مفتیٔ اعظم ہندوستان) جب یہاں تشریف لائے تھے، تو علماء نے مجھ سے کہا کہ یہاں جھگڑا چل رہا ہے ٹائم ٹیبل کا - اس وقت بھی گرمی میں روزے تھے، کوئی کہتا ہے کہ سحری ختم ہوتی ہے ڈیڑھ بجے، کوئی کہتا ہے ڈھائی بجے، کوئی کہتا ہے ساڑھے تین

بجے-تو کوئی چار سو، پانچ سو علماء اکٹھے ہوئے تھے، صرف علماء، پاورڈ اسٹریٹ مسجد، بریڈفورڈ میں۔ سارے فتاویٰ سن کر حضرت نے فیصلہ لکھوایا مفتی مقبول صاحب سے کہ لکھو کہ احتیاط اس میں ہے کہ ڈیڑھ بجے روزہ شروع کیا جائے، لیکن جو ڈھائی بجے شروع کرتے ہیں، جو ساڑھے تین بجے شروع کرتے ہیں، ان کا روزہ بھی درست، اور ڈیڑھ بجے کے بعد جو فجر کی نماز پڑھتے ہیں، ان کی نماز بھی درست، آگے دلیل لکھوائی، فرمایا کہ اس وجہ سے کہ ہم لوگ تو مقلد ہیں، اور مقلد کا کام فتوے پر عمل کرنا ہے، اور یہ تینوں، ڈیڑھ اور ڈھائی اور ساڑھے تین، تین ٹائم ٹیبل والوں کے پاس تینوں طرح کے فتاویٰ ہیں، تو وہ اپنے فتوے پر عمل کر رہے ہیں کسی کو پوچھ کر کے، تو ان میں سے کسی کو غلط نہ کہا جائے۔ کتنی پیاری بات! کتنا پیارا فتویٰ!

انتشار سے بچانے کا اہتمام:

ہم نے حضرت شیخ نور اللہ مرقدہ (مراد حضرت مولانا محمد زکریا صاحب) کے یہاں ۶۳ء میں سب سے پہلے رمضان گذارا تھا، جب حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے سب سے پہلے دفتر کی مسجد میں پورے مہینہ کا اعتکاف فرمایا تھا، انتیس روزے ہوئے اور رات کو ایک بجے کے قریب دیہاتیوں کا ایک وفد آیا، سب لوگ اپنی اپنی عبادت میں مصروف تھے رات کو، اور یہ بہت سارے لوگ پگھڑ باندھے ہوئے آئے، بھئی کیا ہوا؟ تو کہنے لگے کہ چاند کی خبر لے کر آئے ہیں، شہادت لے کر آئے ہیں، تو حضرت کو اطلاع کی معتکف میں، حضرت نے فرمایا کہ مفتی محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس بھیجو، حضرت مفتی محمود صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ بھی سہارنپور میں معتکف تھے، مگر دوسری حکیموں والی مسجد میں جہاں مولانا عاقل صاحب اور مولانا سلمان صاحب کا مکان ہے اس کے

قریب جہاں حضرت ہمیشہ نماز جمعہ پڑھا کرتے تھے، اس میں مفتی محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ معتکف تھے، اس وفد کو وہاں بھیجا، شہادت والوں کو حضرت مفتی محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ان سے تحقیق کی، چاند کیسے دیکھا؟ کہاں پر دیکھا؟ کیا وقت تھا؟ سب تحقیق کے بعد حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو اطمینان ہو گیا، تو حضرت نے فرمایا کہ بھئی چلو! اٹھاؤ ہمارا سامان، حضرت اعتکاف میں تھے، اعتکاف سے مفتی صاحب باہر آ گئے، کسی سے یہ نہیں فرمایا کہ بھئی چلو، فیصلہ لکھو کہ میں فیصلہ کرتا ہوں کہ چاند ہو گیا اور کل عید ہے۔

وہاں سے خدام نے آکر حضرت (شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب) کو اطلاع دی کہ مفتی محمود صاحب نے ان سے شہادت لی اور مفتی صاحب تو اپنے معتکف سے گھر میں کمرہ میں چلے گئے، تو حضرت نے فرمایا کہ اچھا! تو اس کے بعد پھر حضرت بھی کچے گھر آ گئے، مگر وہاں شہر کے کچھ حضرات نے کہا کہ ہمارے پاس تو کوئی آیا نہیں، انہوں نے اس فیصلہ کو نہیں مانا، وہ اُڑ گئے، اور انہوں نے کہا کہ نہیں، ہم تو کل عید کا اعلان نہیں کریں گے، اب ایک ہی شہر سہارنپور میں حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کا دولت کدہ، حضرت کی مسجد اور مظاہر علوم کا دفتر، دنیا کی بڑی مرکزی جگہ، اور وہاں سے گویا ایک فیصلہ ہوا اور شہر والے جو وہاں کے قاضی وغیرہ تھے، پرانے زمانے سے چلے آ رہے تھے، انہوں نے جب یہ فیصلہ کیا کہ کل کو روزہ ہے تو حضرت نے فرمایا مہمانوں سے کہ دفتر کی مسجد میں جہاں اعتکاف تھا، وہاں اشراق کے وقت عید کی نماز ہو گی، مہمان عید کی نماز پڑھ کر جا سکتے ہیں، اور میں ان کے ساتھ عید کی نماز آج نہیں پڑھوں گا، آئندہ کل کو عید کی نماز پڑھوں گا، جہاں مظاہر علوم کے مدرسہ کی مسجد ہے، تو وہاں دوسرے دن، اگلے دن حضرت نے عید کی نماز پڑھی، کوئی جھگڑا نہیں، عید کی نماز تو آج بھی

پڑھی جاسکتی ہے، دوسرے دن بھی پڑھی جاسکتی ہے۔(کرامات وکمالات اولیاء ۱/۸ تا ۱۰)

اس تمہید کے بعد آپ کے سوالات کے جوابات لکھے جاتے ہیں:

(۱) دوسرا گروہ دوسرے دن اسی مسجد میں نماز عید ادا کرسکتا ہے، یہ جماعت ثانیہ نہیں، اس لیے کہ دوسرے دن عید کی نماز پڑھنے والوں کے لیے وہ عید کا پہلا ہی دن ہے۔

(۲) یہی حکم معتکفین کے متعلق ہے کہ جس گروہ کے اعلان پر اعتماد ہو اسی کے مطابق اپنا اپنا اعتکاف پورا کریں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد عبد القیوم راجکوٹی، ۲۶/محرم الحرام ۱۴۳۲ھ

الجواب صحیح: العبد احمد عفی عنہ خانپوری   الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ

ثبوت ہلال کی بابت مرکز اسلام پر اتحاد کا جھنڈا اگاڑنے کی ناکام کوشش

فلکیاتی حساب کی بنیاد پر "جمِ غفیر" کی شرط میں کمی بیشی

انگلینڈ میں غیر سعودیہ کی رؤیت کے قائلین کا طریقۂ کار کیا نبوی طریقہ کے خلاف ہے؟

سوال: (۱) کیا فلکیاتی مفروضہ حسابات کی تھیوری اور میتونی سائکل حساب کے مفروضہ نیوموں اور اس کے مفروضہ امکان رؤیت حسابات کو شرعی ثبوت ہلال کے لیے اثباتاً، نفیاً یا اعانۃً جمِ غفیر کی بنیاد کے طور پر مشروط کیا جاسکتا ہے؟

(۲) چوں کہ ہمارے ہاں مقامی طور پر شاذ و نادر ہی رؤیت ہلال ہوتی ہے (جس پر ہمارا چوبیس سالوں سے زیادہ کا رؤیت ہلال کا ریکارڈ بھی موجود ہے، دیکھئے ہماری ویب سائٹ کا ہوم پیج) اس لیے اختلاف مطالع کے عدم اعتبار کی بنیاد پر فتاویٰ کے مطابق سعودیہ سے نبوی طریقہ پر مبنی ثبوتِ ہلال کے اعلان کی بنیاد پر مرکزی رؤیت ہلال کمیٹی کی طرف سے برطانیہ میں شرعی اعلان پر عمل کئے جانے کی سہولت موجود ہے، باوجود اس کے مراکش اور ساؤتھ افریقہ یا اور کسی جگہ کے چاند کی رؤیت وثبوت ہلال کا ایسا فیصلہ جو نبوی طریقہ کے برخلاف مذکورہ فلکیاتی نیومون کے میتونی حساب کے امکان رؤیت کی بنیاد سے مشروط ہوتا ہو! ایسے کسی فیصلہ پر عمل کرنا کروانا کیا شرعاً جائز ہے؟

(۳) جیسے کہ بعض احناف نے حالتِ صحو میں جمِ غفیر کی شہادت کے لیے شرعی اجتہاد کیا تھا، اس اجتہاد کے حوالہ سے ''جس ۲۹ ویں کی شام میتونی فلکی حساب کی نیومون تھیوری کے مطابق امکانِ رؤیت نہ ہو'' تو اس شام کو اس مردود و غیر منصوص حساب کی بنیاد پر ''شرعی منصوص شہادت'' کو مردود قرار دے کر جمِ غفیر کی شہادت سے اسے مشروط قرار دیا جائے تو یہ مبنیٰ جیسے کہ قطعاً غیر شرعی ونصاً مردود ہے کیا ایسے ناجائز مبنیٰ اور اس کی اعانت کو منصوص نبوی طریقہ وشہادت کے لیے شرط قرار دے کر اس دن ''شرعی شہادت کی قبولیت کے بجائے جمِ غفیر کی شہادت کی شرط'' عائد کی جاسکتی ہے؟ جب کہ احناف نے جو ''شرعی اجتہاد'' کیا تھا اس میں فلکیاتی مردود وناجائز حساب ہرگز اس کا مبنیٰ نہیں تھا بلکہ وہاں تو مبنیٰ ''صحابہ کی منصوص عدالت کے مقابل غیر صحابہ (یا غیر خیر القرون) کی منصوص عدمِ عدالت'' اس کی بنیاد تھی، گویا ان کا یہ اجتہاد اور اس کا مبنی

دونوں باتیں منصوص ومشروع تھیں، جبکہ ''فلکی حساب سے امکانِ رؤیت نہ ہوتو اس دن جمِ غفیر کی شہادت ضروری ہونی چاہیے'' والی سوچ میں، صحابہ وغیر صحابہ کے درمیان منصوص عدالت ''الصحابة کلهم عدول'' کے مثل ''مشروع ومنصوص تفریق'' کا شائبہ تک بھی نہیں، کیوں کہ اس کی بنیاد یعنی ''فلکی امکان رؤیت'' تو مردود من النص (حدیث امی) ہے۔ بینوا و توجروا (ملخصاً)

مولوی یعقوب احمد مفتاحی

ناظم حزب العلماء یو کے ومرکزی رؤیتِ ہلال کمیٹی برطانیہ

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

رؤیت ہلال کا مسئلہ ہر دور میں مختلف فیہ رہا ہے اور رہے گا، اس اختلاف کو ختم کرنے کی کوشش کرنا سعیٔ لاحاصل ہے، بالخصوص ایسے ممالک میں جہاں چاند کی رؤیت کا امکان کم ہو اور سوئے قسمتی سے جہاں کے لوگوں میں ذہنی آزادی ہو، ہر شخص اپنی رائے اور عندیہ کا قائل کرنے میں کوشاں ہو، وہاں اختلاف کے امکانات اور بڑھ جاتے ہیں، آپ نے اپنے استفتاء میں مذکورہ بالا دونوں سبب کا خود اعتراف فرمایا ہے، لیجئے آپ ہی کے الفاظ ملاحظہ کیجئے:

''ہمارے یہاں یورپ میں خاص کر برطانیہ میں موسم کے حالات کی وجہ سے پہلے چاند کی رؤیت شاذ ونادر ہی ہوتی ہے''

اس سے پہلے تحریر فرمایا: ''حالات اس نہج تک خراب ہو چکے ہیں کہ خاص کر جدید مسلم نوجوان نسل کہ جنہیں سائنس کے نام پر عقائد اسلام پر قدم جمائے رکھنے میں بظاہر مشکل پیش آ رہی ہے، خاص کر رؤیت ہلال کے نصوصی مسئلہ میں اس کی بنیاد

پر ان کے قدم لڑکھڑاتے نظر آ رہے ہیں، جو یقیناً علمائے اسلام ونصوص کے محافظین کے لیے ایک بہت بڑی تشویش کی بات ہے۔ الخ‘‘

لہذا ایسے سنگین حالات میں رؤیت ہلال کا مسئلہ حل کرنے کے لیے اتحاد کا جھنڈا لے کر کھڑا ہونا اور اسے مرکز اسلام پر گاڑنے کی کوشش کرنا بظاہر بے سود ہے۔

فقیہ الامت حضرت مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی نور اللہ مرقدہ نے چاند کے مسئلہ میں اختلاف کے دس اسباب ذکر فرمائے ہیں۔ حضرت فرماتے ہیں:

چاند کے مسئلہ میں گڑبڑ اور اختلافی صورت ہمیشہ سے رہی ہے اور ہمیشہ رہے گی، قرون مشہود لہا بالخیر خلافت راشدہ کے دور میں بھی یہ رہا، اس اختلاف کو ختم کرنے کی سعی قدرت کا مقابلہ کرنا ہے، اس لیے کہ:

پہلا سبب اختلاف تو یہ ہے کہ چاند کبھی انتیس کو نظر آتا ہے کبھی تیس کو۔

دوسرا سبب یہ ہے کہ جب چاند نظر آتا ہے ہر جگہ کا مطلع صاف نہیں رہتا، کہیں صاف کہیں غبار آلود؛ اس لیے کہیں نظر آیا کہیں نظر نہ آیا۔

تیسرا سبب یہ ہے کہ ہر مہینہ کا چاند برابر نہیں ہوتا، کبھی باریک کبھی موٹا۔

چوتھا سبب یہ ہے کہ ہر مہینہ کا چاند ایک جگہ سے نظر نہیں آتا، کبھی مغرب سے مائل بہ جنوب، کبھی عین مغرب میں، کبھی مائل بہ شمال نظر آتا ہے۔

پانچواں سبب یہ ہے کہ دیکھنے والوں کی سب کی نظر ایک نہیں، کسی کی قوی کسی کی ضعیف، کوئی بغیر چشمہ کے دیکھے کسی کو چشمہ سے بھی نظر نہ آوے۔

چھٹا سبب یہ ہے کہ گواہی دینے والے سب یکساں نہیں، کسی کی گواہی مقبول کسی کی مردود۔

ساتواں سبب یہ ہے کہ کوئی شخص ایسا نہیں کہ جس کی بات ماننے کو سب تیار ہو جائیں، جس کا شکوہ آپ کو بھی ہے۔

آٹھواں سبب یہ ہے کہ ہر جگہ رؤیت ہلال کمیٹی موجود نہیں، نہ بنانے کے لیے تیار ہیں، باوجود یہ کہ بارہا درخواست کی گئی۔

نواں سبب یہ ہے کہ جہاں رؤیت ہلال کمیٹی موجود ہے وہاں بھی اس کے تمام ارکان مسائل شرع کے ماہر واحکام سنت کے پابند نہیں۔

دسواں سبب یہ ہے کہ ہر ریڈیو پر اپنا قبضہ نہیں کہ پابندی عائد کی جاسکے کہ اعلان کیا جائے یا نہ کیا جائے، نہ ہر جگہ عالم کو اس کا مکلف کیا جاسکتا ہے کہ ریڈیو اسٹیشن پر آکر خود اعلان کرے نہ یہ اس کے قبضہ میں ہے۔

ان اسباب عشرہ کے پیش نظر آپ ہی بتائیں کہ یہ مسئلہ کیسے حل کیا جائے؟ (فتاویٰ محمودیہ ۱۰/۷۱)

مذکورہ اسباب عشرہ کے ساتھ دو سبب کا اضافہ احقر کی طرف سے بھی کر لیجئے۔

گیارہواں سبب یہ ہے کہ آلات رصدیہ کی خبر کو یقین کا درجہ دینا کہ جب تک حسابی قواعد سے امکان رؤیت نہ ہو ثبوت ہلال ناممکن ہے۔

بارہواں سبب یہ ہے کہ ہر گروہ کا اپنی بات دوسرے پر تھوپنے کی دھن سوار ہونا، گو اس میں فقہ کے منصوص مسئلہ کی خلاف ورزی لازم آتی ہو۔

اس تمہید کے بعد آپ کے سوالات کے جوابات لکھے جاتے ہیں:

① ③ فلکیاتی حساب شرعی حجت نہیں، نہ اثباتاً نہ نفیاً، لہٰذا ثبوت ہلال کے لیے اس کو مشروط نہیں کیا جاسکتا ہے، اس سلسلہ میں حضرات فقہاء کی صریح عبارتیں آگے

آرہی ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ رمضان کا چاند دو باتوں میں سے ایک بات کے ساتھ ثابت ہو جائے گا، یا تو انتیس شعبان کو چاند نظر آجائے گا، یا پھر تیس دن پورے کئے جائیں گے اور اس پر علمائے امت کا اجماع ہے، رمضان کے علاوہ باقی اور مہینوں کے چاند کے ثبوت کے لیے بھی یہی حکم ہے کہ ان باتوں میں سے ایک بات کے ساتھ ثابت ہو جائے؛ البتہ رمضان اور دیگر مہینوں میں ابر وغبار وغیرہ کے روز اس بارے میں فرق ہے کہ چاند کی رؤیت میں کتنے آدمیوں کا قول مانا جائے؟ جس کی تفصیل یہ ہے: رمضان کا چاند ابر وغیرہ کے دن ایک آدمی کی گواہی سے ثابت ہو جاتا ہے جیسا کہ متون وشروح میں اس کا بیان ہے، اور اگر آسمان میں ابر نہ ہو یعنی مطلع صاف ہو تو ایسی بڑی جماعت کی گواہی قبول ہوگی جن کے خبر دینے سے یقین ہو جائے یعنی اس خبر سے غلبۂ ظن حاصل ہو جائے، عید الفطر کے چاند میں آسمان پر ابر یا غبار وغیرہ کی موجودگی میں گواہوں کے عادل ہونے کی شرط کے ساتھ شہادتِ اموال نصاب (یعنی دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں) اور لفظ اشھد (میں گواہی دیتا ہوں) اور حد قذف سے بچا ہوا ہونا بھی شرط ہے، اور اگر آسمان صاف ہو تو جب تک ایک جماعت گواہی نہ دے تب تک گواہی مقبول نہ ہوگی جیسا کہ رمضان کے چاند کا حکم ہے۔ (ماخوذ از عمدۃ الفقہ ۱۵۳ تا ۱۶۱)

حنفی فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ انتیس شعبان کا چاند ہو یا انتیس رمضان کا، ابر کے روز ثبوت رمضان میں ایک عادل آدمی کی شہادت اور عید الفطر کے لیے دو عادل کی شہادت کافی ہے، جم غفیر کی شرط نہیں۔ فقہاء کی عبارتیں حسب ذیل ہیں:

ہدایہ میں ہے: واذا كان بالسماء علة قبل الامام شهادة الواحد العدل فى رؤية الهلال رجلاً كان او امرأة حراً كان او عبداً لانه امر

دینی فیشبہ روایۃ الاخبار (ہدایہ اولین۲۱۵)

بدائع میں ہے: وان کانت السماء متغیمۃ تقبل شھادۃ الواحد بلاخلاف بین اصحابنا. (بدائع الصنائع ۲/ ۲۲۱)

کنز میں ہے:وقبل بعلۃ خبرعدل ولوقناًاوانثی لرمضان وحرین او حر وحریتین للفطر. (کنز الدقائق بھامش البحر الرائق ۲/ ۲۸۶)

درمختار میں ہے:وقبل بلا دعویٰ و بلا لفظ اشھد و بلا حکم و مجلس قضاء لانہ خبر لا شھادۃ للصوم مع علۃ کغیم و غبار خبر عدل الخ. (در مختار مع رد المحتار ۳/ ۳۵۲)

مبسوط میں ہے:ولوشھدرجل واحدبرؤیۃ ھلال رمضان وبالسماء علۃ قبلت شھادتہ اذا کان عدداً اھ(المبسوط ۲/ ۱۵۳)

محیط برہانی میں ہے:الواحد اذا شھد بھلال رمضان فان کانت السماء متغیمۃ تقبل شھادۃ الواحد اذا کان مسلماً اھ. (المحیط البرھانی ۳ / ۳۳۸)

فتاویٰ عالمگیری میں ہے:ان کان بالسماء علۃ فشھادۃ الواحد علیٰ ھلال رمضان مقبولۃ اھ. (الفتاویٰ الھندیہ ۱ /۱۹۷)

فتاویٰ قاضی خان میں ہے:شھادۃ الواحد علیٰ ھلال رمضان مقبولۃ اھ (فتاویٰ قاضی خان بھامش الھندیہ ۱/ ۱۹۶)

شرح الوقایہ میں ہے:وقبل بلا دعویٰ ولفظ اشھد للصوم مع غیم خبر فرداھ(شرح الوقایہ ۱/ ۲٤٦)

تبیین الحقائق میں ہے:ای اذا کان بالسماء علۃ یقبل فی ھلال رمضان خبر واحد عدل اھ(تبیین الحقائق۱ /۳۱۹)

الواحد اذا شھد برؤیۃ ھلال رمضان فان کانت السماء متغیمۃ

وفی الهداية او غبار او نحوه يقبل شهادة الواحد(فتاویٰ تاتار خانیہ ۳/ ۳۵۸)

فقہاء کی مذکورہ تصریح کے خلاف انتیسویں کی شام کو فلکی حساب سے امکان رؤیت نہ ہو، ایسے موقع پر ثبوت ہلال کے لیے فلکی حساب کو بنیاد بنا کر جم غفیر کو شرط قرار دینا درست نہیں؛ بلکہ اس طرح فقہ کے مطلق مسئلہ کو مقید کرنا شان تقلید کے بھی خلاف ہے، ہم مقلد ہیں، حنفی فقہاء نے اپنی معتبر کتب میں جو لکھا ہے اس کا اتباع ضروری ہے، یہ بات اہل علم پر مخفی نہیں کہ فقہاء کی کتابوں میں یہ عادت رہی ہے کہ وہ قیود وشروط وغیرہ اس بات پر تنبیہ کرنے لیے ذکر فرماتے ہیں کہ جہاں یہ قید وشرط نہ پائی جائے وہ حکم سے خارج ہے، اور مسکوت کا حکم منطوق کے برخلاف ہے، اور یہ بات فقہاء کے درمیان بلا نکیر شائع وذائع ہے، اور اسی وجہ سے کوئی ایسا آدمی نہیں مل سکتا جس نے اس کے خلاف تصریح کی ہو۔

وكذا يقال فى مفهوم الروايات،فان العلماء جرت عادتهم فى كتبهم، علىٰ انهم يذكرون القيود و الشروط و نحوها تنبيهاً علىٰ اخراج ما ليس فيه ذلك القيد و نحوه،و ان حكمه مخالف لحكم المنطوق و هذا مما شاع و ذاع بينهم بلا نكير؛ و لذا لم ير من صرح بخلافه.

(شرح عقود رسم المفتى ١٧٤)

رسم المفتى فى زماننا من اصحابنا اذا استفتى عن مسئلة ان كانت مروية عن اصحابنا فى الروايات الظاهرة،بلا خلاف بينهم،فانه يميل اليهم، و يفتى بقولهم،ولا يخالفهم برأيه،وان كان مجتهداً متقناً؛ لان الظاهر ان يكون الحق مع اصحابنا،ولا يعدوهم،و اجتهاده لا يبلغ اجتهادهم،ولا ينظر الىٰ قول من خالفهم،ولا تقبل حجته ايضاً،لانهم

عرفوا الأدلة وميزوا بين ما صح و ثبت وبين ضده.

(شرح عقود رسم المفتی ۱۱۹،۱۱۸)

جم غفیر کو شرط قرار دینے کی جو وجہ آپ نے تحریر فرمائی ''احناف نے جو شرعی اجتہاد کیا تھا اس میں فلکیاتی مردود ونا جائز حساب ہرگز اس کا مبنی نہیں تھا بلکہ وہاں تو مبنی صحابہ کی منصوص عدالت مقابل غیر صحابہ (یا غیر خیر القرون) کی منصوص عدم عدالت'' اس کی بنیاد تھی۔ انتہی بلفظہٖ

فی الجملہ صحیح ہے لیکن دور حاضر میں مجتہدین جیسے اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا ہے، لہٰذا اس مسئلہ کے حل کا جو مبنی (اجتہاد) تھا، دور حاضر میں مفقود ہے، اور اگر بالفرض فقہاء کی تصریح کے خلاف آپ کی یہ بات تسلیم کر کے انتیسویں کے چاند کے ثبوت کے لیے جم غفیر کی شرط لگادی جائے تو اسی مسئلہ کے دوسرے پہلو میں بھی ترمیم کا سوال اُٹھ سکتا ہے، جس کی تفصیل یہ ہے: انتیسویں کے روز اگر آسمان پر کوئی علت نہ ہو (یعنی مطلع صاف ہو) تو چاند کے ثبوت کے لیے جم غفیر شرط ہے، جو لوگ فلکی حساب کے دلدادہ اور شریعت کو موجودہ ایجادات کے سانچہ میں ڈھالنا چاہتے ہیں، جس کا آپ نے بھی شکوہ کیا ہے، وہ کہیں گے کہ اس مسئلہ میں جم غفیر کی شرط فقہاء نے غلبۂ ظن حاصل کرنے کی خاطر لگائی ہے، فقہاء کے دور میں موجودہ وسائل اور ایجادات نہیں تھے، اس لیے غلبۂ ظن حاصل کرنے کے لیے انہوں نے جم غفیر کی شرط لگائی تھی، موجودہ ترقی یافتہ سائنس سے غلبۂ ظن نہیں، بلکہ یقین یا عین الیقین حاصل ہو جاتا ہے، لہٰذا جم غفیر کی اب ضرورت نہیں، یہ صرف احتمال نہیں؛ بلکہ واقعہ ہے کہ سائنس کی بات پر اس قدر لوگوں نے اذعان ویقین کر رکھا ہے کہ اس کی بنیاد پر سر کی آنکھوں سے دیکھے

ہوئے چاند اور رؤیت عامہ کا انکار کر دیا ہے، انگلینڈ سے آیا ہوا استفتاء- جو ایک ذمہ دار عالم نے یہاں دارالافتاء میں بھیجا تھا- کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''حضرت آج کل رؤیت کا لفظ بھی کثرت وشدت سے یہاں انگلینڈ میں بیان کیا جار ہا ہے، میں نے اس کا مطلب دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ افق پر فلکی حساب سے رؤیت ہلال کا امکان ہونا ہے، اگر ایسا امکان نہیں ہے تو انتیسویں کو بھی رؤیت نہیں ہوسکتی، اگر کوئی شخص اس صورت میں رؤیت کا دعوی کرتا ہے تو وہ خاطی یا کاذب اور موہوم ومشکوک اور متہم سمجھا جائے گا، بعض حضرات تو اس امکان اور عدم امکان کو اتنا قطعی ویقینی اور ضروری سمجھتے ہیں کہ انہوں نے قسم کھالی کہ اگر عدم امکان کی صورت میں پورا شہر بھی رؤیت کا دعوی کرے تو ہم نہیں مان سکتے۔ انتہیٰ بلفظہٖ۔''

اس ہٹ دھرمی کو ملاحظہ کیجیے اور دورِ ترقی کے دلدادہ پر ماتم کیجیے، خلاصہ یہ ہے کہ جس صورت میں جم غفیر شرط نہیں ہے، وہاں جدید اجتہاد کی روشنی میں یا فلکی حساب کی بنیاد پر اگر مشروط قرار دیا گیا تو جدید اور ترقی یافتہ ذہن کے حاملین کی طرف سے جس صورت میں جم غفیر مشروط ہے، وہاں سے اس شرط کو غیر ضروری ہونے کا مطالبہ بھی ہوسکتا ہے، اس طرح کے شبہات ومطالبات سے اگر فقہی اجتہادی مسائل میں قطع وبرید کی گئی تو ذخیرۂ فقہ کی خیر نہیں، فقہ پر سے اعتماد ہی اٹھ جائے گا، احناف نے انتیسویں کے چاند کے ثبوت کے لیے جم غفیر کی شرط لگائی، اس کا مبنی صرف اور صرف صحابہ رضی اللہ عنہم کی عدالت نہیں جیسا کہ آپ سمجھ رہے ہیں؛ بلکہ یہ اجتہاد حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عمل سے مؤید ہے (یعنی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا انتیسویں کو ایک آدمی کی شہادت پر ثبوت ہلال کا فیصلہ فرمانا) اس نوع کی احادیث یوم غیم پر محمول ہیں؛ لہٰذا یہ اجتہاد مؤید بالنص ہے،

اس مسئلہ کا مبنیٰ ''نرا اجتہادِ احناف'' کہنا درست نہیں، اگر چہ مقلد کے لیے ''مجتہد کا نرا اجتہاد'' اور کتب فقہ میں لکھے ہوئے مسائل حجت ہیں، ہماری معلومات کے مطابق وہ مؤید بالنص ہوں یا نہ ہوں۔ مقلد کی تعریف ہے: اخذ بقول الغیر بغیر معرفۃ دلیلہ (شرح عقود رسم المفتی ۱۳۲)

مذکورہ مسئلہ کے مؤید بالنص ہونے کی دلیل حسبِ ذیل عبارت ہے: محدث ناقد حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے ترجمۃ الباب باندھا: ''باب افتراض الصوم بشهادة مسلم واحد عدل او مستور اذا كان بالسماء علة'' اس کے ذیل میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث نقل فرمائی:

''عن ابن عمر قال ترأيا الناس الهلال فاخبرت رسول الله ﷺ انى رأيته فصام، وامر الناس بصيامه رواه ابو داؤد و الدارمى قال ميرك نقلاً عن التصحيح: ورواه الحاكم و قال: علىٰ شرط مسلم، ورواه البيهقى اه وصحح ابن حبان، و قال النووى: اسناده على شرط مسلم.

(مرقاة۲/ ۵۰۷)

قال المؤلف دلالة الحديث الاول من فعله ﷺ ان شهادة المسلم الواحد العدل تكفى لايجاب الصوم ظاهرة، و كون ابن عمر عدلاً معلوماً له ﷺ غير خفى، والتقييد بعلة فى السماء ليس مذكوراً فى الحديث لكن الدليل عليه ما ذكره صاحب الهداية و نصه: واذا لم تكن بالسماء علة لم تقبل الشهادة حتى يراه جمع كثير يقع العلم بخبرهم لان التفرد بالرؤية فى مثل هذه الحالة يوهم الغلط فيجب التوقف فيه حتى يكون جمعاً كثيراً بخلاف ما اذا كان بالسماء علة لانه قد ينشق

الغیم عن موضع القمر فیتفق للبعض النظر اھ (۱/ ۱۹۵، ۱۹۶)

ذلك ان تستدل علیه بما رواه ابو داؤد وسکت عنه عن ابی هریرة ذکر النبی ﷺ فیه (ای فی حدیث ایوب المذکور فی السنن قبل) قال: وفطرکم یوم تفطرون، و اضحاکم یوم تضحون، وکل عرفة موقف، وکل منی منحر، وکل فجاج مکة منحر، وکل جمع موقف اھ (۱/ ۳۲۵)

وفی سنن الترمذی: قال ﷺ "الصوم یوم تصومون، والفطر یوم تفطرون، والاضحی یوم تضحون" وفیه ایضاً: غریب حسن، وفسر بعض اهل العلم هذا الحدیث فقال: ان ما معنی هذا الصوم و الفطر مع الجماعة و عظم الناس اھ (۱/ ۹۳)

وتقریره انه علیه الصلاة والسلام اضاف الصوم والفطر والاضحیة الی الجماعة فی قوله "تصومون و تفطرون و تضحون" فلابد فی اصل الحکم من الجماعة الکثیرة او جمیع المسلمین الموجودین فی بلدة مثلاً فی هذه الاحکام الا اذا عرض عارض ککون السماء مغیمة مثلاً فله حکم آخر ثابت بالشرع کحدیث المتن (اعلاء السنن ۹/ ۱۰۹، ۱۱۰)

ابن عمر رضی اللہ عنہ کی مذکورہ حدیث کی شرح کرتے ہوئے محدث کبیر حضرت مولانا خلیل احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: وقبول خبر الواحد فی الصوم محمول علی ما اذا کان فی السماء علة (بذل المجهود ۱۱/ ۱۴۱)

فلکیاتی حساب ثبوت ہلال میں حجت نہیں اس پر تمام فقہاء کا اتفاق ہے، اگر اعانۃً جم غفیر کی بنیاد کے طور پر فلکیاتی حساب کو مشروط کہا جائے تو اس کا حجت ماننا لازم آتا ہے جو درست نہیں، فقہاء کی عبارات حسب ذیل ہیں:

چوتھی صدی کے مشہور حنفی فقیہ مفسر اور اصولی عالم امام ابوبکر جصاص رازی رحمۃ اللہ علیہ (م ۳۷۰ھ) اپنی تفسیر میں تحریر فرماتے ہیں:

وقد اختلف فی معنی قول النبي ﷺ فان غم علیکم فاقدروا له فقال القائلون اراد به اعتبار منازل القمر فان کان فی موضع القمر لو لم یحل دونه سحاب وقترة وروی یحکم بحکم الرؤیة فی الصوم والافطار وان کان علی غیر ذلك لم یحکم له بحکم الرؤیة وقال آخرون فعدوا شعبان ثلاثین یوما اما التاویل الاول فساقط الاعتبار لامحالة لایجابه الرجوع الی قول المنجمین ومن تعاطی معرفة منازل القمر ومواضعه و هو خلاف قول الله تعالی ﴿یسئلونك عن الاهلّة قل هی مواقیت للناس﴾ فعلق الحکم فیه برویةالاهلة ولما کانت هذه عبادة تلزم الکافة لم یجزان یکون الحکم فیه متعلقا بمالا یعرفه الا خواص من الناس ممن عسی لا یسکن الی قولهم والتاویل الثانی هو الصحیح وهو قول عامة الفقهاء وابن عمر راوی الخبر وقد ذکر عنه فی الحدیث انه لم یکن یا خذ بهذا الحساب.

(احکام القرآن: ۱/ ۲۰۱، دارالکتب العربی بیروت)

پانچویں صدی کے مشہور حنفی فقیہ شمس الائمۃ الحلوانی رحمۃ اللہ علیہ (م ۴۴۸ھ) فرماتے ہیں:

من قال بانه یرجع الی قول اهل الحساب عند الاشتباه بعید واستدل بحدیث من اتی کاهنا (الی قوله) الشرط عندنا فی وجوب الصوم والافطار رؤیة الهلال ولا یوخذ فیه بقول المنجمین ثم رقم لمجدالائمة الترجمانی وقال فقد اتفق اصحاب ابی حنیفة والشافعی انه لا اعتماد علی قول

المنجمين في هذا. (شرح منظومه ابن وهبان١/ ٩٢ مطبوعة الوقف المدنى ديوبند)

آٹھویں صدی کے مشہور فقیہ علّامہ عالم ابن علاء انصاری اندر پتی دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (م ۸۶ ےھ) فرماتے ہیں:

ذكر في التهذيب في كتاب الصوم: يجب صوم رمضان برؤية الهلال او باستكمال شعبان ثلاثين، ولا يجوز تقليد المنجم في حسابه لا في الصوم ولا في الافطار وهل للمنجم ان يعمل بحساب نفسه؟ ففيه وجهان احدهما انه يجوز والثاني لا يجوز.

(الفتاى التاتارخانيه ٢/ ٣٥٧ مطبوعه مجلس دائرة المعارف عثمانيه حيدرآباد)

نویں صدی کے مشہور محدث علامہ ابن حجر عسقلانی شافعی رحمۃ اللہ علیہ (م ۸۵۲ھ) تحریر فرماتے ہیں:

والمراد بالحساب هنا حساب النجوم وتسييرها، ولم يكونوا يعرفون من ذلك ايضاً الا النزر اليسير، فعلق الحكم بالصوم وغيره بالرؤية لرفع الحرج عنهم في معاناة حساب التسيير واستمر الحكم في الصوم ولو حدث بعدهم من يعرف ذلك، بل ظاهر السياق يشعر بنفى تعليق الحكم بالحساب اصلاً، ويوضحه قوله في الحديث الماضى "فان غم عليكم فاكملوا العدة ثلاثين" ولم يقل فسئلوا اهل الحساب، والحكمة فيه كون العدد عند الاغماء يستوى فيه المكلفون فيرتفع الاختلاف والنزاع عنهم، وقد ذهب قوم الى الرجوع الى اهل التسيير في ذلك وهم الروافض، ونقل عن بعض الفقهاء موافقتهم، قال الباجى: واجماع السلف الصالح حجة عليهم، وقال ابن بزيزة: وهو مذهب باطل فقد نهت الشريعة عن الخوض في علم النجوم لانها حدس وتخمين ليس فيها قطع

ولاظنّ غالب،مع انه لو ارتبط الامر بها لضاق اذ لا يعرفها الا القليل.

(فتح الباری٤/ ١٢٧ مطبوعه دار المعرفة بيروت)

دسویں صدی کے مشہور حنفی فقیہ ابن نجیم مصری رحمۃ اللہ علیہ (م ۹۷۰ھ) اپنی مشہور کتاب "النہر الفائق" میں تحریر فرماتے ہیں:

ان صوم رمضان لايلزمه الا باحد هذين فلا يلزم بقول المؤقتين انه يكون فى السماء ليلة كذا وان كانوا عدولا فى الصحيح كما فى الايضاح، قال مجد الائمة (الترجمانی) وعليه اتفق اصحاب ابى حنيفة و الشافعى الخ (النهر الفائق ٢ /١٠ مطبوعه دار الكتب العلمية بيروت)

لاعبرة بقول المنجمين قال فى غاية البيان و من قال يرجع فيه الىٰ قولهم فقد خالف الشرع لانه روى عنه ﷺ انه قال من اتى كاهنا او منجما فصدقه بما قال فهو كافر بما انزل على محمد.

(البحر الرائق ٢ /٢٨٤ دارالمعرفه بيروت)

گیارہویں صدی کے مشہور حنفی فقیہ علامہ عبدالرحمٰن بن محمد رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۰۷۸ھ) -جوداماد کے لقب سے مشہور ہیں-تحریر فرماتے ہیں:

وفى القهستانى ان ما قال اهل التنجيم غير معتبر فمن قال انه يرجع فى ذلك الىٰ قولهم فقد خالف الشرع.

(مجمع الانهر فى شرح ملتقى الابحر ١/٢٣٧ مطبوعه دار احياء التراث بيروت)

بعینہٖ یہی عبارت "جامع الرموز:١ /٣٥٦ مطبوعہ ایچ ایم کراچی" میں ہے

بارہویں صدی کے مشہور عالم ربانی اسرار شریعت کے ماہر حضرت شاہ ولی صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۱۷۶ھ) رقمطراز ہیں:

مبنی الشرائع علی الامور الظاهرة عند الاميين دون التعمق والمحاسبات النومية، بل الشريعة واردة باخمال ذكرها وهو قوله ﷺ: انا امة امية لا نكتب ولا نحسب.

(حجة الله البالغة۲/ ۵۱ مطبوعة ادارة الطباعة المنيرية دمشق)

تیرہویں صدی کے مشہور فقیہ عالم خاتم الفقہاء علامہ سید محمد امین ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۲۵۲ھ) تحریر فرماتے ہیں:

(لا عبرة بقول الموقتين) اى فى وجوب الصوم على الناس بل فى المعراج لا يعتبر قولهم بالاجماع. (رد المحتار على الدر المختار۲/ ۱۰۰ مطبوعة كوئٹة)

علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک رسالہ "تنبيه الغافل و الوسنان على احكام هلال رمضان" تحریر فرمایا ہے، اس میں ایک مستقل فصل قائم فرما کر اس مسئلہ پر کلام کیا ہے، جس میں مذاہب اربعہ کی معتبر کتابوں کی عبارتوں سے اجماع ثابت کیا ہے کہ رؤیت ہلال میں اہل حساب کا قول معتبر نہیں، ملاحظہ کیجئے:

الفصل الثالث فى بيان حكم قول علماء النجوم و الحساب: فنقول قد صرح علماؤنا و غيرهم بوجوب التماس الهلال ليلة الثلاثين من شعبان فان رأوه صاموا والا اكملوا العدة فاعتبروا الرؤية او اكمال العدة اتباعا للاحاديث الآمرة بذلك دون الحساب والتنجم وقد اتفقت عبارات المتون وغيرها من كتب علمائنا الحنفية على قولهم يثبت رمضان برؤية هلاله و بعد شعبان ثلاثين (الى قوله) فلا يلزم بقول الموقتين انه يكون فى السماء ليلة كذا وان كانوا عدولا فى الصحيح كما فى الايضاح قال مجد الأئمة وعليه اتفق اصحاب ابى حنيفة الا

النادر والشافعی الخ (رسائل ابن عابدین ۱/ ۲۴۴، ۲۴۵)

آگے مالکیہ کا مذہب نقل کرتے ہوئے لکھا ہے:

واما عند المالكية ففى مختصر الشيخ خليل انه لايثبت بقول المنجم الخ.

اسی صفحہ پر شافعیہ کے بارے میں رقمطراز ہیں:

(واماعند الشافعية) ففى الانوار للاردبيلى ولا يجب بمعرفة منازل القمر لا على العارف بها ولا غيره انتهى وفى ينابيع الاحكام ولاعبرة بقول المنجم مطلقا فلايصوم وان علم بالحساب انه اهل على الاظهر اذ تحكيمه قبيح شرعاً. (ایضاً۱/ ۲۴۷)

حنابلہ کا مسلک بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

ففى الغاية وشرحهامن باب صلاة الكسوف ولاعبرة بقول المنجمين فى كسوف ولا غيره مما يخبرون به ولا يجوز العمل به لانه من الرجم بالغيب فلا يجوز تصديقهم فى شئ من المغيبات انتهى (ایضاً ۱ /۲۴۹)

چودہویں صدی میں سائنس نے خوب ترقی کی۔ چاند، سورج اور سیاروں کے بارے میں نت نئی تحقیقات پیش کیں، قرآن اور احادیث کے بہت سے وہ واقعات اوراحوال- جوسابق دور میں سمجھ سے بالاتر تھے- جدید سائنس کی تحقیقات نے ان کا سمجھنا آسان کردیا۔ بایں ہمہ چودہویں صدی کے علماء ومفتیان کرام نے بھی رؤیت ہلال کا دارومدار شرعی ثبوت پر رکھا، حساب وآلات رصدیہ پر نہیں۔

ذیل میں چودہویں صدی کے علماء کرام ومفتیان کرام کی کتابوں کے حوالے پیش کئے جاتے ہیں:

① فیض الباری ۳ / ۱۵۲، مطبوعہ مجلس علمی ڈابھیل ② مجموعہ فتاویٰ مولانا عبدالحی لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ جلد اول کتاب الصوم ۲۸۰ - ۲۸۱، مطبوعہ یوسفی پریس لکھنؤ ③ مجموعہ رسائل لکھنوی ۲ / ۵ ④ فتاویٰ دار العلوم مدلل ۶ / ۳۶۷ تا ۳۰۷، مطبوعہ دار العلوم دیوبند ⑤ عزیز الفتاویٰ ۱ / ۳۸۳، مطبوعہ دار الاشاعت کراچی ⑥ فتاویٰ شیخ الاسلام ۵۶، ۵۷، مطبوعہ مکتبہ دینیہ دیوبند ⑦ رؤیت ہلال ۳۰، ۳۲ ⑧ احکام القرآن ۱ / ۱۹۵، مطبوعہ ادارۃ القرآن و العلوم الاسلامیہ کراچی ⑨ معارف السنن ۶ / ۷ ⑩ فتاویٰ محمودیہ کراچی ۱۰ / ۱۱۸ ⑪ فتاویٰ رحیمیہ ۷ / ۳۷۷، مطبوعہ رحیمیہ راندیر ⑫ آپ کے مسائل اور ان کا حل ۳ / ۲۶۱، مطبوعہ نعیمیہ بک ڈپو دیوبند ⑬ احسن الفتاویٰ ۴ / ۴۹۲، مطبوعہ دار الاشاعت دہلی۔

② اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿فاسئلوا اھل الذکر ان کنتم لا تعلمون﴾ (النحل) (ترجمہ: اگر تم کو علم نہیں تو دوسرے اہل علم سے پوچھ دیکھو)۔ اسی وجہ سے آداب استفتاء میں لکھا ہے: ''جو مسئلہ معلوم نہ ہو وہ مسئلہ پوچھنا چاہیے، اس ذہن یا طریقہ سے استفتاء پیش کرنا کہ اس کا حکم وہی بتلایا جائے جو مستفتی کا منشاء ہے، درست نہیں''۔ یہ بھی لکھا ہے کہ: ''مستفتی کے ذہن میں پیش آمدہ سوال کا کوئی جواب ہو تو بھی استفتاء میں ظاہر نہ کرے''۔

ینبغی للمستفتی أن یتأدب مع المفتی و یبجل فی خطابه و جوابه (الی ان قال) ولا یقل اذا اجابه ھکذا ''قلت انا'' او ''کذا وقع لی''. (شرح عقود رسم المفتی، فصل فی آداب المستفتی و صفته و احکامه ۳۵)

استفتاء میں مذکورہ امور کی رعایت نہیں کی گئی، جو لوگ بلا دلیل شرعی سعودیہ کی

رؤیت کے قائل نہیں، ان کے بارے میں آپ نے تحریر فرمایا ''باوجود اس کے مراکش اور ساؤتھ افریقہ یا اور کسی جگہ کے چاند کی رؤیت وثبوت ہلال کا ایسا فیصلہ جو نبوی طریقہ کے برخلاف مذکورہ فلکیاتی نیومون کے میتھونی حساب کے امکان رؤیت کی بنیاد پر مشروط ہوتا ہے! ایسا کسی کے فیصلہ پر عمل کرنا اور کروانا شرعاً جائز ہے''؟ انتہی بلفظہٖ۔

نقل کردہ عبارت میں مفتی کا کام خود مستفتی نے انجام دے دیا ہے، یعنی مراکش اور ساؤتھ افریقہ یا اور کسی جگہ کے فیصلہ پر ''نبوی طریقہ کے خلاف'' کا حکم آپ نے خود لگا دیا ہے۔ ظاہر سی بات ہے جو فیصلہ نبوی طریقہ کے خلاف ہو اس پر عمل کرنا یا کروانا جائز نہیں، خود مستفتی بھی اس جواب سے واقف ہے۔ لیکن یہ حکم اس وقت ہے جب واقعۃً وہ فیصلہ نبوی طریقہ کے خلاف ہو، جو لوگ مراکش یا ساؤتھ افریقہ یا اور کسی جگہ کی رؤیت کے قائل ہیں، کیا وہ حضرات فیما بینہ وبین اللہ اپنے یہاں ثبوت ہلال کے طریقۂ کار کو نبوی طریقہ کے برخلاف سمجھتے ہیں؟ یقیناً جواب نفی میں ہوگا۔ اگر جواب اثبات میں ہو جیسا کہ آپ کا گمان ہے تو ماضی میں مراکش کو بنیاد بنا کر ۲۰/ سال عیدین ورمضان کے ثبوت پر جو عمل کیا گیا تھا، اس کا کیا حکم ہوگا؟ فافہم وتدبر. اس کا فیصلہ سوچ سمجھ کر خود ہی کرلیں۔

اس سال ۱۴۳۱ھ کے رمضان میں حزب العلماء کے فیصلہ ''ایک روزہ کی قضاء'' پر عوام کا جو ردعمل ہوا کہ ہمارا روزہ قضا نہ کرنے کا وبال ان لوگوں پر ہوگا جنہوں نے اس کی قضا سے منع کیا ہے جس کا ذکر آپ کے دوسرے استفتاء میں ہے، وہ بھی مدنظر

رکھیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد عبد القیوم راجکوٹی، ۱۲/ صفر المظفر ۱۴۳۲ھ

الجواب صحیح: العبد احمد عفی عنہ خانپوری　　الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ

رؤیتِ ہلال میں اختلاف ہو تو عید و قربانی کیسے ادا کریں؟

سوال: امسال عید الاضحیٰ کے موقع پر جنوبی گجرات میں ۲۹ر کے چاند کے حساب سے سنیچر، اتوار، پیر کو قربانی ہوئی، اور شمالی گجرات میں ۳۰ر کے چاند کے حساب سے اتوار، پیر اور منگل کو قربانی کی گئی (کیوں کہ اس علاقہ میں چاند نظر نہیں آیا تھا، حالاں کہ وہاں پر بھی ۲۹ر کے چاند کی اطلاعات پہنچ چکی تھی، پھر بھی اتوار، پیر اور منگل تین دن قربانی کرتے رہے) اور تکبیر تشریق بھی سنیچر سے شروع کی، تو دریافت طلب بات یہ ہے کہ منگل کی قربانی صحیح ہوئی یا نہیں؟ (اگر صحیح نہیں ہوئی تو اب کیا صورت ہے؟) نیز تکبیر تشریق بھی ایک دن کی چھوٹ گئی، تو کیا بستی والے گنہگار ہوں گے کہ نہیں؟ اگر تارک تکبیر تشریق کی وجہ سے پوری بستی گنہگار ہوئی تو توبہ کا کیا طریقہ ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً

جہاں رویت ہلال کمیٹی قائم ہے، اور اس میں ثقہ، ماہرِ شریعت علماء موجود ہیں، وہاں والوں کو اس کے فیصلہ کے مطابق عید کرنا چاہیے، اگر شمالی گجرات میں ہلال کمیٹی کو ہلالِ عید الاضحیٰ کا شرعی ثبوت و شہادت میسر نہ آنے کی وجہ سے اس نے اتوار کی عید کا اعلان کیا، تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، عہدِ صحابہ (قرون مشہود لہا بالخیر) میں بھی اس نوع کے واقعات ہوئے ہیں۔ جو حضرات مسائل شرعیہ سے واقف ہیں ان کے لیے

یہ امرِ غریب نہیں ہے، جہاں والوں نے ماہرِ شریعت، ثقہ علماء پر مشتمل ہلال کمیٹی کے فیصلہ کے مطابق جس دن عید منائی اور قربانی کی وہ درست ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد خانپوری عفی عنہ، ۲۷/ذوالحجہ ۱۴۱۴ھ

باب السحور والإفطار

اذان سن کر سحری ختم کرنا

سوال: ہمارے یہاں سحری عام طور پر صبح صادق سے پہلے نہیں بلکہ اذان سن کر ختم کی جاتی ہے، اذان تک کھانا پینا، پان تمباکو کا سلسلہ جاری رہتا ہے، ادھر اذان شروع ہوئی اور ادھر لوگوں نے جلدی جلدی پان تمباکو تھوک دیا، کیا اس طرح روزہ ادا ہو جائے گا؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

شرعاً روزہ کا وقت صبح صادق سے لے کر غروب آفتاب تک ہے؛ اس لیے صبح صادق کے شروع ہونے سے کچھ پہلے کھانا پینا بند کر کے روزہ شروع کر دیا جائے تاکہ شرعاً روزہ درست ہو، فجر کا وقت صبح صادق سے شروع ہوتا ہے، اور اذان وقت کے داخل ہونے کے بعد یعنی صبح صادق ہو چکنے کے بعد دی جاتی ہے، اب اگر کھانے، پینے کا سلسلہ اذان سن کر ختم کیا جائے گا تو اس کا لازمی نتیجہ صبح صادق کے بعد کھانے، پینے کی شکل میں ظاہر ہوگا، اور یہ چیز روزہ کی صحت کے منافی ہے؛ لہٰذا آپ کے یہاں جو رواج ہے اس کو اولین فرصت میں ختم کیا جائے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد خانپوری عفی عنہ

روزہ افطار کرنے کا وقت

نوٹ: کاروار، کرناٹک کے کوئی جے، اے، خان صاحب نے کتابچہ "افطار" نامی تحریر کیا تھا، کسی شخص نے وہ رسالہ دارالافتاء ڈابھیل کے نام بھیج کر اس میں لکھے ہوئے افطار کے وقت کی شرعی حیثیت معلوم کی تھی "افطار نامی رسالہ کا ابتدائی حصہ یہ ہے: (ع۔ر)

رمضان میں مغرب کے وقت روزہ کھولنے سے متعلق کچھ ضروری عرض

(۱) جون ۱۹۸۶ء رمضان کے مہینے میں افطار کرنے کے سلسلہ میں اختلاف کی وجہ سے میں نے ۱۵/ ستمبر ۱۹۸۶ء کو ایک پرچہ پیش کیا تھا، جس میں افطار کرنے کا موزوں طریقہ بتایا گیا تھا، کہ مغرب کی اذان مکمل ہونے اور اذان کی دعا ختم ہونے کے بعد اور مغرب کی نماز سے پیشتر افطار کیا جائے، میرے پرچے میں درج کی گئی کتابوں کے حوالہ کے مطابق جو احادیث سے ظاہر ہوتا ہے میں نے اظہار خیال کیا تھا؛ مگر بد قسمتی سے چند روزہ داروں نے اس کو بے وقعت اور حقیر سمجھ کر قبول نہیں کیا؛ چوں کہ ایک مولانا صاحب نے ان کو دوسرا طریقہ اختیار کرنے کی نصیحت فرمائی تھی۔

(۲) جو کچھ بھی ہو میں دوبارہ اپنا خیال زیادہ تفصیل اور اچھے طریقہ کے ساتھ کسی کی مخالفت اور مقابلہ کے بغیر شریعت کا تقاضا بیان کرنا چاہتا ہوں، میں اپنے صدق دل سے اپنے اعتقاد کی بنا پر بیان کروں گا؛ اگرچہ میں کوئی عالم نہیں ہوں، اور نہیں کسی کالج یا دارالعلوم کا تعلیم یافتہ ہوں، پھر بھی اپنے اعتقاد کے مطابق صدق دل سے ظاہر کرنے سے گریز نہیں کر سکتا، جو کچھ میں بیان کروں گا وہ میرے علم اور میری زندگی کے اعتقاد کے مطابق ہوگا جو اسلامی کتابوں کے مطابق ہے، ساتھ ساتھ میں معافی بھی

چاہوں گا کہ اگر میرے بیان میں کوئی غلطی یا کسر ہو تو مہربانی فرما کر مجھے اطلاع دیں؛ تاکہ میں اپنی رائے بدل لوں کیوں کہ میری تعلیم صرف ہائی اسکول میٹرک تک ہے۔

(۳) اب میں اپنے اصل مقصد پر آتے ہوئے افطار کا موزوں طریقہ بیان کرتا ہوں، اس وقت میری عمر ۴۳ سال ہے۔ زمانۂ دراز سے یعنی بہت سالوں سے رمضان یا دیگر مہینے میں ہم نیچے بیان کیے گئے طریقہ کے مطابق افطار کرتے رہے ہیں، اور یہی طریقہ ہمارے آباء واجداد نے بھی اختیار کیا تھا:

(۱) غروب آفتاب کا یقین کر کے مؤذن اذان دیتے، اذان کے دوران تمام روزہ دار خاموشی اختیار کرتے اور اذان کے آداب بجالاتے اور اذان ختم ہوتے ہی دعا پڑھتے اور یہ سب غروب آفتاب سے پانچ منٹ میں مکمل ہو جاتا۔

(۲) دعا ختم ہوتے ہی افطار کیا جاتا جو کہ صرف پانچ منٹ میں مکمل ہوتا، اس طرح ہم تمام اتفاق کے ساتھ روزہ افطار کرتے جو قرآن کے مطابق اور اسلامی کتب میں بتائے ہوئے طریقہ کے مطابق ہوتا تھا۔

(۳) اس طرح اذان اور افطار، سورج غروب ہونے سے دس منٹ کے اندر ختم ہوتا، اور مغرب کی نماز شروع ہو کر پندرہ منٹ میں ختم ہو جاتی، لہٰذا مغرب کی نماز سورج غروب ہونے سے تقریباً ۲۵/ منٹ میں ختم ہو جاتی، مجھ ناچیز خیال کے مطابق اس طریقہ میں کوئی غلطی یا کسر نہیں معلوم ہوتی اور یہ طریقہ گزشتہ کئی سالوں سے جاری تھا اور اس طریقہ پر ۱۹۸۵ء تک کسی کا اعتراض یا کوئی مخالفت نہ تھی، حالاں کہ بہت سے مختلف مقامات کے تعلیم یافتہ لوگ اور مولانا حضرات موجود تھے، ان کی فہرست جو مجھے میسر ہوئی ہے وہ فہرست (الف) میں درج ہے، اس طرح ہم اپنے اعتقاد پر قائم تھے،

جو زمانۂ دراز سے قائم تھا اور سب کچھ تسلی اور محبت سے ہماری قوم میں چلا آرہا تھا۔

④ لیکن ۱۹۸۶ء میں ایک مولانا صاحب جو ہماری مدینہ جامع مسجد ''کاروار'' میں امامت کررہے تھے، انہوں نے اچانک نیا افطار کا طریقہ بتایا، اور انہوں نصیحت کی کہ اذان کے پہلے لفظ ''اللہ اکبر'' کے شروع ہوتے ہی افطار کریں، اور اذان کے آداب کی اہمیت کے بغیر ہی دعا مانگیں، حالاں کہ اسلام کی معتبر کتب میں اذان کے آداب بجالانے کے لیے بتایا گیا ہے، اس اچانک اور بے ضرورت تبدیل کے آنے سے ۱۹۸۶ء سے ہمارے یہاں روزہ داروں میں تفرقہ پڑ گیا ہے، اور اسی پر مجھے خوف ہے کہ آئندہ یہ تفرقہ آگ کی طرح بھڑکے گا اور ہماری قوم میں نااتفاقی ہوجائے گی اللہ نہ کرے۔

⑤ میں ایک عمر رسیدہ شخص ہونے کی بناء پر اور اس تفرقہ کے اندیشہ سے بیزار ہوتے ہوئے تفرقہ مٹانے کے ارادہ سے ایک نصیحت کے طور پر اپنے علم اور اعتقاد کے مطابق ۱۵/ستمبر ۱۹۸۶ء کو میں نے ایک پرچہ تیار کیا (جس کی نقل اسی کے ساتھ ہے) اور جس کو ۱۵/ستمبر ۱۹۸۶ء کو نقل کرکے ہمارے تعلقہ کی مساجد میں پیش کیا گیا تھا اور وہ پرچہ صحیح جان کر قبول کرلیا گیا تھا لیکن بدقسمتی سے ہماری مدینہ جامع مسجد ''کاروار'' کے اکثر روزہ داروں نے مولانا کی نصیحت پر اندھی تقلید کرتے ہوئے نیا طریقہ اختیار کرلیا، اب نئے طریقہ کے لیے ہمارے علاقہ میں اور مولانا کے پاس یا کس شخص کے پاس کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ہے، یہ ہمای سمجھ میں نہیں آتا کہ نیا طریقہ کس طرح داخل ہوا اور اس کے اسباب کیا ہیں؟ اس کے لیے اسلام کی معتبر کتابوں میں ٹھوس ثبوت

نہیں ہے، مجھے کہنا پڑتا ہے، ہمارا بہت زمانہ سے چلتا ہوا طریقہ بالکل صحیح ہے؛ کیوں کہ وہ طریقہ تمام ارکان کے ساتھ یعنی سنت مؤکدہ، مستحب اور فرض بھی ادا کرتا ہے، جو رمضان یا دوسرے مہینے میں افطار کرنے کے لیے اسلام کے معتبر ارکان میں ہے۔

(کتابچہ ''افطار'' کا مضمون پورا ہوا)۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً

اس وقت جناب جی، ایم، خان صاحب کا ایک کتابچہ پیش نظر ہے، جس میں مؤلف نے افطار کے موزوں وقت کی تعیین کے سلسلہ میں اپنے مقدور بھر سعی فرمائی ہے، احقر سے اس کتابچہ پر تبصرہ کرنے کی فرمائش کرنے کے ساتھ اصل مسئلہ کی وضاحت کی تاکید بھی کی گئی؛ چناں چہ احقر نے پورا مضمون بغور پڑھا اور مکرر پڑھا۔ کتابچہ پر کسی قسم کا تبصرہ کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوا کہ اصل مسئلہ کو کتاب وسنت اور کتب فقہیہ کی عبارتوں کی روشنی میں منقح کر دیا جائے، اس کے بعد آخر میں انشاء اللہ تعالیٰ کتابچہ کے متعلق بھی اپنی رائے پیش کروں گا۔

قرآن مجید میں باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:﴿ ثم اتموا الصيام الى الليل﴾ (البقرة:۱۸۷) ترجمہ: پھر (صبح صادق سے) رات آنے تک روزہ کو پورا کرلیا کرو۔

① آیت مذکورہ کی تفسیر فرماتے ہوئے حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ تعالیٰ اپنی شہرۂ آفاق ''تفسیر مظہری'' میں تحریر فرماتے ہیں:

ثم اتموا الصيام الى الليل بيان لآخر وقته عن عمر بن الخطاب قال: قال رسول الله ﷺ: اذا اقبل الليل من ههنا وادبر النهار من ههنا وغربت الشمس، فقد افطر الصائم رواه البخاری (تفسیر مظہری ۱/۱۹۱)

یعنی ﴿ثم اتموا الصیام الی اللیل﴾ میں روزہ کے آخری وقت کو بیان فرمانا مقصود ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جب رات ادھر (مشرق) سے آجائے اور دن ادھر (مغرب) سے رخصت ہو اور سورج چھپ جائے تو روزہ دار کے لیے افطار کا وقت ہو گیا، یہ روایت بخاری نے نقل کی ہے۔

② علامہ ابوبکر جصاص رازی حنفی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب "احکام القرآن" میں اسی آیت کریمہ کی تفسیر وتشریح کرتے ہوئے رقمطراز ہے:

ولاخلاف فی انه اذغابت الشمس فقد انقضی وقت الصوم، وجاز للصائم الأکل والشرب والجماع وسائر ماحظره علیه الصوم.

(احکام القرآن ۱/ ۲٤۲)

یعنی اس بات میں کسی کا اختلاف نہیں کہ جب غروب شمس ہو جائے تو روزہ کا وقت ختم ہو گیا، اور روزدار کے لیے وہ تمام چیزیں جو روزہ کی وجہ سے ممنوع تھیں، یعنی کھانا، پینا، اور جماع وغیرہ حلال ہو گئیں۔

③ حضرت علامہ ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ اسی آیت کی تشریح کرتے ہوئے اپنی کتاب "احکام القرآن" میں تحریر فرماتے ہیں:

فالذی ورد فی الاستحباب تعجیل الفطر محمول علی ان لایؤخر الفطر بعد التیقن بالغروب (احکام القرآن ۱/ ۲٤۷)

یعنی (آیت میں جب رات آنے پر روزہ پورا کرنے کا حکم دیا گیا تو) اب وہ روایتیں جن میں افطار میں جلدی کرنے کا حکم دیا گیا ہے، ان کا مطلب یہ ہوا کہ غروب آفتاب کا یقین ہو جانے کے بعد افطار میں تاخیر نہ کرے۔

④ علامہ ابوعبداللہ محمد بن احمد الانصاری القرطبی رحمۃ اللہ علیہ اپنی مشہور تفسیر ''الجامع لاحکام القرآن'' میں تحریر فرماتے ہیں:

قوله تعالى ''الى الليل'' اذاتبين الليل سن الفطر.

(الجامع لأحكام القرآن المعروف بتفسير قرطبي۲/ ۳۲۸)

یعنی ارشاد ربانی ﴿الى الليل﴾ کا مطلب یہ ہے کہ جب رات آجائے (یعنی غروب آفتاب کا یقین ہوجائے) تو افطار مسنون ہے۔

قرآن مجید کی اس تفسیر وتشریح کے بعد احادیث وآثار پر نظر ڈالی جائے، اس سلسلہ میں احادیث وآثار کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے، ہم ان میں سے چند کو پیش کرتے ہیں:

① امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے وقت افطار کی تعیین کے سلسلہ میں مستقل باب ''متی يحل فطر الصائم'' کے عنوان سے قائم فرما کر دو حدیثیں ذکر فرمائی ہیں۔ پہلی روایت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ہے:

قال رسول الله ﷺ: اذا اقبل الليل من ههنا وادبرالنهارمن ههنا وغربت الشمس فقد افطرالصائم ترجمہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب رات ادھر (مشرق) سے آجائے اور دن ادھر (مغرب) سے رخصت ہوجائے اور آفتاب غروب ہوجائے تو روزہ دار کے لیے افطار کا وقت ہوگیا۔

علامہ بدرالدین عینی رحمۃ اللہ علیہ شارح بخاری حدیث مذکور کے الفاظ ''فقد افطر الصائم'' کی تشریح فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

ای دخل فی وقت الفطر، وقال ابن خزيمة: لفظه خبر، ومعناه

الامر، ای فلیفطر الصائم(عمدۃ القاری ١١ / ٦٥)

(یعنی افطر الصائم کا مطلب یہ ہے کہ: وہ (روزہ دار) افطار کے وقت میں داخل ہو گیا، اور ابن خزیمہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حدیث کے الفاظ میں صیغہ خبر کا استعمال کیا گیا؛ لیکن معنی امر کا ہے (یعنی روزہ دار کو افطار کر لینا چاہیے)۔

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی حدیث مذکور کی شرح میں امام ابن خزیمہ رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول کو نقل فرما کر اسی کو راجح قرار دیا ہے۔ (دیکھیے: فتح الباری ۴ / ۱۵۹، ۱۶۰)

② امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اسی باب میں دوسری روایت حضرت عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ کی نقل فرمائی ہے:

قال: کنامع النبی ﷺ فی سفر وھو صائم، فلماغابت الشمس قال لبعض القوم یافلان قم فاجدح لنا، فقال یارسول اللہ لوامسیتَ، قال: انزل فاجدح لنا، قال یارسول اللہ فلوامسیت، قال: انزل فاجدح لنا، قال: ان علیك نھارا، قال: انزل فاجدح لنا،فنزل فجدح لھم، فشرب النبی ﷺ ثم قال: اذا رأیتم اللیل قداقبل من ھھنافقد افطرالصائم.

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ (ماہِ رمضان میں) ایک سفر میں تھے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم روزہ دار تھے؛ چناں چہ جب آفتاب غائب ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قوم میں سے ایک آدمی (حضرت بلال رضی اللہ عنہ) کو فرمایا کہ اے فلانے ہمارے لیے ستّو گھولو، انہوں نے عرض کیا، یارسول اللہ! اگر کچھ اور شام ہو جانے دیتے تو اچھا ہوتا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اتر کر ہمارے لیے ستو تیار کرو انہوں نے (پھر) عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول اگر کچھ مزید انتظار فرما لیتے

تو (مناسب تھا) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اترو اور ہمارے لیے ستو گھولو، انہوں نے عرض کیا کہ ابھی دن (روشنی) باقی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اتر کر ہمارے لیے ستو گھولو؛ چناں چہ انہوں نے اتر کر ستو گھولا، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے (اس کو) نوش فرما کر ارشاد فرمایا: جب تم دیکھو کہ رات ادھر (مشرق) سے آگئی ہے تو روزہ دار کو افطار کر لینا چاہیے۔

اس حدیث کی تشریح فرماتے ہوئے علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: فيه انه لا يجب امساك جزء من الليل مطلقاً؛ بل متى تحقق غروب الشمس حل الفطر (عمدة القاری ۱۱/ ٤٤) یعنی اس حدیث میں یہ بتلایا گیا کہ جب آفتاب غروب ہونے کا تحقق ہو جائے تو افطار کر لینا چاہیے، اب رات کے مزید کسی حصہ کے گزرنے تک بالکل انتظار نہ کرے)۔

بعینہ یہی بات حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ بھی فرماتے ہیں۔ (فتح الباری ۴/ ۱۶۰)

آگے حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بھی فرمایا کہ:

وفيه ايماء الى الزجر عن متابعة اهل الكتاب، فانهم يؤخرون الفطر عن الغروب(فتح الباری ٤/ ١٦٠) (یعنی اس حدیث میں اہل کتاب کی پیروی سے روکنے کی طرف بھی اشارہ ہے کہ وہ لوگ افطار کو غروب آفتاب سے مؤخر کرتے ہیں)۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کے اس کلام سے یہ بتلانا مقصود ہے کہ غروب آفتاب کا تحقق ہو جانے کے بعد افطار میں تاخیر (چاہے ستاروں کے چٹکنے تک نہ ہو پھر بھی) اہل کتاب کی پیروی کا ایک حصہ ہے، اس لیے کہ حدیث مذکور کے واقعہ میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے معمولی تاخیر کی درخواست کی تھی؛ لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو بھی منظور نہیں فرمایا۔

ان دو روایتوں سے جو فوائد و احکام معلوم ہوئے، اس کی تفصیل کرتے ہوئے حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: وفی حدیثی الباب من الفوائد بیان وقت الصوم وان الغروب متی تحقق کفی. (فتح الباری ۴/ ۱۶۰) (یعنی جب غروب آفتاب کا تحقق ہو گیا تو اب افطار کے لیے مزید انتظار کی ضرورت نہیں، بلکہ وہی کافی ہے)۔

③ تمام حضرات محدثین اپنی کتابوں میں تعجیل افطار کا مستقل باب قائم کرتے ہیں، اور اس سلسلہ میں احادیث اتنی کثیر تعداد میں وارد ہوئی ہیں کہ حافظ ابن عبد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ اور حافظ بدر الدین عینی رحمۃ اللہ علیہ نے نقل فرمایا کہ: احادیث تعجیل الإفطار وتاخیر السحور صحاح متواترة. (فتح الباری ۴/ ۱۶۱، عمدۃ القاری ۱۱/ ۶۶) (یعنی افطار میں جلدی کرنے اور سحر میں تاخیر کرنے کے سلسلہ میں احادیث جو وارد ہوئی ہیں وہ تمام) صحیح ہیں اور درجۂ تواتر کو پہنچی ہوئی ہیں۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنی کتاب صحیح بخاری شریف میں "باب تعجیل الإفطار" کے عنوان سے مستقل باب قائم فرما کر اس میں دو حدیثیں ذکر کی ہیں، ان میں سے ایک تو وہی جس کو ہم نمبر دو پر نقل کر آئے، یعنی حضرت عبد اللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ کی روایت؛ چناں چہ حافظ بدر الدین عینی رحمۃ اللہ علیہ اس جگہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں اس شخص (یعنی بلال رضی اللہ عنہ) سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد فرمانا کہ اتر کر ہمارے لیے ستو گھولو، اس سے یہ ثابت ہوا کہ جہاں غروب آفتاب کا تحقق ہو گیا فوراً آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے افطار فرمایا۔ (عمدۃ القاری ۱۱/ ۶۷)

اس جگہ یہ بات ذہن نشین رکھنے کے قابل ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کے مؤذن بھی تھے، اور حضر کی طرح سفر میں بھی یہ خدمت آپ کے سپرد تھی، انہیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غروب شمس کا تحقق ہو جانے پر اذان دینے کا حکم فرمادینے کے بجائے افطار کی تیاری کا حکم دے رہے ہیں۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس باب میں دوسری حدیث حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ کی بیان فرمائی ہے: ان رسول الله ﷺ قال: لا یزال الناس بخیر ماعجلوا الفطر (یعنی لوگ (امت محمدیہ) برابر بھلائی پر قائم رہیں گے جب تک کہ وہ افطار میں جلدی کرتے رہیں گے)۔

تعجیل ایک مفہومِ کلی ہے، جس کے مختلف درجات ہیں:

اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ غروب آفتاب کا یقین ہوتے ہی افطار کرلیا جائے، جیسا کہ حضرات محدثین وفقہاء نے تصریح فرمائی ہے، قاضی مہلب رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ اور حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ دونوں نے تمام علماء کا متفقہ قول یہی نقل فرمایا ہے: واتفق العلماء علی ان محل ذلك اذا تحقق غروب الشمس (عمدۃ القاری ۱۱/ ۶۷، فتح الباری ۴/ ۱۶۱) اور اس کا ادنی درجہ یہ ہے کہ ستاروں کے چٹکنے سے پہلے پہلے افطار کرلے، اگر اتنی تاخیر کی جس کے نتیجہ میں ستارے چٹک گئے تو یہ بالاتفاق مکروہ ہے۔

④ ''ترمذی شریف'' میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے: قال رسول الله ﷺ: قال الله عزوجل: احب عبادی الیّ اعجلهم فطراً (یعنی نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرے بندوں میں مجھے زیادہ محبوب وہ ہے جو ان میں جلدی افطار کرنے والا ہو)۔

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ اس کی تشریح کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں: ای اکثرهم

تعجيلا فی الإفطار لما قدمناه، وقال الطيبي: ولعل السبب فی هذه المحبة المتابعة للسنة، والمباعدة عن بدعة، والمخالفة لأهل الكتاب (مرقات شرح مشكوة ٤ /١٠٠) (یعنی وہ بندہ (زیادہ محبوب ہے) جو افطار میں سب سے زیادہ جلدی کرنے والا ہو، اور علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ شاید اس محبت کی وجہ یہ ہے کہ اس میں سنت کی اتباع، اور بدعت سے دوری، اور اہل کتاب کی مخالفت ہے)۔

ظاہر ہے مقام محبوبیت اسی کو حاصل ہوگا جو تعجیل افطار کے اعلی درجہ پر فائز ہو۔

⑤ ''مسلم شریف'' میں حضرت ابوعطیہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

قال: دخلت انا ومسروق على عائشة رضی الله عنها، فقلنا: يا ام المؤمنين رجلان من اصحاب محمد احدهما يعجل الإفطار، ويعجل الصلوة، والآخر يؤخر الإفطار، ويؤخر الصلوة، قالت: ايهما الذی يعجل الإفطار ويعجل الصلوة؟ قال قلنا: عبد الله يعنی ابن مسعود، قالت: كذلك كان يصنع رسول الله ﷺ زاد ابوكريب والآخر ابوموسى

(یعنی میں اور حضرت مسروق (دونوں) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوئے، ہم نے عرض کیا کہ اے ام المؤمنین! نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ میں سے دو آدمی ایسے ہیں کہ ان میں سے ایک افطار میں بھی جلدی کرتے ہیں اور نماز میں بھی۔ اور دوسرے افطار میں بھی تاخیر کرتے ہیں اور نماز میں بھی، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے دریافت فرمایا کہ ان میں سے کون افطار اور نماز میں تعجیل کرتے ہیں؟ تو ہم نے عرض کیا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ارشاد فرمایا: کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی ایسا ہی کرتے تھے۔ (راوی کہتے ہیں کہ) دوسرے صحابی حضرت

ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہ تھے)۔

ظاہر ہے دوسرے صحابی جو تاخیر سے کام لیتے تھے وہ اتنی تاخیر تو نہیں تھی جو حدِ کراہت میں داخل ہو جاتی ہو؛ بلکہ مراد یہ ہے کہ جلدی کرنے والے صحابی تعجیل افطار میں مبالغہ سے کام لیتے تھے۔ اور دوسرے صحابی اتنا مبالغہ نہیں فرماتے تھے۔ چناں چہ شارح مسلم حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: المراد فی التعجیل المبالغة فیه، وبالتاخیر عدمها واللہ أعلم (فتح الملہم ۳/ ۱۲۲) اس کے باوجود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کے طریق کار کو عین سنت کے مطابق بتلایا۔

⑥ ''مسند احمد'' وغیرہ میں حضرت قطبہ بن قتادہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے: رأیت النبی ﷺ یفطر اذا غربت (مجمع الزائد ۳/ ۱۵٤) یعنی میں نے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا کہ غروب ہوتے ہی (بلا تاخیر) افطار فرماتے تھے۔

⑦ حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: کان رسول اللہ ﷺ اذا کان صائما، امر رجلا یقوم علی نشز (ای مرتفع) من الارض، فاذا قال: قد وجبت الشمس افطر، رواہ الطبرانی فی الکبیر (مجمع الزائد ۳/ ۱۵۵) یعنی نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب روزہ سے ہوتے تھے تو ایک آدمی کو بلند مقام پر کھڑا فرما دیتے تھے اور جہاں وہ یہ کہتا کہ: آفتاب غروب ہو گیا اسی وقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم افطار فرماتے تھے۔

⑧ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ: رأیت رسول اللہ ﷺ وهو صائم یترصد غروب الشمس بتمرة، فلماتوارت القاها فی فیه (کنزالعمال ١٤/ ٦٨) یعنی میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم روزہ سے ہیں اور کھجور لیے ہوئے غروب آفتاب کا انتظار فرما رہے ہیں، اور جہاں آفتاب آنکھوں سے اوجھل ہوا،

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وہ کھجور منہ میں ڈال دی۔

⑨ عن ابی رجاء قال: کنت اشهد ابن عباس رضی الله عنهما عند الفطر فی رمضان فکان یوضع طعامه ثم یامر مراقبا یراقب الشمس، فاذا قال: وجبت، قال: کلوا (٤ /٢٢٧) ابورجاء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں رمضان المبارک میں افطار کے وقت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے پاس حاضر ہوتا تھا، آپ کے سامنے کھانا رکھا جاتا تھا، پھر آپ رضی اللہ عنہ ایک شخص کو حکم دیتے تھے کہ وہ آفتاب کو دیکھتا رہے، پس جب وہ شخص کہتا کہ آفتاب غروب ہوگیا تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے کہ کھاؤ۔

⑩ عن ابی حمزة الصبعی انه کان یفطر مع ابن عباس رضی الله عنهما فی رمضان، فکان اذا امسی بعث ربیبه له تصعد ظهر الدار، فإذا غربت الشمس اذن فیأکل وناکل، فاذا فرغ، اقیمت الصلوة، فیقوم یصلی ویصلی معه (مصنف ابن ابی شیبه ٣ /١٢) ابوحمزہ صبعی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ وہ رمضان المبارک میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے ساتھ افطار کرتے تھے، چناں چہ جب شام ہوتی تو ابن عباس رضی اللہ عنہما اپنے ربیب کو بھیجتے کہ وہ گھر کی چھت پر چڑھ جاتا، پھر جب سورج غروب ہوتا تو وہ اذان دیتا، اور ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ہم کھانا شروع کرتے، پھر جب وہ اذان سے فارغ ہوتا تو نماز کے لیے اقامت کہی جاتی؛ چناں چہ ابن عباس رضی اللہ عنہما اٹھ کر نماز پڑھتے اور ہم بھی آپ رضی اللہ عنہ کے ساتھ نماز پڑھتے۔

⑪ عن مجاهد قال کنت لآتی ابن عمر رضی الله عنهما بالقدح عند فطره، فاستره من الناس ومابه الا الحیاء یقول من سرعة مایفطر

(مصنف عبدالرزاق ٤/ ٢٢٦، مصنف ابن ابی شیبه ٣ /١٣)

حضرت مجاہد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ افطار کے وقت میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا (کھانے کا) برتن لاتا، اور افطار میں جلدی کرنے کی وجہ سے مارے شرم کے وہ برتن لوگوں سے چھپا کر لاتا۔

⑫عن عبدالواحدبن ایمن عن ابیه عن ابی سیعد قال: دخلت علیه، فافطرعلی عرق، وانا اری الشمس لم تغرب(مصنف ابن ابی شیبه۳ /۱۲، ۱۳) عبدالواحد بن ایمن رحمۃ اللہ علیہ اپنے والد سے نقل فرماتے ہیں کہ: میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا، انہوں نے گوشت کی ہڈی والی بوٹی سے افطار کیا، اور (افطار میں انہوں نے اتنی جلدی کی تھی کہ) میں یہ سمجھ رہا تھا کہ ابھی تک آفتاب غروب نہیں ہوا۔

⑬ عن مسلم بن یزیدعن ابیه قال:کان علی بن ابی طالب یقول لابن أبی التیاح، غربت الشمس؟ فیقول: لاتعجل، فیقول:غربت الشمس؟ فإذا قال:نعم،أفطر، ثم نزل فصلی (مصنف ابن أبی شیبه۳ /۱۳) مسلم بن یزید رحمۃ اللہ علیہ اپنے والد سے نقل فرماتے ہیں کہ (ایک سفر میں) حضرت علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ ابوالتیاح سے کہنے لگے کہ (کیا) سورج غروب ہوگیا؟ تو انہوں نے کہا کہ ابھی جلدی نہ کریں، پھر پوچھنے لگے کہ کیا سورج غروب ہوگیا؟ تو جب انہوں نے کہا کہ ہاں (غروب ہوگیا) تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے افطار فرمایا پھر اتر کر نماز پڑھی۔

⑭ عن علقمة قال:أتی عبدالله بجفنة فقال للقوم:ادنوا فکلوا، فاعتزل رجلٌ منهم، فقال له عبدالله مالك؟قال إنی صائم، فقال عبدالله: هذا والذی لا إله غیره حین حلّ الطعام لأ کل (مصنف ابن ابی شیبه۳ /۱۲)

حضرت علقمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہما کے پاس (کھانے کا برتن) لایا گیا، آپ رضی اللہ عنہ نے لوگوں سے فرمایا کہ قریب ہوجاؤ! اور کھاؤ، تو ان میں سے ایک شخص الگ ہٹ گیا، حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے اس سے فرمایا کہ کیا بات ہے؟ تو اس نے کہا کہ میں روزہ سے ہوں تو حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں، یہ وہ وقت ہے کہ (روزہ دار کے لیے) کھانا حلال ہوگیا، (اس اثر کا مطلب یہ ہے کہ افطار میں اتنی جلدی کی گئی تھی کہ وہ آدمی یہ سمجھ رہا تھا کہ ابھی تک وقت نہیں ہوا)۔

⑮ عن موسى بن أنس أنّ أنساً كان يصعدالجارية فوق البيت، فيقول:اذااستوى الأفق فاذنيني.(مصنف ابن ابي شيبة ٣ /١٣) حضرت موسیٰ ابن انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ ایک باندی کو گھر کی چھت پر بھیج دیتے تھے اور فرماتے کہ جب افق برابر ہوجائے (یعنی سورج غروب ہوجائے) تو مجھے اطلاع دینا۔

⑯ عن ا بن حنظلة عن ابيه قال: شهدت عمربن الخطاب فى رمضان وقرب اليه شراب، فشرب بعض القوم وهم يرون الشمس قد غربت، ثم ارتقى المؤذن، فقال:ياأميرالمؤمنين! والله إن الشمس طالعة لم تغرب، فقال عمر: من كان افطر فليصم يوماً مكانه، ومن لم يكن أفطر فليتم حتى تغرب المشس واعاده من طريق آخر، وزادفيه فقال له: انما بعثنا داعيا ولم نبعثك راعياًالخ.

(نصب الراية٢ /٤٢٩، مصنف ابن أبى شيبة٣ / ٢٣،٢٤، مصنف عبدالرزاق ٤/ ١٧٨)

علی ابن حنظلہ اپنے والد سے نقل فرماتے ہیں کہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں رمضان المبارک میں حاضر ہوا، آپ کے سامنے افطاری پیش کی گئی، بعض لوگوں

نے اس میں سے نوش فرمالیا یہ سمجھ کر کہ آفتاب غروب ہوگیا، اس کے بعد مؤذن اذان دینے کے لیے چڑھا اس نے (اوپر سے) کہا کہ اے امیر المؤمنین! خدا کی قسم آفتاب تو ابھی موجود ہے غروب نہیں ہوا، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جس نے روزہ افطار کرلیا وہ اس کی جگہ ایک روزہ (بطور قضا) رکھ لے، اور جس نے ابھی تک افطار نہیں کیا وہ غروب آفتاب تک ٹھہر جائے اور روزہ پورا کرے۔ (اسی واقعہ میں دوسری روایت میں یہ بھی ہے کہ) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس مؤذن کو (جس نے اوپر سے چلّا کر خبر دی تھی) فرمایا کہ: ہم نے تو تجھے نماز کی دعوت دینے کے لیے بھیجا تھا، سورج دیکھنے کے لیے نہیں بھیجا تھا۔ (گویا مؤذن کی بے ادبی پر تنبیہ فرمائی)۔

⑰ عن عمرو بن ميمون الاودی قال كان اصحاب محمد ﷺ اسرع الناس افطاراً وابطأه سحوراً.

(مصنف عبد الرزاق ٤/ ٢٢٦، عمدة القارى ١١/ ٦٦، فتح القدير ٤/ ١٦١)

عمرو بن میمون اودی فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے صحابہ لوگوں میں سب سے زیادہ جلدی افطار کرنے والے، اور دیر سے سحر کھانے والے تھے۔

احادیث وآثار کے بعد کتب فقہیہ سے بھی نمونے پیش کیے جاتے ہیں:

① ''نور الایضاح'' میں ہے: ويستحب له ثلاثة اشياء: السحور، وتاخيره، وتعجيل الفطر من غير يوم غيم (نور الایضاح ص١٥٨)

روزہ کے لیے تین چیزیں مستحب ہیں: ① سحری کھانا ② اس میں تاخیر کرنا ③ اور افطار میں جلدی کرنا جب کہ بادل نہ ہوں (بادل ہونے کی صورت میں روزہ کی حفاظت کے پیش نظر احتیاط برتنی چاہیے)۔ (مراقی الفلاح)

''طحطاوی علی مراقی الفلاح'' میں ہے: یستحب الإفطار قبل الصلاة (طحطاوی علی مراقی الفلاح ص۳۷۳) نماز مغرب سے پہلے افطار کر لینا مستحب ہے۔

علامہ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: وکان ﷺ یفطر قبل ان یصلی. (زاد المعاد۱/ ۳۳۳) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نماز مغرب پڑھنے سے پہلے افطار فرما لیتے تھی۔

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے ''مؤطا امام محمد'' میں صراحت فرمائی ہے کہ نماز مغرب سے پہلے بھی افطار کر سکتا ہے، اور نماز مغرب کے بعد بھی کر سکتا ہے؛ لیکن جو آدمی نماز مغرب کے بعد افطار کرنا چاہے، وہ سنت ونفل سے پہلے کر لے، یعنی فرض مغرب کے سلام پھیرتے ہی افطار کر لے تا کہ افطار میں تاخیر مکروہ کا مرتکب نہ ہو۔ (رسائل الارکان ص ۲۱۵)

''تبیین الحقائق'' شرح کنز الدقائق میں ہے: والمستحب فیه التاخیر، وفی الفطر التعجیل (تبیین الحقائق ۱/ ۳۴۳) یعنی سحری میں تاخیر اور افطار میں تعجیل مستحب ہے۔

③ ''بدائع الصنائع'' میں ہے: ویسن تعجیل الإفطار اذا غربت الشمس، هکذا روی عن ابی حنیفة انه قال: وتعجیل الإفطار اذا غربت الشمس احب الینا (بدائع الصنائع ۲/ ۱۰۵) اور افطار میں جلدی کرنا مسنون ہے جب کہ سورج غروب ہو جائے، امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے اسی طرح منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ آفتاب غروب ہوتے ہی افطار میں جلدی کرنا ہمارے نزدیک پسندیدہ ہے۔

④ ''بحر الرائق'' میں ''فتاوی بزازیہ'' کے حوالہ سے لکھا ہے کہ: ویستحب تعجیل الإفطار (۲/ ۳۱۵) افطار میں جلدی کرنا مستحب ہے۔

البتہ غروب آفتاب کا یقین یا ظن غالب ہونا ضروری ہے۔ ولا یفطر مالم

يغلب على ظنه غروب الشمس. (۲/ ۳۱۵)

⑤ ''فتاوی عالمگیری'' میں ہے: وتعجيل الإفطار افضل، فيستحب ان يفطر قبل الصلوة. (فتاوى عالمگيرى ۱ /۲۰۰) افطار میں جلدی کرنا افضل ہے، چناں چہ نماز (مغرب) سے پہلے افطار کر لینا مستحب ہے۔

⑥ درمختار میں ہے: ويستحب السحور وتاخيره وتعجيل الفطر (الدر على هامش الشامى ۲/ ۱۲٤) اور روزہ دار کے لیے سحری کھانا اور اس میں تاخیر کرنا اور افطار میں جلدی کرنا مستحب ہے۔

منقولۂ بالا نصوص، قرآن وحدیث وآثار صحابہ رضی اللہ عنہم وعبارات فقہیہ سے مشترک طور پر اتنی بات معلوم ہوئی کہ غروب آفتاب کا تحقق ہوتے ہی روزہ کا وقت ختم ہو جاتا ہے، اور روزہ دار کے لے افطار کا استحباب ثابت ہو جاتا ہے، اب اس کی بھی ضرورت نہیں کہ اذان دی جائے اور اس کے ختم ہونے کا انتظار کیا جائے؛ بلکہ بعض احادیث (مثلاً نمبر ۲، ۶، ۷، ۸) اور آثار (مثلاً نمبر ۹، ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۶) سے تو اذان سے قبل ہی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ عنہم کا افطار کرنا معلوم ہوتا ہے، اور اثر ابن عباس رضی اللہ عنہما (نمبر ۱۰) سے درمیان اذان افطار کرنا ثابت ہوتا ہے، اس لیے افطار کا موزوں وقت شریعت مطہرہ کے نزدیک یہی ہے کہ آفتاب کے غروب ہونے کا یقین ہو جائے۔

اب یہ سوال رہ جاتا ہے کہ غروب آفتاب کا علم کس طرح ہو؟ تو اس کا جواب یہ کہ میدانی علاقوں اور دیہات وغیرہ میں تو ہر شخص بہ آسانی غروب آفتاب کو معلوم کر سکتا ہے، اور بڑے شہروں وغیرہ میں جہاں یہ ممکن نہ ہو وہاں لوگوں کو غروب آفتاب کی اطلاع نقارہ، توپ کا گولہ، سائرن، لائٹ وغیرہ کے ذریعہ دی جا سکتی ہے،

اور بذریعۂ اذان بھی دی جاسکتی ہے۔ پہلی صورت کو بدعت قرار دینا درحقیقت بدعت کی تعریف سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔

حضرت مفتیٔ اعظم مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اسی قسم کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

جواب: نقارہ بجانا غروب شمس کی عام اطلاع کے لیے ہوتا ہے، اور جب کہ نقارہ غیر مشتبہ طور پر سنا جائے اور ظن غالب ہو کہ یہ نقارہ وہی ہے جو اطلاع افطار کے لیے بجایا جاتا ہے، تو اس کی آواز سن کر افطار کر لینا مذہبِ حنفی اور شافعی دونوں میں جائز ہے۔ علامہ قیلوبی رحمۃ اللہ علیہ نے "شرح منہاج الطالبین" کے حاشیہ میں لکھا ہے:

ومنه سماع الطبول، وضرب الدفوف، ونحو ذلك مما يعتاد فعله اول الشهر وآخره،اھ، قلت: وكذا اول الصوم وآخره. (کفایت المفتی ۴/ ۲۳۴، ۲۳۵)

حضرت مولانا شاہ محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اسی قسم کے ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

الجواب: طبلِ سحور کو فقہاء نے جائز لکھا ہے، اور افطار اور سحور کی مصلحت متشابہ ہے، اس لیے بھی کچھ حرج نہیں؛ مگر فرش مسجد سے علیحدہ ہو اور ناقوس وغیرہ سے اس کو اس لیے مشابہت نہیں کہ وہ لوگ اس طریقِ اعلان کی خصوصیت کو عبادت بھی سمجھتے ہیں، اور یہاں کوئی ایسا نہیں سمجھتا اور خیر القرون میں اس کی نظیر دفِ نکاح ہے کہ اس سے بھی مقصود اعلان ہے، ایک طاعت کی تحقیق کا، اور اس سے بھی مقصود اعلان ہے ایک طاعت کے وقت کے تحقق کا؛ بلکہ عند التأمل دف اپنی غرض میں اس قدر محتاج الیہ نہیں جس قدر عوام کے اعتبار سے یہ اپنی غرض میں محتاج الیہ ہے۔ (امداد الفتاوی ۲/ ۱۰۴)

حضرت مولانا مفتی محمود حسن صاحب دامت برکاتہم تحریر فرماتے ہیں:

’’سحری یا افطاری کا اگر وقت معلوم نہ ہو اور روزوں کے فساد کا اندیشہ ہو تو نقارہ بجانا، یا گھنٹہ بجانا، بارود کا گولہ بنانا درست ہے؛ لیکن مسجد یا اس کی چھت پر نہیں چاہیے بلکہ مسجد سے ہٹ کر کسی دوسرے مکان یا بلند مقام پر چاہیے کیوں کہ یہ چیز احترام مسجد کے خلاف ہے‘‘۔ (فتاوی محمودیہ ۷/ ۲۹۲)

حضرت مولانا سید مفتی عبدالرحیم لاجپوری صاحب دامت برکاتہم تحریر فرماتے ہیں:

’’الجواب: جس طرح نکاح اور اعلان جنگ کے لیے دف وغیرہ بجانا حدیثوں سے ثابت ہے، اسی طرح چاند نظر آنے اور سحری وافطاری کے وقت ضرورۃً بطورِ اعلان دف بجانا بھی جائز ہے، بشرطیکہ باجا بجانے کے طرز پر نہ ہو‘‘۔ (فتاوی رحیمیہ ۲/ ۴۰)

علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ردالمحتار ۵/ ۲۴۷ میں اس کو لکھا ہے، اس لیے احادیث وآثار دیکھنے سے یہی راجح معلوم ہوتا ہے کہ اذان سے پہلے افطار کرلیا جائے، اور عوام مسلمین کو غروب آفتاب کی اطلاع دینے کے لیے نقارہ وغیرہ کا طریقہ اختیار کر سکتے ہیں۔

نمبر سات پر حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ کی جو روایت گزری اس میں صراحت موجود ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی آدمی کو بلند مقام پر کھڑا فرما دیتے تھے اور جہاں وہ غروب آفتاب کی اطلاع دیتا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم افطار فرماتے تھے، اسی طرح نمبر نو میں حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا معمول اور نمبر ۱۵ میں حضرت انس رضی اللہ عنہ (خادم الرسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا معمول بھی اس بات کی بین دلیل ہے کہ جو شخص خود غروب آفتاب پر واقف ہوا ہو وہ دوسروں کو اطلاع دے؛ تاکہ دوسرے اس اطلاع کی بنیاد پر افطار کریں اس میں کوئی

حرج نہیں ہے، بلکہ احادیث وآثار سے ثابت ہے۔

دوسری صورت اذان کی ہے، تو یہ یادر ہے کہ اصالۃً اذان نماز کے لیے دی جاتی ہے، افطار کے لیے نہیں، شریعت مطہرہ نے وقت نماز کی اطلاع کے لیے اذان کو وضع فرمایا ہے؛ لیکن چوں کہ نماز مغرب کا وقت بھی غروب آفتاب کے تحقق سے شروع ہوتا ہے، اور افطار کے لیے بھی بعینہ یہی وقت ہے، اس لیے غروب آفتاب کا تحقق ہوتے ہی اگر اذان دے دی جائے تاکہ اس طرح لوگوں کو افطار کا وقت بھی معلوم ہو جائے تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں، اس صورت میں اذان سننے والوں کو اختیار ہے کہ وہ اذان کے مکمل ہونے تک افطار نہ کرتے ہوئے اذان کا جواب دیتے رہیں اور اذان ختم ہونے کے بعد افطار کریں، اور یہ بھی اختیار ہے کہ اذان کا پہلا کلمہ سنتے ہی افطار کر لے۔ پیشِ نظر کتابچہ میں اس صورت کو غلط قرار دیا گیا ہے وہ درست نہیں ہے۔

ہم نے جو آثار نقل کیے ہیں ان میں نمبر دس پر حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا جو اثر ہے اس میں اس کی صراحت ہے کہ وہ اپنے ربیب کو مکان کی چھت پر بھیجتے تھے، اور غروب آفتاب ہونے پر جہاں وہ اذان شروع کرتا وہیں حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما اور آپ کے رفقاء افطار شروع فرماتے تھے۔

رہی یہ بات کہ اس صورت میں درمیان اذان کھانا پینا لازم آتا ہے تو حدیث و فقہ میں اس کے جواز کی صراحت موجود ہے۔

''ابوداؤد شریف'' میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے: قال رسول الله ﷺ: اذا سمع احدكم النداء، والاناء على يده فلا يضعه حتى يقضى حاجته منه (ابوداؤد شریف ۱/ ۳۲۱)

''مراقی الفلاح'' شرح نورالایضاح میں اذان کے جواب کی تفصیل میں لکھا ہے:
ولا یجیب فی الصلوۃ ولوجنازۃ، وخطبۃ سماعھا وتعلم العلم وتعلیمہ، والاکل الخ (مراقی الفلاح علی ہامش الطحطاوی ص ۱۱۰)

''درمختار'' میں بھی اس کی صراحت موجود ہے۔ (درعلی ہامش الشامی ۱/ ۲۹۲)

اور روزہ دار کے حق میں تو بڑی وسعت ہے کہ نماز کی اقامت کہی جا چکی اور جماعت شروع ہو چکی ہے؛ لیکن روزہ دار کی ضرورت پوری نہیں ہوئی تو شریعت مطہرہ اجازت بلکہ حکم دیتی ہے کہ پہلے کھانا کھالے اس کے بعد نماز پڑھے۔ تمام حضرات محدثین نے مستقل باب قائم فرما کر اس مسئلہ کو اپنی اپنی کتابوں میں ذکر فرمایا ہے۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ''باب اذاحضر الطعام واقیمت الصلوۃ'' کے ذیل میں تین مرفوع حدیثیں ذکر فرمائی ہیں۔ ان میں ایک حضرت انس رضی اللہ عنہ کی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جب شام کا کھانا پیش ہو تو مغرب کی نماز پڑھنے سے پہلے کھانا کھالو۔ (بخاری شریف)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی اسی روایت کو ذکر فرمایا ہے، اس کے بعد خود حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کا عمل نقل فرمایا ہے جب ان کے سامنے کھانا رکھا جاتا اور ادھر نماز کی اقامت شروع ہوتی (بلکہ نماز شروع ہو جاتی) تو جب تک وہ فارغ نہ ہو جاتے نماز میں شریک نہ ہوتے؛ حالاں کہ وہ امام کی قراءت سن رہے ہوتے تھے۔

(بخاری شریف)

علامہ بدرالدین عینی رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کی شرح میں رقمطراز ہیں: اختلفوا فی ھذا الامر، فالجمھور علی انہ للندب، وقیل للوجوب وبہ قالت الظاھریۃ

قالوا: لا یجوز لاحد حضر طعامه بین یدیه وسمع الاقامة ان یبدأ بالصلوة قبل العشاء، فان فعل فصلاته باطلة، والجمهور علی الصحة (عمدة القاری ٥/ ١٩٧) (یعنی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس امر سے وجوب مراد ہے یا استحباب اس سلسلہ میں) علمائے امت میں اختلاف ہے، جمہور علماء (جن میں ائمۂ اربعہ بھی ہیں، اس بات کے قائل ہیں کہ یہ امر استحباب کے لیے ہے، اور ایک قول وجوب کا بھی ہے؛ چناں چہ اہل ظاہر نے اس کو اختیار کرتے ہوئے کہا ہے کہ جس کے سامنے کھانا موجود ہو اور وہ اقامت کی آواز سنے اس کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ کھانے سے پہلے نماز شروع کرے، اگر اس نے ایسا کیا تو اس کی نماز باطل ہے؛ لیکن جمہور علماء نماز کے صحیح ہونے کے قائل ہیں)۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا یہ عمل جو اوپر بیان کیا گیا اس وقت ہوتا تھا، جب کہ وہ روزہ سے ہوتے جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے فتح الباری ٢ / ١٢٧، اور حافظ عینی رحمۃ اللہ علیہ نے عمدۃ القاری ٥ / ١٩٨ میں اس کی تصریح فرمائی ہے، یہ روایت اس تفصیل کے ساتھ ''مسند احمد'' میں بھی موجود ہے۔ ''ترتیب مسند مسمی الفتح الربانی'' کی شرح ''بلوغ الامانی'' میں شیخ احمد عبدالرحمن البناالشهیر بالساعاتی اس موقعہ پر فرماتے ہیں: وکان ابن عمر رضی الله عنهما من اشد الناس تمسکابقوله ﷺ وفعله (١٠/٧) یعنی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ ان لوگوں میں سے تھے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قول وفعل پر بڑی شدت (مبالغہ) سے عمل کرنے والے ہیں۔

حضرات فقہائے کرام نے بھی ''باب الامامة'' میں ان مسائل کی تفصیل ذکر

فرمائی ہے۔

رہا مسئلہ اذان کے جواب کا تو فقہائے احناف کے درمیان مختلف فیہ ہے اور محققین حضرات نے زبان سے جواب دینے کو مستحب قرار دیا ہے۔

علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: والذی ینبغی تحریرہ فی ھذا المحل ان الإجابۃ باللسان مستحبۃ، وان الإجابۃ بالقدم واجبۃ ان لزم من ترکھا تفویت الجماعۃ الخ (شامی ۱/ ۲۹۴)

(یعنی اس جگہ اس بات کی صفائی ضروری ہے کہ زبان سے جواب دینا مستحب ہے، اور قدم سے جواب دینا (یعنی نماز کے لیے جانا) واجب ہے اگر اس کے چھوڑنے سے جماعت کی تفویت لازم آتی ہو)۔

اور جن حضرات مشائخ حنفیہ نے زبانی جواب کو واجب کہا ہے، انہوں نے بھی اس آدمی کو جو کھانے میں مشغول ہے اس حکم سے مستثنیٰ قرار دیا ہے، جیسا کہ ہم آگے ''مراقی الفلاح'' اور ''درمختار'' کے حوالہ سے بیان کر چکے ہیں؛ نیز اذان کا پہلا کلمہ سنتے ہی افطار کرنے والا اگر جواب دینا چاہے تو دے سکتا ہے، دونوں میں کوئی منافات تو نہیں ہے؛ اس لیے صاحب کتابچہ کا ''اذان کا پہلا کلمہ سنتے ہی افطار کرنے والے طریقہ'' کو غلط قرار دینا درست نہیں۔

نیز انہوں نے اپنے مالوف طریقِ افطار کا مستحب ہونا ثابت کرنے کے لیے مستقل کتابچہ ترتیب دیا؛ لیکن حدیث وفقہ کی کسی صریح عبارت سے اس طریقہ کو ثابت نہیں کر پائے۔ صرف جوابِ اذان کے سلسلہ میں جو فقہی جزئیات ہیں انہیں پیش کر دیا؛ لیکن اس سے ان کے مالوف طریقہ کا استحباب کہاں ثابت ہوا؟ اور اگر

بالفرض وہ کسی صریح عبارت سے اس کا استحباب ثابت کر بھی دیتے، تو اس سے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ دوسرا طریقہ غلط ہے؛ بلکہ مؤلفِ کتابچہ کا اپنے مالوف طریقہ پر اس قدر اصرار تو غلو فی الدین کی صورت ہے، جو مستحب کو ترک کرنے کا باعث ہوتی ہے۔

''مشکوۃ شریف'' میں ''بخاری و مسلم'' کے حوالہ سے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کی روایت ذکر کی گئی ہے کہ انہوں نے فرمایا: لا یجعل احدکم للشیطان شیئا من صلوته، یری ان حقا علیه ان لاینصرف الاعن یمینه، لقد رأیت رسول الله ﷺ کثیرا ینصرف عن یساره (یعنی تم سے کوئی شخص اپنی نماز میں شیطان کا حصہ نہ رکھے اس طرح کہ وہ نماز کے بعد دائیں طرف سے گھومنے کو ضروری سمجھے، تحقیق کہ میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بہت مرتبہ بائیں طرف سے گھومتے بھی دیکھا ہے)۔

اس حدیث کی شرح فرماتے ہوئے ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے نقل فرمایا ہے کہ: وفیه ان من اصر علی أمر مندوب، وجعله عزماً ولم یعمل بالرخصة، فقد اصاب منه الشیطان من الإضلال (مرقات شرح مشکوۃ ۲/ ۳۵۳) (یعنی اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ جو آدمی کسی مندوب (ومستحب) بات پر اصرار کرے اور اس کو ضروری سمجھنے لگے اور (شریعت کی عطا فرمودہ) گنجائش پر عمل نہ کرے، تو شیطان نے اس کو گمراہ کر دیا ہے)۔

فقہائے کرام نے اصول بیان کیا ہے کہ: ''تارك المستحب لا یلام'' پس مستحب کے تارکین کو ملامت کرنا یا قابل ملامت سمجھنا مستحب کو اس رتبہ سے بڑھا دینا ہے؛ لہٰذا اس وجہ سے بھی وہ فعل مباح یا مستحب مکروہ ہو جائے گا۔ (الجنة لأهل السنة ص ۱۴۲)

اِس لیے مؤلف کتابچہ نے جو روش اپنے رسالہ میں اختیار فرمائی ہے وہ اس صورت میں بھی درست نہیں، جب کہ ان کے مالوف طریقۂ افطار کا مستحب ہونا ثابت ہوجائے، چہ جائے کہ وہ بھی ثابت نہیں ہے۔

آخر میں دینی خیر خواہی (الدین النصیحة) کے پیش نظر مؤلف رسالہ کی خدمت میں عرض کروں گا کہ خود اپنے اقرار کے مطابق وہ عالم دین نہیں ہیں، اور نہ ہی فتاویٰ نویسی کا فن انہوں نے معتبر علمائے کرام سے حاصل کیا ہے تو ان کو چاہیے کہ اس قسم کی صورتیں پیش آنے پر خود فتوی دینے کے بجائے معتبر وثقہ اہل علم کی طرف رجوع فرمائیں، اس کام کی انجام دہی کے لیے جو شرائط حضرات فقہائے کرام نے ضروری قرار دیے ہیں ان کے مفقود ہونے کی صورت میں اس پر اقدام بڑا خطرناک ہے، اور فرمان نبوی علی صاحبها الف الف صلوة وتحية کے بموجب "ضلّوا فاضلّوا" کا مصداق ہے۔

علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ اپنی مشہور کتاب "شرح عقود رسم المفتی" (جو خاص اسی موضوع پر ہے) میں تحریر فرماتے ہیں:

قال فی آخرمنية المفتی: لوان الرجل حفظ جميع كتب اصحابنا لابد ان يتلمذ للفتوى حتى يهتدی اليه (شرح عقود رسم المفتی ص:۹۷)

(یعنی کتاب منیۃ المفتی کے آخر میں ہے کہ اگر کوئی شخص ہمارے اصحاب حنفیہ کی تمام کتابوں کو حفظ کرلے تب بھی ضروری ہے کہ فتویٰ دینے کے لیے کسی (ماہر استاذ) کی شاگردی اختیار کرے تاکہ اس کا طریقہ معلوم ہو)۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم وعلمه اتم واحكم. والحمد لله تعالى اولا وآخراً، والصلوة على نبيه

دائما ابداً.

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۰/ ذوالحجۃ الحرام ۱۴۰۸ھ
الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

سحری وافطاری کا وقت

سوال: (۱) سحری صبح صادق سے کتنے منٹ قبل کر سکتے ہیں؟ اگر کسی نے صبح صادق تک سحری کھائی تو روزہ ہوا کہ نہیں؟

(۲) غروب آفتاب کے بعد اذان اور افطار کتنے منٹ بعد کرنا چاہیے؟ اگر کسی نے غروب آفتاب کے فوراً بعد افطار کر لیا تو اس کا روزہ ہوا یا نہیں؟

(۳) وقت عشاء غروب آفتاب کے کتنے گھنٹے بعد شروع ہوتا ہے؟ زوال کے بعد وقت مکروہ کتنے منٹ تک رہتا ہے؟

(۴) اور اذان کتنے منٹ بعد دے سکتے ہیں؟

نوٹ: ہمارا دائمی تقویم شائع کرنے کا ارادہ ہے، جس کے لیے یہ مسائل دریافت کیے جا رہے ہیں، دیگر تقویم جس میں افطار و سحری میں احتیاط کی بات ہے، اس کا تشفی بخش جواب مرحمت فرمائیں۔

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

(۱) حقیقی صبح صادق جب شروع ہو اس سے پہلے تک سحر کھا سکتے ہیں، جہاں صبح صادق نمودار ہونا شروع ہوئی سحر کھانا درست نہیں، یہ تو اصل مسئلہ ہوا، لیکن عوام؛ بلکہ اکثر خواص بھی حقیقی صبح صادق نہ کبھی دیکھتے ہیں اور نہ اس کی معرفت حاصل ہے؛ بلکہ

عموماً آج کل تقویم پر مدار رکھا جاتا ہے جو حسابی چیز ہے، جس میں ایک دو یا زیادہ منٹ کا فرق بھی ہوسکتا ہے، اور تمام لوگوں کی گھڑیاں بھی ایک دم درست وقت پر نہیں ہوتیں؛ بلکہ ان میں بھی پانچ منٹ یا زائد کا فرق ہوسکتا ہے، اس لیے اگر کوئی آدمی تقویم سے معلوم شدہ وقت کے مطابق سحری کرنا چاہتا ہے تو احتیاط اسی میں ہے کہ اس میں صبح صادق کا جو وقت ہے اس سے دس منٹ پہلے سحر کھانے کا سلسلہ بند کر دے۔

(۲) اگر کسی آدمی نے آفتاب کا آخری کنارہ ڈوبتے ہوئے اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا، اور اس مشاہدہ کے نتیجہ میں غروب کا علم قطعی اس کو حاصل ہوگیا، تو اس وقت وہ افطار بھی کر سکتا ہے اور اذان مغرب بھی دے سکتا ہے؛ لیکن اگر وہ شخص خود مشاہدہ کرنے کے بجائے تقویم پر مدار رکھ رہا ہے تو وہاں بھی وجوہات مندرجہ بالا کی بنیاد پر پانچ منٹ احتیاط کرے۔

(۳) اس کے لیے کوئی متعین وقت نہیں ہے، مقام اور موسم کے لحاظ یہ فاصلہ کم وبیش ہوتا رہتا ہے۔ (کما فی احسن الفتاوی ۲/ ۱۴۶)

(۴) تقویم میں لکھے ہوئے وقت استواء شمس کے پانچ منٹ بعد اذان دے سکتے ہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۶/ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۲ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

انجکشن سے فسادِ روزہ کا شبہ

سوال: انجکشن کے اثرات اگرچہ منافذِ اصلیہ کے ذریعہ پیٹ تک نہیں پہنچتے،

لیکن بعض انجکشن سے قوت وتوانائی حاصل کی جاتی ہے، تو کیا روزہ دار کے لیے اس کا استعمال درست ہوگا؟ اور کیا ایسا کرنے والے کا روزہ فاسد نہ ہو جائے گا؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

کسی چیز کا بدن کے کسی حصہ کے اندر داخل ہو جانا مطلقاً روزہ کو فاسد نہیں کرتا؛ بلکہ اس کے لیے دو شرطیں ہیں: اول یہ کہ وہ چیز جوفِ معدہ میں یا دماغ میں پہنچ جائے۔ دوسرے یہ کہ یہ پہنچنا بھی مخارقِ اصلیہ، یعنی: منفذِ اصلی کے راستہ سے ہو، اگر کوئی چیز مخارقِ اصلیہ کے علاوہ کسی دوسرے کیمیائی طریقہ سے جوفِ معدہ یا دماغ میں پہنچا دی جائے، تو وہ بھی مفسد صوم نہیں۔ انجکشن کے ذریعہ بلا شبہ دوا یا اس کا اثر پورے بدن کے ہر حصہ میں پہونچ جاتا ہے؛ مگر یہ پہنچنا منفذِ اصلی کے راستہ سے نہیں؛ بلکہ عروق (رگوں) کے راستہ سے ہے، یہ راستہ منفذِ اصلی نہیں؛ اسی لیے گرمی کے موسم میں کوئی شخص اگر ٹھنڈے پانی سے غسل کرتا ہے تو پیاس کم ہو جاتی ہے، کیوں کہ پانی کے اجزاء مسامات کے راستہ سے اندر جاتے ہیں، مگر اس کو کسی نے مفسدِ صوم نہیں قرار دیا، اس سے یہ شبہ بھی رفع ہو گیا کہ گلوکوز وغیرہ کے انجکشن ایسے ہیں کہ ان کے ذریعہ بدن کو غذا جیسی قوت پہنچ جاتی ہے، اس لیے ان کا حکم غذا کا سا ہونا چاہیے؟ جواب واضح ہے کہ قوت پہنچانا مطلقاً مفسد صوم نہیں، جیسے ٹھنڈک پہنچانا مفسد صوم نہیں؛ بلکہ منفذ اصلی کے راستہ سے کسی چیز کا جوف معدہ یا دماغ میں پہنچنا مفسد ہے، وہ انجکشن میں نہیں پایا جاتا، اگر چہ قوت اس سے پہنچ جائے۔ (آلات جدیدہ مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ ۱۵۶، ۱۵۷)

فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد خانپوری عفی عنہ

انجکشن سے عدم نقضِ صوم پر اشکال

سوال: انجکشن سے صوم ٹوٹتا نہیں، مقیس علیہ کیا ہے؟ جوف میں وصول دوا نہیں اس لیے نقض صوم نہیں تو پاگل کتے کے کاٹنے سے انجکشن ناف میں لیتے ہیں تو وہاں غالباً وصول الدواء الی الجوف ہے تو اس وقت نقض صوم ہے؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

انجکشن کے ذریعہ دوا جوف عروق میں پہنچائی جاتی ہے اور خون کے ساتھ شرائیین یا اوردہ میں اس کا سریان ہوتا ہے جوف دماغ یا جوف بطن میں دوا نہیں پہنچتی اور فساد صوم کے لیے مفطر کا جوف دماغ یا جوف بطن میں پہنچنا ضروری ہے مطلقا کسی عضو کے جوف یا عروق (شرائین واوردہ) کے جوف میں پہنچنا مفسد صوم نہیں۔ (امداد الفتاویٰ ۲/۱۴۵)

امداد الفتاویٰ جلد دوم ۱۴۵ تا ص: ۱۴۷ نیز فتاویٰ محمودیہ ۳/ ۱۴۳ تا ۱۴۶ اور جلد ۱۱/ ۸۷ مطالعہ کرلیا جائے صرف اس وجہ سے کہ وہ انجکشن ناف میں لگایا جاتا ہے یہ ضروری نہیں کہ دوا جوف معدہ میں پہنچے۔ پوری تحقیق کرلی جائے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

املاہ: العبد احمد خانپوری، ۳/ رجب المرجب ۱۴۲۳ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ

کاروبار میں تکلیف سے روزہ نہ رکھنا

سوال: زید کی عمر اس وقت بہتر سال کی ہے، پینتیس سال سے وہ روزہ نہیں

رکھ سکتا، روزہ رکھنے سے ضعف کا احساس ہوتا ہے، اور شام کے وقت روزانہ کاروبار میں تکلیف ہوتی ہے، اگر وہ چاہے تو روزہ رکھ سکتا ہے؛ مگر کاروبار بند کرنا پڑتا ہے، اور آرام کرنا پڑتا ہے، اس کا کام طبابت ہے؛ لہذا کاروبار بند کرنا بھی مناسب نہیں، علاوہ ازیں کاروبار بند کرنے سے روزی روٹی کا بھی سوال ہے، اب زید روزہ رکھے اور آرام کرے، یا روزہ نہ رکھ کر فدیہ ادا کرے، اور فدیہ کی مقدار کیا ہے؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

صورت مسئولہ میں افطار کی اجازت نہیں ہے؛ بلکہ زید کو چاہیے کہ روزہ رکھ کر آرام کرے۔

إذا كان عنده ما يكفيه وعياله، لا يحل له الفطر؛ لأنه يحرم عليه السوال من الناس، فالفطر اولى (شامی ۲/ ۱۲۵) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد خانپوری عفی عنہ

کفارۂ صوم کے تسلسل میں حیض مانع نہیں

سوال: روزے کا جو دو مہینہ کا کفارہ ہے، اس میں عورتیں کس طرح عمل کریں؟ کیوں کہ وہ تو حیض کی وجہ سے مسلسل روزے نہیں رکھ سکتی ہیں تو ان کے لیے کیا طریقہ ہے؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

حیض تسلسل سے مانع نہیں ہے، اس لیے اگر روزوں کے درمیان حیض شروع ہو جائے تو ایام حیض کے بعد روزہ رکھنا شروع کر دے؛ البتہ اگر ایام حیض کے ختم ہونے کے بعد ایک دن بھی خالی رہا یعنی روزہ نہ رکھا تو تسلسل باقی نہیں رہے گا، اور از

سرنو روزہ رکھنا پڑے گا۔

(قوله: بخلاف الحيض) فإنه لا يقطع كفارة قتلها وإفطارها؛ لأنها لا تجد شهرين خاليين عنه الخ (شامی ۲/۶۳۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد خانپوری عفی عنہ

روزہ کے کفارہ میں گھر کے ملازم کو آزاد کرنا

سوال: اگر کسی نے روزہ فاسد کرلیا، تو اس کو روزہ کی قضاء کرنا اور کفارہ ادا کرنا ضروری ہے؟ اب اس کو ایک غلام آزاد کرنا ضروری ہے؟ اس میں ایک صورت یہ ہے کہ اگر زید نے روزہ فاسد کرلیا اور کفارہ ادا کرنا چاہتا ہے اور اس کے پاس غلام تو ہے نہیں؛ البتہ اس کے گھر ایک کام کرنے والا نوکر جیسا کہ عام طور پر گھروں میں ہوتا ہے، تو اب وہ یہ چاہتا ہے کہ اس نوکر کو کام سے نکال دے اور ہر مہینہ اس کو تنخواہ دیتا رہے، (جتنی تنخواہ وہ پہلے اسے دیتا تھا) تو اس صورت میں اس کا کفارہ ادا ہوگا یا نہیں؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

گھروں میں کام کرنے والا ملازم آزاد ہے، غلام نہیں ہے؛ اس لیے سوال میں مذکورہ طریقہ اختیار کرنے سے کفارہ ادا نہیں ہوگا، ہمارے دور میں غلام نادر الوجود ہے، اس لیے اب اداءِ کفارہ کی صورت یہ ہے کہ مسلسل دو ماہ کے روزے رکھے اور اگر اس کی طاقت نہ ہو، تو ساٹھ مسکینوں کو دو وقت پیٹ بھر کھانا کھلائے۔ (شامی ۲/۱۱۹) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۹/ صفر المظفر ۱۴۱۱ھ
الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

کفارے کے روزے قضاء کی طرف سے کافی نہیں

سوال: اگر بہت سے روزے توڑے ہیں تو کفارہ کے علاوہ ان کی قضاء بھی ضروری ہے یا کفارہ سے قضا بھی پوری ہو جائے گی؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

کفارہ الگ ہے اور قضا الگ ہے، اگر کئی روزے توڑے ہوں تو ہر ایک کی قضا الگ الگ ضروری ہے، کفارہ کے روزے قضا کی طرف سے کافی نہیں ہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۱/ ذوالقعدۃ الحرام ۱۴۱۲ھ
الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

طہرِ متخلل والی عورت پر روزہ نہیں

سوال: طہرِ متخلل کا کیا حکم ہے؟ بعض اوقات خصوصاً رمضان میں یہ صورت پیش آئے تو کیا کرے؟ مثلاً ایک دن یا پہلے دن حیض نظر آیا اور پھر دو تین دن نظر نہ آیا تو حائضہ اس صورت میں روزہ رکھے یا متشابہ للصائم کی طرح رہے، اور اگر اس نے روزے کی نیت کر لی تو روزہ ہوگا یا نہیں؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

اس صورت میں اگر بعد میں خون آیا ہے اور درمیان میں ایامِ عادت آگئے تو وہ حیض شمار ہوں گے، روزہ نہ رکھے، حائضہ روزہ دار سے مشابہت بھی اختیار نہیں کر سکتی؛

بلکہ کھانا کھائے؛ البتہ سب کے سامنے نہ ہو۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد خانپوری عفی عنہ

کسی کو خون دینے کے لیے روزہ توڑنا

سوال: ہم بلڈ بینک میں ملازمت کرتے ہیں، ہسپتال میں کچھ مریضوں کو حالات اضطراری میں خون چڑھایا جاتا ہے، اس سلسلہ میں دو سوالات کے جوابات درکار ہیں:

① ڈاکٹری اصول کے تحت خالی پیٹ خون نہیں لیا جاتا ہے اور اس وجہ سے روزہ دار کو کھانے کی ہی ہدایت دی جاتی ہے، چند لوگوں کے سوا زیادہ تر روزہ توڑ دیتے ہیں، کیا ہم لوگ ایسی حالت میں اسلامی نقطۂ نظر سے گنہگار تو نہیں ہوں گے؟

② اگر ایسی حالت میں روزہ افطار کرنے کا جواز ہے تو اس کی کیا شکل ہوگی؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

① ② اس حالت میں شرعاً روزہ توڑنے کا جواز نہیں ہے، آپ اگر کسی کو روزہ توڑنے کے لیے کہیں گے تو آپ بھی گنہگار ہوں گے، ایسے لوگوں کا خون رات میں لیا جائے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۸/ ربیع الآخر ۱۴۱۹ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

صومِ داؤدی کی نذر پوری نہ کرنے کا حکم

سوال: میں مقروض آدمی ہوں، جب مجھ پر قرض کا یہ بار گراں آیا، تو میں نے

یہ نذر مان لی کہ میں جب تک اس سے سبک دوش نہیں ہو جاتا، صوم داؤدی رکھتا رہوں گا، اور اس پر عمل شروع بھی کر دیا گیا، کچھ مہینوں تک تسلسل رہا؛ مگر وہ سلسلہ ٹوٹ گیا، کبھی ایسا بھی ہوا کہ مسلسل ہی روزہ نہ رکھ سکا، اور کبھی یوں ہوا کہ بغیر کسی فصل کے برابر روزا نہ رکھتا رہا، اور حالت یہ ہے کہ اب تک میں بارِ قرض سے عہدہ برآ نہیں ہو سکا ہوں، از روئے شرع مجھے کیا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیے؟ کیا ناغہ شدہ روزوں کے کفارے واجب ہوں گے اور ہوں گے تو کتنے؟ اور اس صورت حال سے نمٹنے کی کیا سبیل ہوگی؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

آپ کی نذر کے مطابق آپ پر جب تک آپ قرض سے سبک دوش نہ ہوں، ایک ایک دن کے فصل سے روزہ رکھنا ضروری ہے، جن دنوں میں آپ نے روزے نہیں رکھے، ان ایام کے چھوٹے ہوئے روزے بنیت قضاء رکھنا ضروری ہے، اس پر کوئی کفارہ نہیں، جن دنوں میں آپ مسلسل بغیر فصل کے روزے رکھتے رہے ان دنوں میں ایک ایک دن کے فصل سے رکھا جانے والا روزہ تو نذر کا ہوا، اور درمیانی ایام کے روزوں میں اگر چھوٹے ہوئے نذر کے روزوں کی قضاء کی نیت کی ہے تو وہ قضاء کے طور پر شمار ہوں گے، ورنہ نفل ہے، آئندہ اگر بڑھاپے کی وجہ سے روزہ رکھنے کی طاقت نہ رہے تو روزہ کی جگہ پر بطور فدیہ غلہ یا رقم (ایک صدقۃ الفطر کے برابر) دے سکتے ہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

املاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۴/ ذی قعدہ ۱۴۲۷ھ

انتیسویں تاریخ کو چاند دیکھ کر عید منائی اور ۳۰/شوال کو چاند نظر نہ آیا تو کیا ایک روزہ کی قضا ہے؟

سوال: ۲۹/ رمضان کو بعض حضرات نے چاند دیکھ کر عید منائی؛ مگر ہوا یہ کہ چند حضرات نے ۲۹/ رمضان کو چاند دیکھا، ان کے اعتبار سے شوال المکرم کی ۲۹ یا ۳۰ تاریخ کو چاند نظر آتا؛ مگر چاند نہ ۲۹ کو نہ ۳۰ شوال کو نظر آیا؛ بلکہ جن حضرات نے ۳۰/ رمضان کو چاند دیکھا ان کے اعتبار سے ۳۰/شوال المکرم کو چاند نظر آیا تو کیا جن حضرات نے ۲۹/ رمضان کو چاند دیکھ کر عید منائی مگر آئندہ مہینے کے اعتبار سے گویا یہ سمجھ میں آرہا ہے کہ رؤیت صحیح نہیں ہوئی تو کیا ان حضرات کو ۳۰/ رمضان کا روزہ رکھنا ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً

عمدۃ الفقہ میں ہے: اگر رمضان کی اکتیسویں رات کو مطلع ابر آلود رہے اور شوال کا چاند نظر نہ آیا تو صبح کو بالاتفاق روزہ نہ رکھیں اور عید کریں، خواہ رمضان کا چاند آسمان ابر آلود ہونے کی صورت میں ایک عادل آدمی کی گواہی سے ثابت ہوا ہو یا دو عادل آدمیوں کی گواہی سے ثابت ہوا ہو، اور اگر رمضان کا چاند آسمان پر ابر یا غبار وغیرہ ہونے کی صورت میں ایک شخص کی گواہی سے ثابت ہوا ہو اور شوال کا چاند اکتیسویں شب کو مطلع صاف ہونے کے باوجود نظر نہ آیا تو بعض کے نزدیک افطار حلال ہے اور بعض کے نزدیک افطار حلال نہیں، دونوں طرف ترجیح ہے، پس ترجیح مختلف فیہ ہے؛

لیکن عدمِ افطار ہی ارجح ہے اور اگر رمضان کا چاند ابر وغیرہ کی حالت میں یا مطلع صاف ہونے کی صورت میں دو عادل گواہوں کی گواہی سے ثابت ہوا، اور شوال کا چاند اکتیسویں شب کو مطلع صاف ہونے کے باوجود نظر نہیں آیا تو اس صورت میں بھی بعض کے نزدیک افطار حلال ہے اور بعض کے نزدیک افطار حلال نہیں ہے اور دونوں طرف ترجیح ہے، پس ترجیح میں اختلاف ہے؛ لیکن افطار حلال ہونا ہی ارجح ہے اور اسی پر فتویٰ ہے، جیسا کہ شامی وغیرہ سے ظاہر ہے۔ (عمدۃ الفقہ ۳/ ۲۴۴)

شامی میں ہے: (و بعد صوم ثلاثين بقول عدلين حل الفطر) (قوله حل الفطر) أي اتفاقاً ان كانت ليلة الحادي و الثلاثين متغيمة، و كذا لومصحية على ما صححه في الدراية و الخلاصة و البزازية، و صحح عد مه في مجموع النوازل والسيد الا مام الاجل ناصر الد ين كما في الامداد، و نقل العلامة نوح الاتفاق على حل الفطر في الثانية أيضا عن البدائع و السراج و الجوهرة، قال: والمراد اتفاق ائمتنا الثلاثة، و ما حكى فيها من الخلاف انما هو لبعض المشائخ، قلت: و في الفيض: الفتوى على حل الفطر و وفق المحقق ا بن الهمام كما نقله عنه في الامداد بأنه لا يبعد لو قال ان قبلهما في الصحوأي في هلال رمضان و تم العدد لايفطرون و ان قبلهما في غيم أفطروا لتحقيق زيادة القوة في الثبوت في الثاني و الاشتراك في عدم الثبوت أصلا في الأول فصار كشهادة الوا حد اه قال ح: والحاصل أنه اذا غمّ شوال أفطروا اتفا قا اذا ثبت رمضان بشهادة عدلين في الغيم أو الصحو وان لم يغم فقيل يفطرون مطلقا قيل لا مطلقا و قيل يفطرون ان غم رمضان أيضا

وإلا لا. (در مختار مع الشامي ۲/ ۱۰۳-۱۰۲)

عباراتِ بالا سے معلوم ہوا کہ آپ نے اپنے سوال میں جو صورت تحریر فرمائی ہے ویسی ہی صورت رمضان المبارک میں پیش آئے تو افطار کرنا اور عید منانا مفتیٰ بہ قول کے مطابق جائز اور درست ہے، تو پھر صورت سوال میں مزید ایک روزہ رکھنے کا حکم دینے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد خانپوری عفی عنہ

مشکل ڈیوٹی والے حضرات روزہ رکھیں یا افطار کریں؟

انگلینڈ میں غیر معتدل ایام میں روزے کا دورانیہ کم کرنے کے لیے سبع اللیل کے قول پر عمل کی گنجائش

سوال: امسال رمضان المبارک جولائی کے مہینے میں ہوگا، جس کی وجہ سے برطانیہ کے بعض علاقوں خصوصاً اسکاٹ لینڈ میں طلوع وغروب کے حساب سے روزہ کا دورانیہ تقریباً ۲۰/ گھنٹے ہوگا، سحری اگر اقرب الایام کے حساب سے بند کی گئی (جیسا کہ عموماً فجر اس حساب سے ڈیڑھ بجے پڑھی جاتی ہے تاکہ فجر کی نماز کی ادائیگی میں سہولت ہو اور قضاء نہ ہو) تو یہ دورانیہ پونے اکیس گھنٹے بڑھ جائے گا، جس کا مطلب یہ ہے کہ اس پورے مہینے میں کھانے پینے کے لیے صرف تین یا چار گھنٹے مسلمانوں کو میسر ہوں گے۔ اور اس کے علاوہ بقیہ وقت وہ کھانے پینے سے مکمل اجتناب کریں گے۔ یہ صورتِ حال ان حضرات کے لیے جو پورا مہینہ کام کاج سے چھٹی کر سکتے ہیں،

یا جن کا کام مشقت طلب نہیں، ان کے لیے تو کسی درجے میں قابلِ برداشت ہے؛ لیکن وہ حضرات جو محنت مزدوری کرنے پر مجبور ہیں یا جو ایسے شعبوں میں ہیں جہاں ذہنی چوکنے پن میں ذرا سی کمزوری بھی جان لیوا ثابت ہو سکتی ہے ان کے لیے یہ صورتِ حال جان لیوا بھی ثابت ہو سکتی ہے۔

اسکاٹش ہائی ویز ایجنسی میں ہمارے کچھ نمازی ساتھی کام کرتے ہیں، جن کا کام سڑکوں کی دیکھ بھال اور کسی حادثے کی صورت میں فوراً وہاں پہنچ کر صورتِ حال کو قابو میں کرنا ہوتا ہے۔ اس کے لیے ایجنسی کی طرف سے ان پر یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے آپ کو مکمل فِٹ رکھیں اور ایسی تمام سرگرمیوں سے گریز کریں جو ان میں کسی نوع کی بھی خوابیدگی پیدا کرنے کا باعث ہو۔ سالِ گذشتہ رمضان المبارک کے بعد اس متعلقہ ایجنسی سے ان کے لائن مینیجر ہمارے یہاں آئے اور اتنے لمبے دورانیے کے روزے کے بارے میں تشویش کا اظہار کیا۔ ان کو تشویش یہ تھی کہ بھاگ دوڑ کے دوران بدن میں پانی کی کمی کی وجہ سے ان کے مسلمان ملازمین dehydrate ہو سکتے ہیں۔ نیز اتنے لمبے دورانیے تک کھانے پینے سے رکے رہنے کے بعد ان میں مکمل ذہنی بیداری ممکن نہیں۔ اس دوران ہائی ویز پر حادثے کی صورت میں ان کی معمولی غفلت تیز رفتار ٹریفک کے درمیان ان کے لیے یا دوسروں کے لیے جان لیوا ثابت ہو سکتی ہے۔ ہائی ویز ایجنسی دورانِ رمضان ان مسلمان ملازمین کو روزے کی حالت میں اس نوع کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے قابل نہیں سمجھتی۔ اس لیے یا تو رمضان المبارک میں انہیں جبری رخصت پر جانا ہوگا یا ممکن ہے کہ ان کی ذمہ داریوں کی نوعیت بدل دی جائے۔

آپ یقیناً اس بات سے اتفاق کریں گے کہ یہ صورتِ حال تعلیم یافتہ اور باصلاحیت مسلمانوں کے لیے جو اچھے ذمہ دارانہ عہدوں پر فائز ہیں پریشان کن ہے۔اس کی وجہ سے ان پر اعتماد، ان کی competitiveness اور ان کی employability پر بھی سوالیہ نشان لگ سکتا ہے۔ ہائی ویز ایجنسی کے علاوہ سیکیورٹی سے متعلق اداروں، محکمۂ صحت خصاصاً آپریشن تھیئٹر میں موجود مسلمان جراحوں؛ بلکہ سٹرٹیجک شعبوں میں موجود سارے ہی مسلمانوں کے لیے یہ صورتِ حال پریشانی کا باعث ہو سکتی ہے؛ بلکہ خدانخواستہ میڈیا میں یہ موضوع آیا تو اس کے اثرات برطانیہ سے باہر دیگر ممالک میں موجود مسلمانوں پر بھی ہوں گے اور یہ صورتِ حال صرف رمضان تک محدود نہیں رہے گی؛ بلکہ اس موضوع کو عموماً باعمل مسلمانوں پر اعتماد مجروح کرنے کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔آپ سے دریافت طلب امر یہ ہے کہ:

① کیا ایسے حساس شعبوں میں موجود مسلمانوں کو رمضان المبارک میں روزہ چھوڑنے اور بعد میں قضا کر لینے کی اجازت ہے یا نہیں؟

② غیر معتدل ایام میں روزے کا دورانیہ کم کرنے کے لیے سبع اللیل کے قول پر عمل کی عمومی اجازت دی جا سکتی ہے یا نہیں؟ اس طرح روزے کا دورانیہ پونے انیس گھنٹے ہو جائے گا۔

③ اس کے علاوہ اس مشکل کے حل کے لیے کوئی قابلِ عمل تدبیر بھی آپ تجویز کر سکیں تو کرم ہوگا۔

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

استفتاء میں طلبِ معیشت (ملازمت) اور شریعت کے ایک اہم فریضہ (روزہ)

کے درمیان ٹکراؤ کی صورت ہے، اس لیے اصل حکم تحریر کرنے سے پہلے بطور تمہید یہ جاننا ضروری ہے کہ ایسی صورت میں کس کو ترجیح حاصل ہے:

علامہ علاء الدین علی متقی بن حسام الدین ہندی رحمۃ اللہ علیہ، برہانپوری، گجراتی نے اپنی مشہور کتاب "کنز العمال فی سنن الاقوال و الافعال" میں طبرانی اور بیہقی سے حضرت عبد اللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت نقل فرمائی ہے: طلب كسب الحلال فريضة بعد الفريضة طب، ق، وضعفه عن ابن مسعود (کنز العمال ٤/ ٩، مطبوعه: مؤسسة الرسالة) ترجمہ: حضرت عبد اللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ رزقِ حلال کو طلب کرنا دین کے اولین فرائض کے بعد دوسرے درجہ کا فریضہ ہے۔

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم کے حوالہ سے حدیث کی تشریح نقل کی جاتی ہے؛ ملاحظہ ہو:

جس جگہ پر معیشت میں اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے عائد کردہ فرائض کے درمیان ٹکراؤ ہو جائے، وہاں پر اللہ تعالیٰ کے عائد کیے ہوئے فرائض کو ترجیح ہوگی۔ بعض لوگ افراط کے اندر مبتلا ہو جاتے ہیں، جب انہوں نے یہ سنا کہ طلبِ حلال بھی دین کا ایک حصہ ہے تو اس کو اتنا آگے بڑھایا کہ اس طلبِ حلال کے نتیجہ میں نمازیں ضائع ہو رہی ہیں تو ان کو اس کی پرواہ نہیں، روزے چھوٹ رہے ہیں تو ان کو اس کی پرواہ نہیں، حلال وحرام ایک ہو رہا ہے تو ان کو اس کی پرواہ نہیں۔

(اسلام اور جدید معاشی مسائل ١/ ١٧٩، ١٨٠)

حضرت اقدس مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری دامت برکاتہم فرماتے

ہیں: پہلی بات: کاروبار کا نمبر دوسرا ہے اور نماز کا پہلا، پس اگر نماز اور کاروبار میں تعارض ہو جائے تو نماز کو مقدم کرے گا، یہی حال نوکری اور کھیتی باڑی کا ہے، بیہقی اور طبرانی نے حدیث روایت کی ہے: "کسب الحلال فریضة بعدالفریضة" حلال روزی کمانا فرض کے بعد فرض ہے۔ (یہ حدیث فی نفسہ ضعیف ہے، مگر اپنے شواہد کی وجہ سے حسن ہے۔ کشف الخفاء)

آگے فرماتے ہیں:

خیالِ خام: اور کوئی خیال کرے کہ اگر نماز پڑھنے جائیں گے تو گاہک چلا جائے گا اور نقصان ہوگا، کھیت کا کام رہ جائے گا، ملازمت چھوٹ جائے گی تو جان لینا چاہیے کہ رزاق: گاہک، کھیت اور سیٹھ نہیں، روزی رساں اللہ تعالیٰ ہیں اور وہ بہترین روزی پہنچانے والے ہیں، پھر کیوں اسبابِ ظاہری کے چکر میں پڑا جائے، مسبب الاسباب پر اعتماد کر کے تو دیکھو!۔ (تحفۃ القاری ۵/ ۱۲۷-۱۲۹)

حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہ جہاد کے ایک سفر میں ایک منزل پر اُترے، گرمی نہایت سخت تھی اور غربت کی وجہ سے اس قدر کپڑا بھی سب کے پاس نہ تھا کہ دھوپ کی گرمی سے بچاؤ کر لیں، بہت سے لوگ اپنے ہاتھ سے آفتاب کی شعاع سے بچتے تھے، اس حالت میں بھی بہت سے روزہ دار تھے جن سے کھڑے ہو سکنے کا تحمل نہ ہوا اور گر گئے۔

عن انس قال کنا مع النبی ﷺ فی السفر فمنا الصائم و منا المفطر قال فنزلنا منزلاً فی یوم حار اکثرنا ظِلاًّ صاحب الکساء ومنا من یتقی الشمس بیده قال فسقط الصوام الحدیث. (مسلم ۱/ ۳۵۶)

جہاد کا سفر دینی سفر ہے، سفرِ شرعی میں روزہ ترک کرنے کی اجازت ہے، عرب

کی گرمی مشہور ہے؛ تاہم صحابہ رضی اللہ عنہم رمضان المبارک کے روزے رکھتے تھے، حدیث شریف میں ہے:

عن ابی ھریرۃ قال: قال رسول اللہ ﷺ: من افطر یوماً من رمضان من غیر رخصۃ و لا مرض لم یقض عنہ صوم الدھر کلہ و ان صامہ.

(رواہ احمد والترمذی وابو داؤد وابن ماجۃ والدارمی والبخاری فی ترجمۃ الباب، مشکوۃ، کتاب الصوم، باب تنزیہ الصوم، الفصل الثانی، ص/۱۷۷)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جو شخص بغیر شرعی اجازت کے اور بغیر بیماری (وغیرہ کے کسی عذر) کے رمضان کے ایک دن کا بھی روزہ (جان بوجھ کر) توڑ دے یا چھوڑ دے تو ساری عمر کے روزے بھی اس کا بدلہ نہیں ہوگا؛ اگرچہ وہ ساری عمر روزے رکھے۔

(مظاہر حق، جدید، ۲/۷۴۱)

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا رحمۃ اللہ علیہ حدیثِ بالا کے ذیل میں رقمطراز ہیں:

روزہ ارکانِ اسلام میں سے ایک رکن ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ارشاد فرمائی ہے، سب سے اول توحید ورسالت کا اقرار، اس کے بعد اسلام کے چاروں مشہور رکن: نماز، روزہ، زکوۃ، حج۔ کتنے مسلمان ہیں جو مردم شماری میں مسلمان شمار ہوتے ہیں؛ لیکن ان پانچوں میں سے ایک کے بھی کرنے والے نہیں، سرکاری کاغذات میں وہ مسلمان لکھے جائیں؛ مگر اللہ کی فہرست میں وہ مسلمان شمار نہیں ہو سکتے؛ حتی کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ اسلام کی بنیاد تین چیز پر ہے: کلمۂ شہادت، نماز اور روزہ، جو شخص ان میں سے ایک بھی چھوڑ دے وہ کافر ہے، اس کا خون کر دینا حلال ہے، علماء نے ان جیسی روایات کو انکار کے ساتھ

مقید کیا ہو یا کوئی تاویل فرمائی ہو؛ مگر اس سے انکار نہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات ایسے لوگوں کے بارے میں سخت سے سخت وارد ہوئے ہیں، فرائض کے ادا کرنے میں کوتاہی کرنے والوں کو اللہ کے قہر سے بہت ہی زیادہ ڈرنے کی ضرورت ہے کہ موت سے کسی کو چارہ نہیں، دنیا کی عیش وعشرت بہت جلد چھوٹنے والی چیز ہے۔

(فضائلِ اعمال، فضائلِ رمضان، فصلِ اول، ص/ ۶۰۰)

① صورتِ مسئولہ میں جو حضرات محنت مزدوری کرنے پر مجبور ہیں یا جن کی ڈیوٹی ذہنی چوکنّا پن کی متقاضی ہے؛ یہ حضرات سب سے پہلی یہ کوشش کریں کہ ایجنسی سے تخفیفِ عمل کی درخواست کریں یعنی وقتی طور پر ایسی ذمہ داری اور ڈیوٹی سپرد کرنے کی درخواست دیں جو روزہ کے ساتھ بآسانی نبھائی جا سکے، اگر یہ درخواست منظور ہو جائے تو زہے قسمت! مقصود حاصل ہے، اور اگر یہ درخواست مسترد ہو جائے ظاہر؛ بلکہ غالبِ گمان یہی ہے کہ موجودہ حالات میں یہ درخواست نقار خانے میں طوطی کی آواز کی حیثیت کی حامل ہے، لیکن جب اپنی طرف سے درخواست کرنے کے باوجود مسترد ہو گئی تو ایسی صورت میں درخواست دہندگان اپنی ذامہ داری پوری کرنے والے شمار ہوں گے، درخواست منظور نہ ہونے کی صورت میں، ڈیوٹی کی وجہ سے روزہ چھوڑنے کی اجازت نہیں؛ اس لیے روزہ تو رکھ لیا جائے، ڈیوٹی کے دوران بھوک کی وجہ سے ذہنی بیداری اور چوکنّا پن میں خلل واقع ہونے لگے یعنی مخدوش حالت ہو جائے تب استغفار کرتے ہوئے روزہ کو توڑ دے، رمضان کے بعد جلد از جلد روزہ کی قضا کر لیں، کفارہ واجب نہ ہوگا۔

ڈیوٹی شروع ہونے سے پہلے روزہ چھوڑنا جائز نہیں۔ جو حضرات پورا مہینہ چھٹی

لے سکتے ہیں، یا جن کی ڈیوٹی مشقت والی نہیں ان کے لیے روزہ ترک کرنا یا توڑنا جائز نہیں۔

کتبِ فقہ سے چند عبارتیں نقل کی جاتی ہیں:

صاحبِ تاتارخانیہ شیخ امام فریدالدین اندرپتی تحریر فرماتے ہیں: والخادم الحر الذی ذهب لكرى النهر فاشتد الحر و خاف علی نفسه الهلاك ينبغی ان لا تجب الكفارة لو افطر (الفتاوى التاتارخانيه جديد، كتاب الصوم، الفصل السابع فی الاسباب المبيحة للفطر، ۳/۴۰۶، مطبوعہ: مکتبہ زکریا، دیوبند)

فتاوی ہندیہ میں "قنیه" کے حوالہ سے لکھا ہے: المحترف المحتاج الی نفقته علم انه لو اشتغل بحرفته يلحقه ضرر مبيح للفطر يحرم عليه الفطر قبل ان يمرض كذا فی القنية.

(الفتاوى الهندية، كتاب الصوم، الباب الخامس فی الاعذار التی تبیح الافطار ۱/ ۲۰۸)

و الصحيح الذی يخشى ان يمرض بالصوم فهو كالمريض هكذا فی التبيين. (ایضاً:۲۰۷)(تبيين الحقائق شرح كنز الدقائق، فصل فی العوارض ۱/ ۳۳۳)

ومنها: (ای الاعذار التی تبيح الافطار) العطش و الجوع كذلك اذا خيف منهما الهلاك او نقصان العقل كالامة اذا ضعفت عن العمل و خشيت الهلاك بالصوم وكذا الذی ذهب به موكل السلطان الی العمارة فی الايام الحارة، اذا خشی الهلاك او نقصان العقل كذا فی فتح القدير (ایضاً:۲۰۷)(فتح القدير، فصل فی العوارض ۲/ ۳۵۶)

قال الرملی قال فی جامع الفتاوى و لو ضعف عن الصوم لاشتغاله بالمعيشة فله ان يفطر و يطعم لكل يوم نصف صاع اهـ اقول هذا اذا لم يدرك عدة من ايام اخر يمكنه الصوم فيها، اما اذا امكنه يجب

القضاء. (منحة الخالق علی البحر الرائق، کتاب الصوم، فصل فی العوارض ۲/۲۸۱، کوئٹه)

کتبِ فتاوی سے چند فتاوی نقل کیے جاتے ہیں:

فتاوی عثمانی جلد ۲ / ۱۷۹ سے ایک سوال وجواب نقل کیا جاتا ہے ملاحظہ ہو:

سوال: پائلٹوں کو بعض طبی وجوہات کی بناء پر روزے کی حالت میں پرواز کرنے کی ممانعت ہے، ڈاکٹروں کی ہدایات یہ ہوتی ہیں کہ جہاز اُڑانے سے قبل بھی پائلٹ ضرور کچھ کھاپی کر جائیں اور پرواز سے واپس آ کر بھی خورد ونوش کریں، ورنہ طبی نقطۂ نگاہ سے ان کی صحت پر بُرا اثر پڑ سکتا ہے، کیا اس صورت میں پائلٹ کے لیے روزہ نہ رکھنے کی اجازت از روئے شرع ہو سکتی ہے؟

نیز اس صورت میں جبکہ پائلٹ جنگی جہاز اُڑاتے ہوں اور ان کی تربیت پروگرام کے تحت لازمی ہو تو کیا ایامِ رمضان میں ان کی اُڑان اور مسافت اپنی اصلی جگہ سے اتنی دور ہوتی ہے کہ وہ پرواز کرتے ہی مسافر کے حکم میں آجاتے ہیں، تو آیا اس صورت میں وہ روزہ نہ رکھیں اور بعد میں قضاء کرلیں تو یہ جائز ہے یا نہیں؟

جواب: ڈاکٹروں کی بعض ہدایات تو محض بر بنائے احتیاط ہوتی ہیں جن کی خلاف ورزی سے کوئی واقعی نقصان عموماً نہیں ہوتا، ایسی ہدایات کی بناء پر تو روزہ چھوڑنا درست نہیں؛ لیکن اگر یہ ہدایات واقعتاً ایسی ہیں کہ ان کی خلاف ورزی سے نقصان کا گمان غالب ہے، تو ایسی صورت میں پائلٹ کے لیے روزہ چھوڑ کر دوسرے دنوں میں قضاء کرنا جائز ہوگا، سفر کی وجہ سے بلا شبہ روزہ قضا کرنے کی اجازت ہے؛ لیکن سفر سے پہلے وطن ہی میں کھانا شروع کر دینا ضرورت کی شرط کے ساتھ مشروط ہے۔ (فتاوی عثمانی ۲/ ۱۷۹، ۱۸۰)

فتاویٰ دار العلوم دیوبند میں بزبان فارسی سوال وجواب ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ کسان اور نان بائی کے لیے موسمِ گرما میں روزہ رکھنا لازم ہے اور رمضان المبارک میں ایسے مشقت والے کام نہ کرے کہ قضاء کی نوبت آئے۔

سوال: روزۂ رمضان کہ فرضیتِ اومؤکد بالقرآن والحدیث اجماعِ امت است بعذرِ کارہائے معاش ہمچو کشتہ کاری وخبازی ودیگر افعالِ شدید کہ در موسمِ گرما انسان راچنداں تشنگی می دہند، اکثر مردم کار نیز می کنند وروزہ نیز می دارند، وبعض مردمِ کاہل روزہ نمی دارند وقضا بعد آں نمی شوند، آیا گذاشتنِ روزہ بدیں عذر چہ حکم دارد؟

جواب: ازیں عذر ہا روزۂ رمضان شریف قضاء کردن درست نیست؛ بلکہ لازم است کہ در رمضان المبارک ایں چنیں اعمالِ شاقہ نکند کہ نوبتِ قضاء کردنِ روزہ برسد۔ قال فی الدر المختار لا یجوز ان یعمل عملاً یصل به الی الضعف فیخبز نصف النهار ویستریح الباقی، فان قال لا یکفینی کذب باقصر ایام الشتاء فان اجهد الحر نفسه بالعمل حتی مرض فافطر ففی کفارته قولان الخ (فتاوی دار العلوم دیوبند ۶/۳۶۶، ۳۶۷)

"آپ کے مسائل اور ان کا حل" میں ہے:

سوال: ہم گلف میں رہنے والے پاکستانی باشندے رمضان المبارک کے روزے صرف اس وجہ سے پورے نہیں رکھ سکتے کہ یہاں رمضان کے دوران شدید ترین گرمی ہوتی ہے، اور کام بھی محنت کا ہوتا ہے کہ عام حالت میں دو گھنٹے کے کام میں دس بارہ گلاس پانی پی لیا جاتا ہے، اگر ہم روزے نہ رکھیں تو کیا حکم ہے؟

جواب: کام کی وجہ سے روزے چھوڑنے کا حکم نہیں؛ البتہ مالکوں کو حکم دیا گیا

ہے کہ رمضان میں مزدوروں اور کارکنوں کا کام ہلکا کردیں۔ آپ لوگ جس کمپنی میں ملازم ہیں اس سے اس کا مطالبہ کرنا چاہیے۔ (آپ کے مسائل اوران کا حل ۴/ ۵۶۳)

آپ نے میڈیا کے متعلق تحریر فرمایا: خدانخواستہ میڈیا میں یہ موضوع آیا تو اس کے اثرات برطانیہ سے باہر دیگر ممالک میں موجود مسلمانوں پر بھی ہوں گے۔ الخ۔

شاید آپ اس سے یہ تأثر دینا چاہتے ہیں کہ روزہ کے باب میں اگر تخفیف کا فتوی نہ دیا گیا تو میڈیا مذہبِ اسلام کے اس اہم رکن (روزہ) کو موضوعِ بحث بنا کر اسلام کو تشدد پسند مذہب قرار دے گی۔

اس کا پہلا جواب یہ ہے: موجودہ دور کی میڈیا دجالی فتنہ کا ایک حصہ ہے، اس نے اسلام اور احکامِ اسلام کی دھجیاں اڑانے اور اسلام اور اہلِ اسلام کو تشدد پسند اور دہشت گرد ثابت کرنے میں بڑا رول ادا کیا ہے، میڈیا نے حدود اور تعزیر کو ظلم قرار دیا، پردہ کو آزادئ نسوانیت میں مخل سمجھا، جہاد کو دہشت گردی ثابت کیا، بے شمار ایسے مسائل ہیں جن کو میڈیا نے موضوعِ بحث بنا کر خوب اچھالا اور یہ سلسلہ جاری ہے؛ لہٰذا میڈیا سے ڈرنے اور اثر لینے کی ضرورت نہیں۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ: ذرائع ابلاغ استعمال کرنے والا ایک سنجیدہ مثبت ذہن رکھنے والا طبقہ ایسا ہے جو احکامِ اسلام پر ریسرچ کرتا ہے، اور ارکانِ اسلام کی پابندی کرنے والے کو نظرِ استحسان سے دیکھتا ہے، اگر بالفرض میڈیا نے روزہ کے مسئلہ کو اچھالا تو بہت ممکن ہے کہ سنجیدہ طبقہ روزہ کے حکم سے اچھا اثر لے اور کیا بعید ہے یہی اثر حلقۂ اسلام میں داخل ہونے کا ذریعہ بن جائے!

آپ کی معلومات کے لیے ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے اس میں غور فرمالیں،

ایک بوڑھے مسلمان کے شدید گرمی کے روزے نے انتہائی متعصب اسلام دشمن کے قلب پر کیسا اثر کیا۔ قدرت اللہ شہاب صاحب اپنے ''شہاب نامہ'' میں لکھتے ہیں:

ہالینڈ میں ہر بچے کی پیدائش میونسپلٹی کے دفتر میں رجسٹر کرانی لازمی ہے۔ اس مقصد کے لیے جو فارم بھرنا پڑتا ہے اس کے ایک خانہ میں بچے کا مذہب بھی درج کرنا ہوتا ہے، کچھ والدین یہ خانہ خالی چھوڑ دیتے ہیں؛ تاکہ سنِ بلوغت کو پہنچ کر بچہ اپنی مرضی سے جو مذہب اس کا جی چاہے اختیار کرلے۔ کئی میونسپلٹیوں میں مجھے ایسے فارم بھی نظر آئے جن میں والدین نے مذہب کا خانہ خالی چھوڑ کر اس کے نیچے اپنے ہاتھ سے یہ شرط لکھی ہوئی تھی: ''جوان ہو کر اپنی پسند کا کوئی بھی مذہب اختیار کرنے کے لیے آزاد ہے، سوائے اسلام کے۔''

ایک روز میں آرنہم کے وسیع وعریض جنگل میں گھوم رہا تھا، تھک کر درختوں کے جھنڈ میں ایک بنچ پر بیٹھا، تو قریب کے بنچ سے دھیمی دھیمی خوش الحان آواز میں سورۂ رحمن کی تلاوت کی آواز آئی۔ ایک نہایت خوش پوشاک، فرینچ کٹ سفید داڑھی والا ڈچ آنکھیں بند کیے جھوم جھوم کر سورۂ رحمن کی قراءت کر رہا تھا۔ جب وہ فارغ ہوا، تو میں نے اٹھ کر السلام علیکم کہا اس نے وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کہہ کر جواب دیا۔

''کیا آپ ڈچ مسلمان ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا۔ اس کا نام عبداللہ ڈی ہوگ تھا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ میرا وطن پاکستان ہے تو وہ بہت خوش ہوا۔ اس نے بتایا کہ اسلام کا تحفہ اسے کراچی میں نصیب ہوا تھا۔ وہ پہلے ڈچ نیوی میں اعلیٰ افسر تھا۔ وہاں سے قبل از وقت فراغت حاصل کر کے وہ مرچنٹ فلیٹ میں شامل ہو گیا اور ایک کارگوشِپ کا

کپتان بن گیا۔ یہ جہاز مشرقی بندرگاہوں اور یورپ کے درمیان سامان ڈھوتا تھا، ۱۹۴۸ء میں ایک بار اس کا جہاز کراچی کی بندرگاہ پر کچھ سامان لدوانے کے لیے رکا، گرمی اور حبس کا موسم تھا، سامان لادنے والے مزدور پسینے میں شرابور تھے۔ جہاز کے عملے نے انہیں ٹھنڈا پانی دیا، تو سب نے پینے سے انکار کردیا، کیوں کہ ان کا روزہ تھا۔ ایک بوڑھے مزدور پر ڈی ہوگ کو بڑا ترس آیا جو گرمی، حبس اور سامان کے بوجھ تلے بدحال ہو رہا تھا۔ دوسروں کی نظر بچا کر وہ اس بوڑھے کو اپنے کیبن میں لے گیا اور اسے ٹھنڈے جوس کا گلاس دے کر اشارے سے کہا کہ یہاں پر اسے کوئی نہیں دیکھ رہا، وہ چپکے سے اسے پی لے۔ بوڑھے مزدور نے نفی میں سر ہلا کر جوس کا گلاس واپس کردیا اور آسمان کی طرف انگلی اٹھا کر اللہ، اللہ کہتا ہوا کیبن سے باہر چلا گیا۔ اَن دیکھے خدا کی ذات پر اس قدر مکمل، بے ابہام اور غیر متزلزل ایمان دیکھ کر ڈی ہوگ کا دل تو اسی وقت مسلمان ہوگیا تھا؛ لیکن اس کے دماغ نے یہ تبدیلی ایک برس کے بعد قبول کی۔ اس ایک برس کے دوران اس نے اپنے جہاز کے عملے میں ڈچ زبان جاننے والا ایک انڈونیشی مسلمان عالم بھرتی کرلیا۔ اس سے انہوں نے قرآن شریف پڑھا، حدیث سے واقفیت حاصل کی اور پھر قاہرہ کی ایک مسجد میں جاکر باقاعدہ اسلام قبول کرلیا۔ (شہاب نامہ ص/۵۵۱، ۵۵۲)

(۲) جو ممالک ۴۵ / ڈگری عرض البلد سے اوپر جنوب یا شمال میں واقع ہیں، وہاں رات ودن کا وقت مختلف موسم میں متفاوت ہوتا ہے، یو-کے بھی ۵۰ سے ۵۸ عرض البلد میں واقع ہونے کی وجہ سے اس کی زد میں آتا ہے، لہٰذا غیر معتدل ایام میں رات کے سات حصے کرکے اخیری حصہ کو صبح صادق قرار دیا جائے تو علمائے

برطانیہ کی ایک جماعت نے سہولت کے خاطر اس کی گنجائش دی ہے۔

حضرت مفتی اسماعیل کچھولوی صاحب دامت برکاتہم سے لندن میں سحر کے آخری وقت کے بارے میں ایک استفتاء کیا گیا تھا، اس کا مفصل جواب ''فتاوی دینیہ'' میں ہے، جس میں حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم نے تفصیلی دلائل ذکر کیے ہیں، بطور خلاصہ لکھا ہے:

اکابرینِ امت اور فقہائے کرام کے مذکورۃ الصدر ارشادات کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو جہاں جن دنوں میں پوری رات روشنی افق پر رہتی ہے اور جس جگہ حالات کے پیشِ نظر مشاہدہ بھی مشکل ہے کہ آسمان عموماً ابر آلود رہتا ہے، حکومت کی طرف سے روشنی کا مکمل انتظام ہے؛ نیز ہر ایک شخص کو صبح صادق کی معرفت اور پہچان بھی نہیں ہوتی۔ ''الضرر یزال مهما امکن'' اور ''الضرورات تبیح المحظورات'' کے قانون کے پیشِ نظر مسافتِ سفر کی ۴۸/ میل کی تحدید اور ماءِ کثیر کی ''دہ دردہ'' کی تعیین کی طرح ان دنوں میں صبح صادق کا وقت ساتواں حصہ مقرر کر دیا جائے تو یہ اوسع للناس اور ارفق ہوگا۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے احیاء العلوم میں اور حضرت اقدس تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے امداد الفتاوی میں صبح صادق کی پہچان کے لیے جو قاعدہ بتایا ہے اسی طرح یہی فاصلہ صبح صادق اور طلوعِ شمس کے درمیان ہوا ہے۔ اور حضرت اقدس تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے رات کے ساتویں حصہ والا جو قول لکھا ہے، اس کے حساب سے تقریباً ایک گھنٹہ ہوتا ہے؛ اس لیے ایک گھنٹہ اور بطورِ احتیاط پندرہ منٹ کا اضافہ کر کے سوا گھنٹہ مقرر کرنے سے زیادہ تائید ہوتی ہے۔

میری اپنی رائے میں جن دنوں حقیقی صبح صادق ہوتی ہے ان دنوں میں یعنی آفتاب جب افق سے ۱۸/ ڈگری سے زیادہ نیچے جاتا ہے ان دنوں میں روزہ اور نماز کے لیے اسی کا اعتبار کیا جائے اور گرمی کے ان دنوں میں جب آفتاب اتنا نیچے نہیں جاتا اور آسمان پر پوری رات روشنی رہتی ہے اس وقت "فاقدروا له" پر عمل کرتے ہوئے رات کے سات حصہ کر کے اخیری حصہ کو صبح صادق کا اندازہ کر لیا جائے۔ اور اس پر عمل کر لیا جائے تو لوگوں کے لیے بھی سہولت وآسانی رہے گی اور وقت کی تعیین میں بھی زیادہ پریشانی نہیں ہوگی اور روزہ رکھنے والوں کے لیے بھی سہولت رہے گی۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔ ۱۹/ محرم الحرام ۱۴۰۳ھ

علمائے برطانیہ اور ائمہ حضرات نے بالاتفاق سوا گھنٹہ مقرر کیا وہ غیر محل میں نہیں ہے؛ بلکہ وہاں کے لوگوں کی سہولت اور شریعت کی حدود کے بموجب ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب۔ (فتاوی دینیہ ۱/ ۳۵۰ تا ۳۵۷)

③ آپ نے استفتاء میں تحریر فرمایا ہے: سالِ گذشتہ رمضان المبارک کے بعد اس متعلقہ ایجنسی سے ان کے لائن مینجر ہمارے یہاں آئے اور اتنے لمبے دور انیے کے روزے کے بارے میں تشویش کا اظہار کیا۔ الخ۔

موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اور روزہ کے بارے میں شرعی حکم اور اسلامی تعلیمات میں رعایتِ حدود کی تبلیغ کرتے ہوئے، آنجناب کی "صدرِ جمعیت اتحاد المسلمین" ہونے کے ناطے سے ذمہ داری تھی کہ ان سے فرماتے: آپ مسلم ملازمین پر ماہِ مبارک میں کام کی تخفیف کر دیں، یا ماہِ مبارک کے لیے ہنگامی ملازم بڑھا دیں، ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: من خفف عن مملوكه فيه غفر الله له و اعتقه من النار

(مشکوۃ ص/۱۷۳) ترجمہ: جو شخص اس مہینہ میں ہلکا کردے اپنے غلام (ملازم) کے بوجھ کو اللہ تعالی اس تخفیف کی بناء پر اس کی مغفرت فرماتے ہیں اور آگ سے خلاصی فرماتے ہیں۔ اور اس سلسہ کے احکام وفضائل بتلاتے، بجائے اس کے ان کی گفتگو سے متاثر ہوکر روزہ میں تخفیف کا سوال پیش فرماتے ہیں۔ یا للعجب

ہر ادارہ اور محکمہ میں ہنگامی ملازم کا انتظام ہوتا ہے؛ نیز مرض اور اعذار کی وجہ سے ایامِ رخصت کے قواعد اور ضابطے مقرر ہوتے ہیں چاہیے تھا کہ ان مینجر صاحب سے روزہ رکھنے والے کے حق میں مزید رعایت واعانت کی درخواست کی جاتی۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احقر عبد القیوم راجکوٹی، ۱۰/ رجب المرجب ۱۴۳۵ھ

الجواب صحیح: العبد احمد عفی عنہ خانپوری　　الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ

باب مفسدات الصوم

روزے کی حالت میں عود بتی کا دھواں سونگھنا

سوال: مسجد میں افطار سے قبل عود بتی سلگائی جاتی ہے اس کے دھونی سے کیا کراہت ہے روزہ میں؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

بہشتی زیور میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے مسئلہ لکھا ہے کہ لوبان سلگائی پھر اس کو اپنے پاس رکھ کر سونگھا تو روزہ جاتا رہا۔ صرف قضاء واجب ہے۔ اگر کوئی شخص قصدا

خوش بو کی کوئی چیز جلا کر اس کا دھواں اپنی طرف لے گا اور اس کو سونگھے گا تو روزہ یاد ہونے کے باوجود دھوئیں کو داخل کرنا خواہ کسی بھی صورت سے ہو روزہ فاسد ہو جائے گا۔ دھواں عنبر کا ہو یا اگر بتی جلا کر اس کا ہو یا ان کے علاوہ کسی بھی چیز کا ہو۔ (مسائل روزہ ص ۴۷) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۹/ شوال المکرم ۱۴۱۴ھ
الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

روزے کی حالت میں خون دینا

سوال: روزے کی حالت میں اگر کسی کو خون دینے کی ضرورت پیش آجائے ایک دو بوتل تو دے سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً

اگر جسم میں خون پہنچانے کا طریقہ وہی ہو جو انجکشن کے ذریعہ دوائی پہنچانے کا ہے تو روزہ کی حالت میں خون دینے سے روزہ فاسد نہیں ہوگا۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، مؤرخہ ۲۵/ شوال المکرم ۱۴۱۴ھ
الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

ہاتھ سے منی خارج کرنا مفسدِ صوم ہے

سوال: رمضان کے روزے کی حالت میں شہوت کے ساتھ منی کو گرانا، یا گرنا، اس سے روزہ ٹوٹتا ہے یا نہیں؟ اگر ٹوٹتا ہے تو اس کی قضا یا کفارہ دینا ضروری ہوگا یا

نہیں؟ لیکن مسئلہ معلوم نہ ہونے کی وجہ سے تقریباً نو یا دس سال سے اس گناہ میں مبتلا ہو تو اس کے لیے کیا کرے؟ توبہ کرنے سے معاف ہوگا یا اتنے سال کے روزے رکھنے پڑیں گے؟ اگر روزہ رکھنے کی طاقت نہ رکھتا ہو یا مسکینوں کو کھلانے کی طاقت نہ رکھتا ہو، اس کے لیے بتائیے؛ تاکہ وہ شخص ان گناہوں کی وجہ سے اللہ سے ناراض نہ ہو پائے اور عبادت کرنا چھوڑ دے، برائے مہربانی جواب کارڈ پر جلد از جلد دیجئے۔

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

ہاتھ سے منی خارج کرنا بہت سخت گناہ ہے، حدیث میں اس پر لعنت وارد ہوئی ہے، اس سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے، قضاء واجب ہے، کفارہ نہیں۔ (احسن الفتاویٰ ۴/۴۴۵) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۹/ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۱ھ
الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

استھما پمپ لینے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے

سوال: ایک صاحب مرض دمہ سے دوچار ہیں، ان کو برسوں سے اس مرض میں استھما کا پمپ لینا پڑتا ہے، یعنی جب سانس پھولنے لگتی ہے اور سانس لینے میں دشواری اور تکلیف ہوتی ہے اور حالت اس قدر خراب ہوتی ہے کہ وہ کسی کام کے لائق نہیں رہتے، چار قدم چلنا مشکل ہو جاتا ہے، اس حال میں استھما کے پمپ سے ہی تنفس صحیح ہوتا ہے، اور حالت قابو میں آتی ہے، اس پمپ کے لینے کا طریقہ یہ بتلایا کہ پمپ کو منہ کھول کر چلایا جاتا ہے، صرف ایک بار چلانا کافی ہے، اس سے ہوا نکل کر منہ میں جاتی

ہے، اسے منہ میں لے کر منہ بند کر کے ناک کے ذریعہ سانس نکال دی جاتی ہے، اس سے سانس کی نالی کی حالت درست ہو کر مرض میں تخفیف وراحت وقتی طور پر ہو جاتی ہے، آیا اس سے روزہ میں خرابی تو نہیں آتی؟ یہ دوا غالباً معدہ یا دماغ میں نہیں پہنچتی۔

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

استھما پمپ سے چلائی جانے والی دوا حلق کی راہ سے دماغ میں پہنچتی ہے، اس لیے اس سے روزہ تو فاسد ہو ہی جاوے گا۔ (فتاویٰ دار العلوم بحوالہ مسائل روزہ) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۰/ رمضان المبارک ۱۴۱۷ھ

مشت زنی سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے

سوال: رمضان میں روزے کی حالت میں اگر کسی شخص نے مشت زنی کر کے منی خارج کر دی، تو کیا اس کا روزہ ٹوٹے گا یا نہیں؟ نیز ٹوٹے گا تو کفارہ آئے گا کہ نہیں؟ اور اگر کفارہ آئے گا تو کفارہ میں کیا واجب ہوگا؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

ہاتھ سے منی خارج کرنا بہت سخت گناہ ہے، اس سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے، قضاء واجب ہے، کفارہ نہیں۔ (در مختار مع شامی ۲/۱۰۹) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ العبد احمد عفی عنہ خانپوری ۳ ذو القعدۃ الحرام ۱۴۱۲ھ

اخراج منی سے روزہ کا فساد

سوال: ایک آدمی نے رمضان المبارک میں روزہ کی حالت میں ناجائز طریقہ

سے اپنی شہوت پوری کی، اس نے ذکر رگڑ کر منی کا اخراج کیا تو کیا روزہ فاسد ہو جائے گا؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو صرف قضا واجب ہوگی یا کفارہ بھی؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً

اس سے روزہ فاسد ہو جاتا ہے، صرف قضاء واجب ہوتی ہے، کفارہ نہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد خانپوری عفی عنہ

کان میں پانی جانے سے روزہ ٹوٹتا ہے یا نہیں؟

سوال: اگر صائم حالتِ صیام کان میں پانی ڈالے تو اس کا روزہ ٹوٹے گا یا نہیں؟ اور نہ ٹوٹنا تو ظاہر ہے، شرح وقایہ کے حاشیہ میں لکھا ہے؛ لیکن ارادۃً ڈالے تو بعض جاہل لوگ روزہ ٹوٹ جائے گا بیان کرتے ہیں، تو برائے کرم روزہ ٹوٹنے کی علت واضح کیجئے اور نہیں ٹوٹتا تو بھی علت بیان کریں؛ تاکہ جاہلوں کا جہل دور ہو جائے۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً

روزہ کی حالت میں کان میں پانی چلا جائے تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا ہے؛ لیکن اگر کوئی آدمی قصداً کان میں پانی داخل کرے تو روزہ کے فساد اور عدمِ فساد میں دونوں قول ہیں، اس لیے قضاء کر لینے میں احتیاط ہے۔

أو دخل الماء في أذنه وإن كان بفعله على المختار (درالمختار) قال الشامی:(قوله: وإن كان بفعله) اختاره في الهداية والتبيين وصححه في المحيط، وفي الولوالجية: أنه المختار، فصل في الخانية بأنه إن دخل لا

يفسد، وإن ادخله يفسد في الصحيح؛ لأ نه وصل إلى ا لجوف بفعله، فلا يعتبر فيه صلاح البدن، ومثله في البزازية وا ستظهره في الفتح والبرهان شرنبلالية ملخصا (شامی ۲/ ۱۰۷) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد خانپوری عفی عنہ

روزے کی حالت میں بیوی کے ساتھ لپٹنے سے منی کا خروج

سوال: رمضان المبارک کے مہینے میں دن میں روزے کی حالت میں جوانی کے جوش میں زید اپنی بیوی سے صرف لپٹ کر پڑا رہا، جس کی وجہ سے منی خارج ہوگئی، ایسی حالت میں روزہ ٹوٹ گیا؟ اگر ٹوٹ گیا تو کیا قضاء وکفارہ دونوں واجب؟ اگر اس کا کفارہ ایک روزہ رکھا گیا تو کفارہ ہوگا یا نہیں؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

ایسا کرنے سے روزہ ٹوٹ گیا اور صرف قضا واجب ہوگی، کفارہ نہیں۔ (عمدۃ الفقہ ۳/ ۲۸۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

أملاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۸/ صفر المظفر ۲۲ھ۱۴
الجواب صحیح: عباس داود بسم اللہ

بیوی سے لپٹنے کے تین گھنٹے کے بعد لیس دار مادہ خارج ہوا تو کیا حکم ہے؟

سوال: رمضان ہی کے مہینے میں روزے کی حالت میں زید نے اپنی بیوی کو

پیار کیا، چمٹایا؛ لیکن اس وقت منی خارج نہیں ہوئی؛ بلکہ تقریباً تین گھنٹے بعد پیشاب کے ساتھ لیس دار مادہ خارج ہوا، وہ مذی تھی یا ودی یا منی یا جریان کا قطرہ، اس کے بارے میں معلوم نہیں ہوسکا، ایسی حالت میں غسل فرض ہوگیا؟ کیا ایسی حالت میں روزہ ٹوٹ گیا؟ اگر روزہ ٹوٹ گیا تو قضاء رکھنی ہوگی یا کفارہ بھی دینا ہوگا؟ اس کا کفارہ کیا ہے؟ یہ بھی بتلا دیجیے۔

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

اس سے روزہ نہیں ٹوٹا، اور غسل بھی واجب نہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

املاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۸؍ صفر المظفر ۱۴۲۲ھ

الجواب صحیح: عباس داود بسم اللہ

نسیاناً کھانے کے بعد عمداً کھانا یا جماع کرنا

سوال: مسائلِ روزہ مکتبہ رضی ص: ۵۹ پر لکھا ہے: مسئلہ جانتے ہوئے بھول کر کھانا کھانے کے بعد عمداً جماع کرنے کی صورت میں کفارہ بھی لازم ہوگا، اور عمداً محض کھانا کھانے کی صورت میں صرف قضاء ہے۔ دریافت یہ ہے کہ جب دونوں صورتوں میں عمداً ہے تو، پھر دونوں صورت میں کفارہ ہونا چاہیے، ایک میں کفارہ اور ایک میں قضاء کیوں؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

صورت مسئولہ سے متعلق جو عبارتیں شامی، فتح القدیر وغیرہ میں ہیں ان سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ، دونوں صورتوں میں (یعنی بھول کر کھا لینے کے بعد جان بوجھ کر کھانے اور جان بوجھ کر جماع کرنے سے) صرف قضاء ہی واجب ہوگی، کفارہ نہیں۔

وہ عبارتیں یہ ہیں:

ومن أكل في رمضان ناسيا وظن أن ذلك يفطره، فأكل بعد ذلك متعمدا عليه القضاء دون الكفارة؛ لأن الاشتباه استند إلى القياس، فتحقق الشبهة إلخ (هدايه)

(قوله ومن أكل في رمضان ناسيا)أو جامع ناسيا وظن أنه أفطر فأكل أو جامع عامدا، لا كفارة عليه. (فتح القدير ٢/٣٢٥)

أكل أو جامع ناسيا، أو احتلم أو أنزل بنظر،أو ذرعه القيء، فظن أنه أفطر فأكل عمدا للشبهة، ولو علم عدم فطره لزمته الكفارة؛إلا في مسئلة المتن، فلا كفارة مطلقا على المذهب، لشبهة خلاف مالك، خلافا لهما كما في المجمع وشروحه،فقيد الظن إنما هو لبيان الاتفاق. (درمختار)

(قوله إلا في مسئلة المتن)وهي مالو أكل وكذا لو جامع أو شرب؛ لأن علة عدم الكفارة خلاف مالك، وخلافه في الأكل والشرب والجماع كما في الزيلعي والهداية وغيرهما. (شامي ٢/١١)

وإنما لم تجب الكفارة بإفطاره عمدا بعد أكله أو شربه أو جماعه ناسيا؛ لأنه ظن في موضع الاشتباه بالنظير وهو الأكل عمدا؛ لأن الأكل مضاد للصوم ساهيا أو عامدا، فأورث شبهة، وكذا فيه شبهة اختلاف العلماء؛ فإن مالكا يقول بفساد صوم من أكل ناسيا وأطلقه؛فشمل ما إذا علم بأنه لايفطره،بأن بلغه الحديث أو الفتوىٰ، أولا وهو قول أبي حنيفة، وهو الصحيح. (بحر الرائق ٢/ ٣١٥) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

أملاه: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۱/ ذوالقعدہ ۱۴۲۱ھ

الجواب صحیح: عباس داود بسم اللہ

روزہ کی حالت میں میاں بیوی کے پیار کی چند صورتیں

سوال: ① اگر عورت نے روزہ کی حالت میں مرد کے عضو خاص کو پکڑا یا پکڑوایا، جس سے مرد کو منی نکل آئی تو روزہ کا کیا حکم ہے؟ مرد اور عورت دونوں کے روزوں کی وضاحت فرمائیں، آیا فقط قضا لازم ہے یا کفارہ بھی؟

② اگر عورت نے روزہ کی حالت میں مذکور کام کیا جس سے منی تو نہیں نکلی، نکلنے کے قریب تھی کہ مرد نے رد کر دی، تو روزہ غسل وغیرہ کا کیا حکم ہے؟

③ اگر خواب کی حالت میں منی نکلنے کے قریب ہو اور فوراً بیدار ہو کر روک دے، تو غسل کا کیا حکم ہے؟

④ اگر مرد نے عورت کی شرم گاہ میں انگلی داخل کی تو کیا حکم ہے؟

⑤ روزہ کی حالت میں عورت کے اور اعضا کو مس کرنا جس سے مذی نکلے یا نہ نکلے وغیرہ کا کیا حکم ہے؟ پستان کو منھ سے چومنا کیا حکم ہے؟ روزہ مکروہ ہوتا ہے؟ اگر ہوتا ہے تو تحریمی یا تنزیہی یا فاسد وغیرہ؟ تمام کا حکم وضاحت سے جواب مرحمت فرمائے۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً

① اس صورت میں مرد کا روزہ ٹوٹ گیا اور اس پر صرف قضاء واجب ہے، کفارہ نہیں ہے؛ البتہ روزہ میں یہ حرکت گناہ ہے، توبہ واستغفار دونوں پر لازم ہے۔

② اگر منی نکلی ہی نہیں یعنی روکنے کی وجہ سے اس وقت نہیں نکلی اور بعد میں شہوت ٹھنڈی پڑ جانے کے بعد بھی نہیں نکلی، تو روزہ فاسد نہیں ہوا ہے، اور اگر بعد میں بھی نکلی تو فاسد ہو گیا اور قضاء واجب ہے، کفارہ نہیں۔

③ خواب کی حالت میں منی نکلنا جس کو احتلام کہتے ہیں، اس سے روزہ فاسد نہیں ہوتا۔

④ اگر وہ انگلی پانی یا تیل سے تر تھی تو عورت کا روزہ ٹوٹ گیا اور اس پر قضاء ہے کفارہ نہیں ہے، اور اگر خشک انگلی داخل کی تو روزہ ٹوٹا نہیں ہے۔

⑤ اگر عورت کا بوسہ لیا یا اس کے جسم کا مساس کیا اور اس سے منی نکل آئی، تو روزہ فاسد ہو گیا؛ لیکن صرف قضاء واجب ہے کفارہ نہیں ہے، اور اگر ایسا کرنے سے منی نہیں نکلی تو روزہ فاسد نہیں ہوا، چاہے مذی نکلی ہو یا نہ نکلی ہو۔

عورت کا جسم چھونا (جس کی ایک صورت پستان چومنے کی بھی ہے) اس صورت میں مکروہ ہے جب انزال کا اندیشہ ہو۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری ۲۲ر شوال ۱۴۱۹ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ

روزے نہ رکھنے سے کفارہ لازم نہیں آتا، صرف قضا کرے

سوال: ڈاکٹر صاحب نے مجھے دوا لکھ کر دی، اور اس کا وقت دو مہینہ تھا، اور مسلسل استعمال کرتا تھا، اسی میں رمضان کے کچھ ایام آ گئے جس میں میں نے روزے نہ رکھے، کیا مجھے اس کی قضا کرنی پڑے گی، یعنی جیسے کوئی جان بوجھ کر روزہ چھوڑے ان کے لیے ایک غلام آزاد کرنا، دو مہینے کے روزے رکھنا یا ساٹھ غریبوں کو کھانا کھلانا، تو کیا مجھے بھی ایسے ہی کرنا پڑے گا، یا خالص روزے رکھنا پڑے گا؟ یہ مجھے مشورہ دیں۔ اگر میں دوا رمضان کے بعد استعمال کرنا چاہتا تو وہ چل سکتا تھا، میں نے شروع کیا اور

سامنے رمضان آکر کھڑا ہو گیا جس میں میرے کچھ روزے گئے، آپ شریعت کے مطابق مجھے بتائیے؛ تاکہ میں اس پر عمل کرکے آخرت کے گناہ سے بچ جاؤں۔

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

اگر آپ کو ایسی بیماری لاحق تھی جس میں شرعاً روزہ نہ رکھنے کی اجازت ہوتی ہے تب تو آپ پر گناہ نہیں ہے؛ البتہ جتنے روزے ماہ رمضان کے آپ نے نہیں رکھے اتنے روزوں کی صرف قضاء آپ پر لازم ہے، یعنی دس روزے نہیں رکھے تھے تو اس کی جگہ بہ نیتِ قضاء دس روزے رکھ لیجئے۔ اور اگر آپ کو ایسی کوئی بیماری لاحق نہیں تھی تو آپ نے ماہِ رمضان کے روزے نہ رکھ کر بڑا گناہ کیا جس کی توبہ ضروری ہے، رو، رو کر اللہ تعالیٰ سے اس کوتاہی کی معافی مانگیں، اور اس صورت میں بھی آپ پر صرف قضا ہی ہے، یعنی جتنے روزے نہیں رکھے اس کی جگہ بہ نیت قضا اتنے روزے رکھ لینا کافی ہے، آپ پر کفارہ (یعنی غلام آزاد کرنا، ساٹھ غریبوں کو کھانا کھلانا وغیرہ) نہیں ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۴/ جمادی الاخری ۱۴۱۶ھ
الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

متفرقات الصوم

لیلۃ القدر کا اعلان

سوال: ہر سال علی التعیین یہ اعلان کرنا کہ ۲۷/ رمضان لیلۃ القدر ہے یہ

اعلان کرنا سنت ہے یا بدعت؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

مسلم شریف میں حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کا قسمیہ طریقہ سے یہ فرمان وارد ہے کہ شبِ قدر ستائیسویں شب ہے۔ (مشکوٰۃ ۱۸۲)

اگرچہ دیگر روایات کے پیشِ نظر محققین نے اس کو عشرۂ اخیرہ کی طاق راتوں میں دائر مانا ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد خانپوری عفی عنہ

مختلف مقامات پر شبِ قدر کے شمار کا طریقہ

سوال: (۱) کیا ایک ہی وقت میں تمام دنیا میں شب قدر ہوتی ہے یا مختلف؟ حدیث شریف سے معلوم ہوتا ہے کہ شب قدر پورے سال میں ایک یا دو مرتبہ ہوتی ہے۔

(۲) اگر مان لیا جائے کہ لیلۃ القدر کا نزول ۲۷/رمضان کی شب میں ہو تو یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ وہی رات ہر جگہ ۲۷/کی ہو، کیوں کہ دوسرے ملک میں ۲۶ یا ۲۸ کی بھی تاریخ ہوسکتی ہے، پھر اگر ہندوستان والوں کے ۲۷/کی شب میں لیلۃ القدر کا نزول ہو رہا ہے تو دوسرے ممالک میں وہ وقت دن کا بھی ہوسکتا ہے، تو پھر شب قدر بیک وقت سارے ممالک میں ہونا لازم نہ آیا۔

(۳) مثلاً ہندوستان میں شب قدر کا نزول جمعہ ۲۷/رمضان کی شب میں ہوا، اور دوسرے ممالک میں دن کا وقت ہے تو کیا یہی شب قدر دن کا انتظار کر کے آئندہ شب یہی لیلۃ القدر منتقل ہو جائے گی یا وہاں کے لیے دوسری مرتبہ نازل ہوگی؟ اگر

دوبارہ نازل ہوئی تو ایک ہی رمضان میں دومرتبہ نزول کا ثبوت ہوا؟ پھر حدیث کا کیا مطلب ہے؟ برائے کرم مسئلہ کو مع حوالہ کے مدلل ومفصل فرمائیں، ممنون ہوں گا۔

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

جس زمانہ اور وقت کے ساتھ جو حکم یا فضیلت متعلق ہے، ہر جگہ جب وہ وقت وہ زمانہ آوے گا اسی وقت حکم یا فضیلت بھی واقع ہوگی، پس جس طرح نمازوں کا حکم ہر جگہ طلوع وغروب کے ساتھ ہے، اسی طرح یہاں کے حساب سے جو لیلۃ القدر ہوگی اس وقت وہ برکات خاصہ یہاں نازل ہوں گی، اور جس وقت دوسری جگہ کے حساب سے وہاں لیلۃ القدر ہوگی ویسے ہی برکات ورحمت وہاں اس وقت متوجہ ہوں گی۔
وھذا ظاھر جدا (امداد الفتاوی: ۶/ ۱۲۹) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۶/ ذوالحجہ الحرام ۱۴۱۴ھ

صرف دسویں محرم کا روزہ رکھنا

سوال: محرم کے مہینہ کا ایک روزہ رکھا جائے یا دو روزے رکھے جائیں، محرم کا ایک روزہ رکھنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

دسویں محرم کو روزہ رکھنا ہو تو بہتر یہ ہے کہ اس دن سے پہلے ایک دن کا روزہ بھی رکھ لے، اور اگر پہلے نہیں رکھا تو اس کے بعد والے دن کا روزہ ملالے، اکیلے دسویں محرم کا روزہ رکھنا مکروہ تنزیہی ہے۔

والمكروه تحريماً كالعيدين وتنزيهاً كعاشوراء وحده (درمختار) (قوله

كعاشوراء وحده) أي مفرداً عن التاسع أو عن الحادي عشر امداد الخ.
(شامی۲ /۹۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد خانپوری عفی عنہ

روزے کے باب میں حیض ونفاس اور احتلام کا فرق

سوال: حیض ونفاس اور احتلام تینوں حدث اکبر؛ پھر وجہ فرق کیا ہے کہ اولین مانع صوم ہے ثالث نہیں۔

الجواب: حامداً ومصلياً ومسلماً

آپ کے مطلوبہ فرق کو علامہ کاسانی رحمۃ اللہ علیہ نے بدائع الصنائع میں اس طرح بیان فرمایا ہے:

(وأما) حكم الحيض والنفاس فمنع جواز الصلاة، والصوم، وقراءة القرآن، ومس المصحف إلا بغلاف، ودخول المسجد، والطواف بالبيت لما ذكرنا في الجنب إلا أن الجنب يجوز له أداء الصوم مع الجنابة ولا يجوز للحائض، والنفساء لأن الحيض، والنفاس أغلظ من الحدث، أو بأن النص غير معقول المعنى، وهو قوله ﷺ تقعد إحداهن شطر عمرها لاتصوم ولاتصلي، أو ثبت معلولا بدفع الحرج؛ لأن درور الدم يضعفهن مع أنهن خلقن ضعيفات في الجبلة فلو كلفن بالصوم لا يقدرن على القيام به إلا بحرج، وهذا لا يوجد في الجنابة، ولهذا الجنب يقضي الصلاة، والصوم، وهن لا يقضين الصلاة، لأن الحيض يتكرر في كل شهر ثلاثة أيام إلى العشرة فيجتمع عليها صلوات كثيرة فتحرج في قضائها

ولاحرج في قضاء صيام ثلاثة أيام أو عشرة أيام في السنة، وكذا يحرم القربان في حالتي الحيض، والنفاس ولا يحرم قربان المرأة التي أجنبت لقوله تعالى ﴿فاعتزلوا النساء في المحيض ولا تقربوهن حتى يطهرن﴾ (البقرة:٢٢٢)، ومثل هذا لم يرد في الجنابة بل وردت الإباحة بقوله تعالى ﴿ فالآن باشروهن وابتغوا ما كتب الله لكم﴾ (البقرة:١٨٧) أي: ا لولد فقد أباح المباشرة وطلب الولد، وذلك بالجماع مطلقا عن الأحوال.
(بدائع الصنائع٤٤١) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

أملاہ: العبد احمد خانپوری، ۳؍رجب المرجب ۱۴۲۳ھ
الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ

مسجد میں روزہ افطار رمضان کے مہینے میں

(سوال): ہمارے یہاں مدھیہ پردیش میں عام رواج ہے کہ رمضان میں افطار کے وقت تمام لوگ اپنے اپنے گھر سے افطاری کا سامان بنا کر لاتے ہیں اور مسجد کے صحن میں یا جس مسجد میں جگہ نہ ہو تو جماعت خانے ہی میں تمام لوگ افطار کرتے ہیں آیا یہ فعل کیسا ہے؟ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا صحابہ وتابعین سے ثابت ہے یا نہیں اور ان کو اس فعل سے روکا جائے یا نہیں؟ اور اگر روکا جائے تو کس طرح کہ عام رواج ہے؟ فتنہ کھڑا ہونے کا اندیشہ ہے۔

(الجواب): حامداً ومصلیاً ومسلماً

رمضان المبارک میں روزہ دار کو افطار کرانے پر خاص فضیلت وارد ہوئی ہے اگر لوگوں کا اپنے گھر سے افطاری کا سامان مسجد کے صحن میں لاکر افطار کرنے کا

مقصد یہ ہو کہ کوئی مسافر یا غریب مسکین جو اپنی افطاری کی استطاعت نہیں رکھتا وہ بھی شریک ہو جائے اور اس طرح روزہ دار کو افطار کرانے کی فضیلت حاصل ہو جائے تو اس میں کوئی حرج کی بات نہیں البتہ مسجد کے اندر یعنی جہاں جماعت سے نماز ہوتی ہے جو شرعی مسجد کہلاتی ہے وہاں بیٹھ کر مقامی لوگوں کا جو معتکف بھی نہیں ہیں افطار کرنا درست نہیں جو حصہ مسجد سے خارج ہے وہاں بیٹھ کر افطار کر سکتے ہیں نیز اس کا بھی خیال رکھا جائے کہ شور وشغب نہ ہو اور اس طرح افطاری لانے کو ضروری اور واجب نہ سمجھا جائے بہ ایں طور کہ نہ لانے والے پر طعن و تشنیع ہو یا اس کو برا سمجھا جائے اگر ایسا ہوگا تو پھر روکا جائے گا۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

املاہ: العبد احمد خانپوری، ۵ رمضان المبارک ۱۴۲۳ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ

افطاری اور جماعت میں کتنا فصل ہو

سوال: (۱) مغرب کی نماز کس وقت ادا کی جائے؟ یعنی جماعت کب کھڑی ہو؟

(۲) افطاری میں دس منٹ ضائع کرنا مناسب ہے یا وقت پر جماعت کھڑی ہونا افضل ہے؟

(۳) متولی حضرات نے جو ۱۰ منٹ کا وقفہ دیا ہے، افطاری کے لیے کیا وہ درست ہے؟

(۴) کیا متولی حضرات مغرب کے وقت نماز باجماعت میں تبدیل کر سکتے ہیں؟ (من مانی)۔

(۵) کیا (جماعت) فرض نماز کے لیے ان لوگوں کا انتظار کرنا درست ہے جو گھر

سے افطاری کر کے آتے ہیں؟

⑥ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور ان کے بعد بزرگان دین نے بھی افطاری کے لیے اتنا وقت لیا ہے یا روزہ داروں کو دیا ہے جس سے مغرب کی فرض نماز کو ۱۰؍منٹ دیری سے پڑھیں؟ ایسی کوئی مثال یا مسئلہ ہو تو بتائیے۔

⑦ کیا مغرب کی اذان اور افطاری کے ۱۰؍منٹ بعد مغرب کی نماز (جماعت) کھڑی ہوئی تو درست ہے؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

① تا ⑦: اذان وجماعت میں اتنا فصل کیا جائے کہ پابندِ جماعت افطار سے فارغ ہو کر کلی وغیرہ کرلے اور شروع جماعت سے شریک ہو سکیں۔ جو لوگ اپنے مکان پر افطار کرتے ہیں ان کو بھی چاہیے کہ افطار میں زیادہ وقت خرچ نہ کریں، اور اپنے انتظار میں تمام حاضرین مسجد کو نہ روکے رہیں۔ آپس کی مصالحت سے وہاں کے اعتبار سے پانچ دس منٹ جیسا مناسب ہو تجویز کرلیں، اس میں نزاع نہ کریں۔ (فتاویٰ محمودیہ ۱۳؍۱۳۴) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری ۲۱؍شوال ۱۴۱۹ھ
الجواب صحیح: عباس داود بسم اللہ

مفاسد پر مشتمل افطاری پروگرام میں شرکت

سوال: غیر مسلمین کے مرتب ہوئے روزہ افطاری پروگرام میں شریک ہونا کیسا ہے؟ جب کہ ان کی طرف سے کی گئی اس ضیافت میں دیگر مفاسد کے علاوہ حرام

مال بھی ہوسکتا ہے؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

جو افطاری کا پروگرام مفاسد پر مشتمل ہو اس میں شرکت کرنا درست نہیں، چاہے اس کا ترتیب دینے والا غیر مسلم ہو یا مسلمان۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

أملاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۹؍رمضان ۱۴۲۱ھ

الجواب صحیح: عباس داود بسم اللہ

شوال کے روزوں میں قضا کی نیت کرنا

سوال: کیا شوال کے چھ روزوں میں قضاء کی نیت کریں، دونوں نیتوں کی وجہ سے دونوں کا ثواب ملے گا اور فرض ذمہ سے اتر جائے گا؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

بعض فقہاء حضرات نے اس کی اجازت دی ہے۔

في فتح القدير: صام في يوم عرفة مثل قضاء أو نذر أو كفارة ونوىٰ معه الصوم عن يوم عرفة، أفتىٰ بعضهم بالصحة والحصول عنها. انتهىٰ (حموي شرح الأشباه والنظائر ۱/۱۵۰)

احتیاط اسی میں ہے کہ قضاء کی مستقل نیت کریں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری ۳؍ذی القعدہ ۱۴۱۹ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ

باب الاعتکاف

بقعۂ مدخولہ میں اعتکاف

سوال: مسجد (جماعت خانہ) کی دیوار منہدم کر کے وسیع کر دی گئی تو بقعۂ مدخولہ کا کیا حکم ہے؟ آیا وہاں اعتکاف درست ہے یا نہ؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

توسیع کا مقصد ظاہر ہے کہ رقبۂ مسجد میں اضافہ کرنا ہے، گویا بقعۂ مدخولہ کو مسجد میں شامل کرنے کی نیت موجود ہے، اور جب بقعۂ مدخولہ بھی حصۂ مسجد بن گیا تو اس میں اعتکاف درست ہونے میں کیا تردد ہو سکتا ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۳/ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۹ھ

ہال میں اعتکاف کرنا

سوال: ہمارے گاؤں کی جامع مسجد جو تقریباً چھ سال قبل شہید کر دی گئی تھی، وہ آج تک زیرِ تعمیر ہے، اسی وقت سے پانچوں وقت کی نمازیں وہیں پر باجماعت ادا کی جاتی ہیں، اور دیگر ایک ہال کے اندر بھی نماز اسی وقت سے باجماعت ہوتی ہے جہاں اکثر نمازی ہوتے ہیں، اب رمضان کے اخیری عشرہ کا اعتکاف ہال کے اندر ضروری ہے یا نہیں؟ اگر ضروری نہیں ہے تو ہال کے اندر اعتکاف کرنے والوں کے ثواب میں مسجد میں اعتکاف کرنے والوں کے بالمقابل کوئی فرق آئے گا یا نہیں؟

نوٹ: گذشتہ چھ سالوں سے جامع مسجد اور ہال دونوں کے اندر اعتکاف کرنے کے لیے لوگوں کو بٹھایا جاتا ہے۔

مسجد کی مکمل تعمیر کے بعد ہال میں جماعت بالکل بند کردی جائے گی۔

تراویح دونوں جگہ پر برابر جاری ہے۔

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

ہال مسجد شرعی نہیں ہے؛ اس لیے اس میں اعتکاف نہ ضروری ہے، نہ ہی درست ہے، جو لوگ مسجد میں اعتکاف کر رہے ہیں ان کا اعتکاف درست ہے اور وہ مستحقِ اجرِ اعتکاف بھی ہیں اور وہاں اعتکاف ہونا بھی چاہیے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۹/ رمضان المبارک ۱۴۱۷ھ

مکتب میں اعتکاف

سوال: دارالعلوم کی ایک شاخ ہے، جہاں پر بچے بچیاں دونوں پڑھتے ہیں اور پانچ وقت کی نماز پابندی سے ہوتی ہے، تو کیا اس مکتب میں اعتکاف کرنا جائز ہے؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

اعتکاف کے لیے مسجد شرعی ہونا ضروری ہے، اس لیے مکتب میں چاہے پنج وقتہ جماعت ہوتی ہو تب بھی اعتکاف درست نہیں ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد خانپوری عفی عنہ

مسجد میں ٹھہرنے کی نیت سے اعتکاف کا ثواب نہ ملے گا

سوال: ایک شخص نماز ظہر میں آیا اور اسے یقین ہے کہ میں بیس منٹ تک مسجد میں رہوں گا، چناں چہ اسی ارادہ سے مسجد میں داخل ہوا؛ مگر اعتکاف کا استحضار یا اس کی نیت نہیں کی تو اس کا اتنی دیر مسجد میں ٹھہرے رہنا جبکہ دخول وقت ہی سے اتنی مقدار ٹھہرنے کا ارادہ ہے اعتکاف کے لیے کافی ہوگا یا نہیں؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

اعتکاف کے لیے اعتکاف کی نیت بھی شرط ہے، صورتِ مسئولہ میں نیت اعتکاف نہ ہونے کی وجہ سے اعتکاف کا تحقق نہیں ہوا۔

وهو اللبث فی المسجد مع الصوم ونية الاعتكاف، اما اللبث فركنه؛ لأنه ينبئ عنه، وشرطه النية والمسجدالخ (تبيين الحقائق ١/ ٣٤٨)
فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد خانپوری عفی عنہ

اعتکاف کے چند مسائل

سوال: ① رمضان میں اعتکاف کی حالت میں نہانے کی حاجت ہوگئی، ٹھنڈے پانی سے نہانے میں طبیعت خراب ہونے کا اندیشہ ہے، تو معتکف مسجد کے صحن میں پانی گرم کرنے تک ٹھہر سکتا ہے؟

② معتکف نے مسجد سے باہر کسی سے بات کرلی، یا سلام کا جواب دیا، تو کیا

اعتکاف فاسد ہو گیا؟

③ معتکف اپنے کپڑے دھو سکتا ہے یا نہیں؟

④ معتکف جمعہ کا غسل کر سکتا ہے یا نہیں؟

(الجواب): حامداً و مصلیاً و مسلماً

① دوسرے کو پانی گرم کرنے کے لیے کہہ دے اور وہاں تک خود تیمم کر کے مسجد میں ٹھہرا رہے۔

② چلتے چلتے بات کر لی تو اعتکاف نہیں ٹوٹا، اگر اس غرض سے ٹھہر گیا تو ٹوٹ جاوے گا۔

③ کپڑا ناپاک ہو گیا ہو تو دھو کر پاک کر سکتا ہے۔

④ غسل جمعہ کے لیے مسجد سے باہر نہیں نکل سکتا؛ البتہ جمعہ سے قبل ضرورتِ شرعیہ وطبعیہ کے لیے باہر گیا، تو واپسی میں غسل جمعہ کر سکتا ہے، جلدی غسل سے فارغ ہو کر مسجد آ جائے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد خانپوری عفی عنہ

معتکف کا غسل کے لیے نکلنا

(سوال): ① اعتکاف کی حالت میں غسل کرنے کے متعلق کیا حکم ہے؟ یہ جو مشہور ہے کہ استنجاء کے بہانہ سے جا کر غسل کر کے آئے، درست ہے یا نہیں؟

معتکف کا نماز جنازہ کے لیے نکلنا

(سوال): ② یہ نیت کر کے اعتکاف کرے کہ اگر کوئی رشتہ دار کا انتقال ہو تو میں

جنازہ میں شریک ہوں گا، وہ رشتہ دار اسی گاؤں میں یا دوسری جگہ رہتا ہو تو جا سکتا ہے یا نہیں؟

معتکف کا بیڑی پینے کے لیے نکلنا

سوال: (۳) بیڑی، سگریٹ پینے کے لیے جانے کے متعلق کیا حکم ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً

(۱) حالت اعتکاف میں فرض غسل کے لیے نکل سکتا ہے، ٹھنڈک حاصل کرنے کے لیے غسل کرنے کے واسطے مسجد سے باہر جانا جائز نہیں، اگر چلا گیا تو اعتکاف فاسد ہو جائے گا، غسل جمعہ کرنے کے لیے بھی معتکف کو مسجد سے باہر جانا جائز نہیں؛ البتہ غسل جمعہ سے قبل ضرورت طبعیہ، مثلاً: پیشاب، پاخانہ کے لیے باہر گیا تو واپسی میں غسل کر سکتا ہے؛ لیکن جلدی غسل سے فارغ ہو کر مسجد میں آجائے۔ (فتاویٰ محمودیہ جدید ۱۰/۲۸۱)

(۲) اس نیت سے کوئی فرق نہیں پڑے گا اور جنازہ میں شرکت کے لیے جائے گا تو اعتکاف فاسد ہو جاوے گا؛ البتہ نذر کے اعتکاف میں بوقت نذر یہ استثناء کیا ہو تو معتبر ہوگا۔

لوشرط وقت النذر أن يخرج لعيادة مريض وصلاة جنازة وحضور مجلس علم جاز. (درمختار مع رد المحتار ۲/۴۴۸)

(۳) اگر مجبور ہو جائے اور نہیں پینے کی صورت میں طبیعت خراب ہونے کا قوی اندیشہ ہو تو نکل سکتا ہے؛ ورنہ نہیں۔ (فتاویٰ محمودیہ جدید ۱۰/۲۳۹) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۲ / رمضان المبارک ۱۴۱۰ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

معتکف کا تراویح کے لیے مسجد سے باہر جانا

سوال: فتاوی محمودیہ ۱۰/ ۱۶۰ میں لکھا ہے: معتکف کو خارج از مسجد تراویح کی نماز کے لیے جانا جائز نہیں ہے، زید معتکف ہے اور تراویح کے لیے خارج از مسجد آتا ہے (جو کہ مسجد کا صحن بھی نہیں ہے) ایسی صورت میں زید کا اعتکاف فاسد ہوا یا نہیں؟ اس کی قضاء کرنی پڑے گی یا نہیں؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

صورتِ مسئولہ میں زید کا اعتکاف فاسد ہو گیا، اگر اعتکاف مسنون ہے تو اس دن کی قضاء روزہ سمیت لازم ہے؛ البتہ احتیاطاً رمضان کے بعد دس دن روزے سمیت قضاء کرے تو بہتر ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد خانپوری عفی عنہ

ایضاً

سوال: زید ۱۰/ سال سے اعتکاف کرتا ہے، اور تراویح کے لیے خارج از مسجد (جو کہ مسجد کا صحن بھی ہے) نکلتا ہے، فتاوی محمودیہ کی عبارت ۱۰/ ۱۶۰ کو دیکھتے ہوئے اس کا اعتکاف صحیح ہوا یا نہیں؟ یا فاسد ہوا؟ اگر فاسد ہوا تو کیا قضاء کرنی پڑے گی یا نہیں؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

اس کا اعتکاف فاسد ہوا، قضاء کے لیے وہی حکم ہے جو اوپر مذکور ہوا۔ فقط

واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲/ شعبان ۱۴۱۱ھ
الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

دورانِ اعتکاف مریضوں کو دیکھنا، ووٹ دینے یا افسر کی طلب پر جانا

سوال: فتاویٰ محمودیہ ۱۲/۱۵۰ امسائل اعتکاف میں نمبر ۵۴ یہ ہے حکیم صاحب معتکف ہیں لیکن مسجد میں روزانہ صبح ایک گھنٹہ کے قریب مریضوں کو دیکھ کر نسخے لکھتے ہیں اس کے جواب میں حضرت نے فساد اعتکاف کا حکم لگایا ہے جب کہ فتاویٰ دار العلوم دیوبند ۶/۵۰۱ خیر الفتاویٰ ۴/۱۴۵ میں عدم فساد مرقوم ہے آپ کے نزدیک جو صحیح ہو تحریر فرمائیں اسی طرح معتکف کا ووٹ کے لیے اور حاکم و افسر کے طلب پر مسجد سے نکلنا مفسد ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

حکیم صاحب کے دوران اعتکاف مسجد میں روزانہ صبح ایک گھنٹہ کے قریب مریضوں کو دیکھ کر نسخہ لکھنے سے اعتکاف فاسد نہیں ہونا چاہیے اس سلسلے میں فتاویٰ دار العلوم اور خیر الفتاویٰ کے جوابات ہی صحیح اور درست ہیں۔ ووٹ دینے کے لیے اور اسی طرح حاکم اور افسر کے طلب کرنے پر مسجد سے نکلنے سے اعتکاف فاسد ہو جائے گا۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

املاہ: العبد احمد خانپوری، ۲۱/ رجب المرجب ۱۴۲۳ھ
الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ

اعتکاف کے دوران حائضہ ہوگئی

سوال: عورت اپنے گھر کی مسجد میں اعتکاف کرے گی؛ لیکن اگر اپنے گھر ہی کی مسجد میں بیٹھے بیٹھے حائضہ ہوگئی تو کیا کرے؟ وہاں سے اٹھ جائے اور بقیہ دنوں میں قضاء کرے یا کیا کرے؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

حیض آجانے سے اعتکاف نہیں رہے گا، اگر نفل اعتکاف تھا تو وہ ختم ہوگیا، اور اگر مسنون تھا تو ایک دن کی قضاء کرلے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد خانپوری عفی عنہ

ایک امام صاحب کے اعتکاف کا حالِ زار

سوال: ہماری مسجد میں امام صاحب ہیں جو خود کو عالم کہلواتے ہیں، امسال اعتکاف میں بیٹھے ہیں اور ساتھ میں امامت بھی کرتے ہیں؛ مگر اعتکاف برائے نام ہے، اور مسجد کے صحن میں بیٹھ کر لوگوں کے ساتھ باتوں میں مشغول رہتے ہیں، طبیعت چلی جس وقت لوگ چلے گئے، برائے نام عبادت میں لگ جاتے ہیں، اور رات میں جس طرح ایک معتکف کو اللہ تعالیٰ کی بندگی میں مشغول ہونا چاہیے، تو وہ بھی برائے نام ہے، اور وقت سحری کے سحری سے فارغ ہونے کے بعد سگریٹ سلگا کر مسجد کے صحن میں نوش فرماتے ہیں، باقی اب زیادہ کیا لکھا جائے؟ کیا ایک معتکف کو اس طرح کی حرکت کرنا مناسب ہے؟ اور کیا ان تمام باتوں سے اعتکاف قائم رہتا ہے؟ آپ

اس کا مناسب جواب دیں، اسلام کی روشنی میں دیں، عین نوازش ہوگی، جو جگہ مسجد میں معتکف کے لیے قائم کی گئی وہاں برائے نام رہتے ہیں، باقی وقت مسجد کے صحن میں گذارتے ہیں۔

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

اعتکاف کی حالت میں آدمی کو ذکر، تلاوت، دعاء وغیرہ امور میں مشغول رہنا چاہیے، بلاضرورت دنیوی باتیں کرنا بغیر اعتکاف کے بھی مسجد میں مکروہ ہے، اور اعتکاف کی حالت میں اور زیادہ برا ہے، مسجد کا صحن اگر داخل مسجد ہے تو وہاں بیٹھنے سے اعتکاف فاسد نہ ہوگا، اور وہاں سگریٹ پینا جائز نہیں ہے، جو جگہ معتکف کے لیے مسجد میں متعین کی جاتی ہے اسی میں رہنا ضروری نہیں ہے، اس کے علاوہ مسجد کے دیگر حصوں میں بھی بیٹھ سکتا ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۶/شوال المکرم ۱۴۱۱ھ
الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

معتکف کے لیے مسجد میں ریڈیو لانا

سوال: ایک آدمی کو حرم شریف کی تراویح ریڈیو پر سے سننے کا بھی بہت شوق ہے، اور اعتکاف بھی کرنا چاہتا ہے، تو کیا وہ مسجد میں ریڈیو سے سن سکتا ہے؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

مسجد کی عظمت وحرمت کا تقاضہ یہ ہے کہ اس میں ریڈیو لایا ہی نہ جائے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد خانپوری عفی عنہ

معتکف کے لیے وضو کے دوران صابن کا استعمال

سوال: (۱) معتکف کیا وضوء کے لیے جائے تو حوض پر بیٹھ کر صابن سے منہ ہاتھ دھوسکتا ہے؟ اور سر میں بدبو آتی ہے تو کیا سر بھی صابن سے دھوسکتا ہے یا نہیں؟

معتکف کا مسجد میں حجامت بنوانا

سوال: (۲) اور حجام کے پاس حجامت بنواسکتا ہے؟ حجام کو مزدوری دینے پر حجامت بنائے تو کیا جائز ہے؟ کیوں کہ سورت سے ایک کتابچہ آیا ہے جو نثار بھائی واگ بکری والوں نے چھپوایا ہے اس میں لکھا ہے کہ: حجام مسجد کے باہر رہے اور معتکف مسجد میں اس صورت میں جائز ہے، اور مفتی اسماعیل صاحب کچھولوی کی کتاب میں لکھا ہے: جائز ہے، اس میں کچھ تفصیل نہیں، لہذا آپ واضح فرمائیں حجامت کس صورت میں بنائیں؟ کیوں کہ ہمارے یہاں ہر سال نائی کو بلا کر جماعت خانہ میں بال کٹواتے ہیں اور مزدوری بھی دیتے ہیں، جواب مرحمت فرمائیں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً

(۱) وضو کے لیے نکلنے کی صورت میں وضوء کے درمیان صابون کا استعمال بھی کر سکتا ہے۔

(۲) اگر حجام اجرت لے کر حجامت بناتا ہے تو اس کے لیے مسجد میں بیٹھ کر حجامت بنانا جائز نہیں ہے، اجرت لے کر مسجد میں قرآن مجید پڑھانا جائز نہیں ہے تو حجامت بنانا کیونکر جائز ہوگا؟ البتہ اگر کوئی آدمی بلا اجرت لیے معتکف کی حجامت بنا دے تو اس

شرط کے ساتھ جائز ہے کہ مسجد میں بال وغیرہ نہ پڑیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۷/ رمضان المبارک ۱۴۱۶ھ

سنتِ مؤکدہ اعتکاف کی نیت وقضاء

(سوال): سنتِ مؤکدہ اعتکاف کی نیت ایک ساتھ دس دن کی کرے یا پھر ایک ایک دن کی نیت کرلے، ایک ایک دن کی نیت کرنے کی صورت میں وہ سنتِ مؤکدہ اعتکاف رہے گا یا نفل؟ اور کسی وجہ سے سنتِ مؤکدہ اعتکاف فاسد ہوجائے تو فضائل اعمال میں ہے کہ سنت اعتکاف اور نفل اعتکاف کی قضاء نہیں ہے؛ مگر کچھ سال پہلے سنا تھا کہ جس دن فاسد ہوا اس دن کی قضا کرنی ہوگی تو کیا یہ صحیح ہے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں مدلل جواب مرحمت فرمائیں۔

(الجواب): حامداً ومصلیاً ومسلماً

ایک ساتھ پورے عشرہ کی نیت کرے تب ہی سنتِ مؤکدہ اعتکاف ادا ہوگا، ایک ایک دن کی نیت سے نہیں۔ جس دن اعتکاف فاسد ہوا اس دن کی قضا کرنی چاہیے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد خانپوری عفی عنہ

بیڑی پینے سے روکنے پر اعتکاف چھوڑ دیا گنہگار کون ہوگا؟

(سوال): موضع پونہ، ہمارے محلہ کی مسجد میں ماہِ رمضان شریف کے آخری عشرہ میں بہت سے حضرات اعتکاف کیا کرتے تھے، اس درمیان مسجد کے امام صاحب نے کہا کہ اعتکاف کرنے والے بیت الخلاء وغیرہ جگہوں میں جا کر بیڑی سگریٹ وغیرہ

ہرگز نہیں پی سکتے، جس کے نتیجہ میں جماعت والوں نے دو سال سے اعتکاف کرنا ہی چھوڑ دیا، تو بیڑی وغیرہ پینے میں شرعی کیا حکم ہے؟ اور اعتکاف ترک کر دینے سے گنہگار کون ہوں گے؟ جس کی رہبری فرما کر کرم فرمائیں، بڑی عنایت ہوگی۔

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

بیڑی بلا ضرورت پینا مکروہ ہے، بضرورت درست ہے، اور کراہت بھی بدبو کی وجہ سے ہے، اور درجۂ حرام میں نہیں ہے۔ (فتاویٰ محمودیہ ۵/ ۱۱۲)

یہ تو بیڑی پینے کا مطلق حکم ہوا، چاہے معتکف ہو یا غیر معتکف، اب اگر کوئی معتکف آدمی بیڑی پینے کا عادی ہے تو اس کے لیے حکم یہ ہے کہ وہ اعتکاف کرنے سے پہلے ہی بیڑی چھوڑنے کی کوشش کرے، اگر اس میں کامیابی نہ ہو تو تعداد اور مقدار کم کر دے، اور اگر کچھ پینی ہی پڑے تو جس وقت استنجاء اور طہارت کے لیے نکلے، اس وقت بیڑی کی حاجت پوری کرے، خاص بیڑی پینے کے لیے نہ نکلے؛ مگر جب مجبور ہو جائے اور طبیعت خراب ہونے کا خوف ہو تو اس کے لیے بھی نکل سکتا ہے، کہ ایسی اضطراری حالت کے وقت یہ طبعی ضرورت میں شمار ہوگا، اور مخل ومفسد اعتکاف نہ ہوگا۔ (فتاویٰ رحیمیہ ۵/ ۲۰۲)

معلوم ہوا کہ اعتکاف کرنے والا مذکورہ بالا طریقہ سے بیڑی پی سکتا ہے، اس لیے امام صاحب نے مطلق ممانعت کا جو حکم بتلایا وہ درست نہیں ہے، اور اسی کے نتیجہ میں اس مسجد میں عشرۂ اخیرہ کے اعتکاف کی سنت جو سنتِ کفایہ ہے چھوڑی جارہی ہے، جس کا ذریعہ امام صاحب بنے، اس لیے وہ اس گناہ کا ذریعہ بننے پر گنہگار ہوئے، اور سنتِ کفایہ چھوڑنے کا جو گناہ ہے اس میں امام صاحب کے ساتھ تمام محلہ والے بھی

داخل ہیں، آئندہ کے لیے توبہ واستغفار کرکے دوبارہ اس سنت کو جاری کریں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد خانپوری عفی عنہ

اعتکاف میں بیٹھ کر اسکول کے امتحان کی تیاری کرنا

سوال: اعتکاف میں بیٹھ کر اسکول کے امتحان کی تیاری کرنا کیسا ہے؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

اعتکاف اللہ تعالیٰ کی یاد اور ذکر وعبادت وتلاوت کے لیے کیا جاتا ہے، اسکول کے امتحان کی تیاری کے لیے نہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۴/ذوالقعدۃ الحرام ۱۴۱۵ھ
الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

كتاب الحج

دو لاکھ مالیت والے پلاٹ کے مالک پر حج فرض ہے

سوال: ایک شخص کا اپنا مکان ہے، لڑکیاں سسرال میں ہے، لڑکے اپنے کاروبار کرتے ہیں، اس شخص کی ملکیت میں ایک پلاٹ ہے دو لاکھ کی مالیت کا، مذکورہ شخص اپنا گذر بسر ملازمت سے کرتا تھا، اسی دوران ذی الحجہ آ گیا، اولاد پلاٹ کی ضرورت کا اظہار کر رہی ہیں، آیا مذکورہ شخص حج کرے یا پلاٹ اولاد کو دے دیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً

اس پر حج فرض ہے، اس کو چاہیے کہ پلاٹ بیچ کر حج کو جائے۔

(أو أرضٌ) أی لا يزرعها أو زيادةٌ على قَدْرِ حاجتِهِ من غَلّتها (أو كَرْمٌ) أي بُستانُ عِنَب و نحوِه من أشجار ثمار، زائدةٌ على مقدار التفكّه بها أو (حوانيتُ) اي من دَكاكين وحمّامات وسائرِ مستَغَلاتٍ فاضلاتٌ عن مقدار الحاجات (أو نحو ذلك) أي من ابل و بقر و غنم تُرْعَى (مما لا يَحتاجُ اليها) أي الى لبنها و شَعْرها و لحمها (يجبُ بيعُهَا ان كان بِهِ) أي بثمنها (وفاءٌ بالحج) اي بنفقةِ أداء الحج.

(حاشية ارشاد الساري الى مناسك الملا على قاري ٦٠)

فتاویٰ عالمگیری میں ہے: و في التجريد: ان كان له دارٌ لا يسكنها و عبد لا يستخدمه فعليه ان يبيعه و يحج به (١/٢١٧) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد خانپوری عفی عنہ

مقروض شخص پہلے قرض ادا کرے یا حج؟

سوال: زید نے سعودی عرب میں ملازمت کرتے ہوئے اپنے والد کو ہندوستان

میں ایک معقول رقم حج کی ادائیگی کے لیے روانہ کی؛ لیکن زید کے والد محترم ہندوستان میں ایک شخص کے مقروض ہیں، اب والد محترم کو حج کی ادائیگی پہلے کرنا چاہیے یا پہلے قرض کی ادائیگی کرنا چاہیے؟ ازراہ کرم جواب عنایت فرمائیں؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

زید کے والد محترم کو اگر اطمینان ہے کہ ان پر جو قرض ہے وہ ادا ہو جائے گا تو وہ حج کے لیے جا سکتے ہیں، موت وحیات کا کوئی بھروسہ نہیں، اس لیے حج میں جاتے وقت وصیت وانتظام کر جائے کہ میرے بعد میرا قرض میری فلاں جائیداد سے ادا کیا جائے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۲/ربیع الثانی ۱۴۱۸ھ
الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

مقروض شخص حج کرسکتا ہے

سوال: ایک شخص ہے جس پر حج فرض نہیں اس کے ذمہ قرض ہے یعنی وہ مقروض ہے مگر اس کی اولاد اس کی قرض کی ادائے گی کی ذمہ داری لیتی ہے۔ اور ان اولاد کی بھی دلی تمنا ہے کہ ان کے والدین اپنی زندگی میں حج ادا کریں اور ادھر ان کے والدین برسوں سے یہ تمنا اور دلی آرزو اور حج کی ادائیگی کی تڑپ لیے بیٹھے ہیں کہ کاش حق جل شانہ اپنے عظمت اور جلال والے مقدس گھر یعنی کعبۃ اللہ شریف اور سرور کونین، مدنی آقا کے روضۂ اطہر اور مقدس مقامات کی حاضری نصیب فرمائے۔ والد کی عمر ۵۹ اور والدہ کی ۵۵ سال کی ہو چکی ہے فی الحال والد اور والدہ ساؤتھ افریقہ میں ڈھائی سال

سے مقیم ہیں۔ والد صاحب درس وتدریس کی خدمات انجام دیتے ہیں الحمد للہ والمنہ اپنی کمائی سے بہت سارا قرض اپنا ادا کر چکے ہیں اور تدریج بتدریج ادا کر بھی رہے ہیں۔ تاہم کچھ قرض ان کے ذمہ باقی ہے۔ مگر قرض کی ادائیگی کا انھیں پوری طرح پاس ہے۔ وہ یہ چاہتے ہیں کہ ابھی اللہ تعالیٰ نے صحت اور تندرستی دے رکھی ہے جو کہ قدر علیل اور نقاہت کا شکار ہیں دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ انھیں مکمل صحت اور تندرستی عطاء فرمائے۔

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

حج کی ادائیگی کے بعد بھی قرض کی ادائیگی کے متعلق اطمینان ہے تو حج میں جا سکتا ہے کوئی گناہ نہیں ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۸ / ربیع الاول ۱۴۱۴ھ
الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

حج کے لیے وقت معیار ہے یا ظرف؟

سوال: حج کے لیے وقت معیار ہے کہ اس سال دوسرا حج ادا نہیں کر سکتے اور ظرف بھی ہے کہ پورا وقت صرف نہیں ہوگا صرف پانچ دن خرچ ہوتے ہیں اور ظرف کا تقاضہ ہے کہ مامور بہ کو اول اوسط آخر تمام وقت میں جب چاہے تب ادا کر سکتے ہیں پھر کیا وجہ ہے کہ صرف ذی الحجہ میں ادا کرتے ہیں، حکومت اعلان کر دے کہ اس سال شوال پھر ذوالقعدہ میں، ایسا نہ ہونے کی وجہ کیا ہے؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

شریعت مطہرہ کی طرف سے شوال ذوالقعدہ اور ذوالحجہ کے ابتدائی ایام کے اشہر

حج کے نام سے موسوم کرنے کے باوجود بعض افعالِ حج کی ادائیگی کے لیے ایام واوقات کی بھی تعیین کردی گئی ہے، بندوں کے اختیار پر نہیں چھوڑا گیا۔ اصولِ فقہ کا شمار فنونِ عقلیہ میں ہے، فنونِ نقلیہ میں نہیں۔ علمائے اہلِ اصول نے شریعتِ مطہرہ کے احکام وعلل کو مد نظر رکھتے ہوئے بنیادی طور پر اس کے اصول کا استخراج بہ طورِ استقراء کیا ہے اور اسی طریقِ کار پر چلتے ہوئے امرِ مقید بالوقت کی چار انواع پر عقلی تقسیم فرمائی ہے اور اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ اصولی طور پر احکامِ شرع کا مجموعی خاکہ اہلِ علم کے سامنے آجائے، چناں چہ وقتِ حج کو ظرف قرار دینے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ کسی سال حکومت کو ایسا اعلان کرنے کا اختیار دیا جائے کہ امسال حج شوال میں ہوگا۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

املاہ: العبد احمد خانپوری، ۳/رجب المرجب ۱۴۲۳ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ

باپ کا قرض ادا نہ کرنے والے کا حج صحیح ہے

سوال: ایک شخص اپنے باپ کے پاس سے قرضہ کے طور پر پیسے لے کر سعودیہ ملازمت کرنے کے لیے گیا، پھر ایک سال کے بعد باپ اپنے بیٹے سے دیے ہوئے پیسے طلب کرتا ہے، تو بیٹا جواب میں کہتا ہے کہ میں حج کرنے کے بعد دوں گا اور اس نے حج کیا تو اس لڑکے کا حج صحیح ہوگا یا نہیں؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

حج صحیح ہوجائے گا۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

حررہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، یکم محرم الحرام ۱۴۰۸ھ

نفلی حج کرنا افضل ہے یا ذاتی مکان بنانا؟

سوال: زید بمبئی میں رہتا ہے، زید کا اپنا خود ذاتی مکان نہ بمبئی میں ہے اور نہ وطن میں ہے، ابھی تک کرایہ کے مکان میں فیملی کے ساتھ رہتا ہے، زید ویسے تو کئی حج کر چکا ہے، اور بیوی کو بھی حج کرا چکا ہے؛ لیکن جب کوئی گھر لینے کے بارے میں کہتا ہے تو زید جواب دیتا ہے جب تک گھر نہیں ہو گا زکوۃ سے بچتے رہیں گے، لوگ کہتے ہیں کہ بھائی شریعت نے بیوی کے لیے ضروری کیا ہے، ویسے جس کرایہ کے گھر میں رہتے ہیں ضروریاتِ زندگی کی ہر چیز موجود ہے، صرف اپنا ذاتی گھر نہیں، اس سال بھی بیوی بچوں کے ساتھ حج کرنے جا رہے ہیں، اس پر پھر لوگوں نے کہا بھائی پہلے اپنا گھر بناؤ، زندگی اور موت کا کوئی بھروسہ نہیں کہ کیا ہو جاوے؟ کم از کم اپنا گھر رہے گا تو بیوی بچے اپنے گھر میں خود رہیں گے؛ لیکن زید کی سمجھ میں نہیں آتا، ویسے بچے ابھی صاحب نصاب نہیں ہیں کہ ان پر حج فرض ہو، پوچھنا یہ ہے کہ یہ جو پیسے حج کی نیت سے جمع کر لیے ہیں تو ان سے حج کریں یا گھر کا انتظام؟ حج تو نفلی ہوگا؛ کیوں کہ وہ پہلے بھی کئی حج کر چکا ہے، اور ایک بات یہ پوچھنا ہے کہ کیا اولاد کو حج کرانا کیا والدین پر فرض ہے؟ دوسری بات یہ کہ زید پر اب حج فرض نہیں ہے، کیا صرف نام کے لیے حج کیا جا سکتا ہے کہ ہم نے اتنا حج کیا ہے؟ اس مسئلہ پر روشنی ڈالیں۔

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

آدمی پر اہل وعیال کے لیے رہائش کا انتظام کرنا بھی ضروری ہے؛ لیکن اس کے لیے یہ ضروری نہیں کہ رہائش کا یہ انتظام اپنے ذاتی ملکیت کے مکان میں کرے؛ بلکہ

کرایہ کا مکان لے کر اس میں بھی یہ انتظام کیا ہے تو اسی کا ذمہ بری ہو جائے گا۔

صورتِ مسئولہ میں اگر زید کا فریضۂ حج ادا ہو چکا ہے تو اب مزید حج کرنا اس پر ضروری نہیں؛ نیز اولاد کو حج کرانا بھی اس پر ضروری نہیں، اگر وہ اولاد کو حج کرا رہا ہے یہ اس کا ان پر احسان ہے، بہر حال زید اگر اپنی رضا اور رغبت سے اپنے پاس آئی ہوئی رقم نفلی حج میں خرچ کرنے کے بجائے اپنے لیے ذاتی مکان حاصل کرنے میں خرچ کرے تو مناسب ہے؛ لیکن اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو اس کے اہل وعیال اس معاملہ میں اس پر کوئی جبر نہیں کر سکتے، اور شرعاً اس کے لیے ضروری نہیں ہے کہ وہ مرتے وقت اپنے اہل وعیال کے لیے گھر چھوڑ کر جائے، جب تک وہ زندہ ہے اہل وعیال کی ذمہ داری اس پر ہے جس کو وہ نبھا رہا ہے، ہاں! اہل وعیال کے ساتھ محبت وتعلق کا تقاضہ یہ ہے کہ اپنے بعد بھی ان کو کوئی تکلیف نہ پہنچے ایسا انتظام کیا جا سکتا ہو تو کر لینا مناسب ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

املاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۳۰/صفر ۱۴۲۹ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ　　الجواب صحیح: عبدالقیوم راجکوٹی

کیا عمرہ کرنے سے حج فرض ہو جاتا ہے؟

سوال: کسی آدمی نے حج کی ادائیگی سے پہلے عمرہ کر لیا تو اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟ کیا عمرہ کرنے کی وجہ سے حج فرض ہو جاتا ہے؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

ایسا آدمی جس پر پہلے سے حج فرض نہیں ہے وہ جب عمرہ کے ارادہ سے مکہ مکرمہ

اور کعبۃ اللہ شریف جا پہنچا تو اس پر فرضیت حج متعین ہو جاوے گی؛ لیکن یہ فرضیت حج بالاتفاق تب ہوگی جب حج کے مہینوں میں آ کر کعبۃ اللہ شریف میں پہنچا ہو، اور اگر کعبۃ اللہ شریف میں حج کے مہینوں میں نہیں پہنچا تو سب علماء کے نزدیک مشہور اور راجح قول میں اس پر حج فرض نہ ہوگا، کیوں کہ حج کے واجب ہونے کے لیے وقت بھی شرط ہے۔ (زبدۃ المناسک ص ۱۴، ۱۵) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد خانپوری عفی عنہ

کیا عمرہ کرنے سے حج فرض ہو جاتا ہے؟

سوال: اب کی سال ٹکٹ کی سہولت کی وجہ سے بہت سارے لوگ عمرہ کے لیے اپنے بالغ یا قریب البلوغ لڑکوں اور لڑکیوں کو بھی لے جاتے ہیں، تو کیا بیت اللہ کو دیکھنے کے بعد ان بچوں پر آئندہ حج فرض ہو جائے گا؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً

نہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۷ر شعبان ۱۴۱۶ھ

عمرہ کے لیے جانے والے پر حج فرض ہو جاتا ہے؟

سوال: یہ والدین دسمبر کی ڈیڑھ ماہ کی ہونے والی تعطیلات میں اپنے وطن عزیز انڈیا آنا چاہتے ہیں تو ان کے کچھ احباب نے یہ مشورہ دیا کہ ویسے جب کہ آپ انڈیا جا ہی رہے ہو تو کیوں نہ انڈیا جاتے وقت یا انڈیا سے آتے وقت عمرہ ادا کر لو اور اسی

سفر کے خرچ میں آپ کو بیت اللہ شریف اور روضۂ اطہر کی حاضری وزیارت کا شرف بھی حاصل ہو جائے گا۔ عمرہ کے بارے میں بزرگوں سے یہ سنا گیا ہے کہ عمرہ کرنے والے پر حج کی ادائے گی کی فرضیت لازم ہو جاتی ہے۔ کہ جب عمرہ ادا کر لیا تو اس پر حج پڑھنا واجب ہو جاتا ہے۔ تو برائے کرم شریعت مطہرہ کے احکام سے مطلع فرماتے ہوئے رہبری فرمائیں اور جلد از جلد آں قبلہ محترم جواب خط سے مسرور فرما کر عند اللہ ماجور ہوں۔ جزاکم اللہ خیر افی الدارین خیر الجزاء واحسن الجزاء۔

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

کوئی ایسا آدمی جس پر حج فرض نہیں ہے وہ حج کے مہینوں شوال، ذوالقعدہ، ذوالحجہ میں اگر کعبۃ اللہ شریف پہنچے اور ایام حج کا خرچہ کھانے کا بھی رکھتا ہو تو اس پر حج فرض ہو جاتا ہے ورنہ نہیں۔ (زبدۃ)

والدین جن ایام میں عمرہ کے لیے جانے والے ہیں یا جانا چاہتے ہیں اگر وہ اشہر حج نہیں ہے تو عمرہ کے لیے جانے کے باوجود ان پر حج فرض نہیں ہو گا۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۸/ ربیع الاول ۱۴۱۴ھ
الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

جماعتِ تبلیغ کے سفر سے فریضۂ حج ادا کرنا

سوال: کوئی بیرون کی جماعت میں جائے اور واپسی میں حج کر کے آئے تو حج کا فرض ادا ہو گا یا نہیں؟ یعنی حج ہوا یا نہیں؟

(الجواب) : حامداً ومصلیاً ومسلماً

اس کا فریضۂ حج ادا ہو گیا، اب دوبارہ بحیثیت فرض اس پر حج نہیں ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد خانپوری عفی عنہ

سرکار یا کسی اور کے خرچہ سے فریضۂ حج کی ادائیگی

(سوال) : ① مسلم سرکاری ملازمین کو سرکار اپنے خرچ پر حج بیت اللہ کے لیے بھیجتی ہے کیا اس سے حج فرض ادا ہو جاتا ہے؟

② کیا دوسرے کے خرچ سے حج فرض ادا ہو جاتا ہے؟

(الجواب) : حامداً ومصلیاً ومسلماً

① اگر وہ اپنے فریضۂ حج کی نیت کریں گے تو ان کا فرض ادا ہو جائے گا۔

② جی ہاں!۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

املاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۵ ربیع الاول ۱۴۲۳ھ

الجواب صحیح: عباس داود بسم اللہ

بیٹے کے عمرہ سے والدین پر حج فرض نہیں ہوتا

(سوال) : ایک شخص ۸ / صفر ۱۴۱۰ھ کو سعودی عربیہ گیا، اور شوال ۱۴۱۰ھ کو اس نے اپنی جانب سے دو عمرے ادا کئے، اور دوسرا عمرہ اسی موسم حج میں ادا کیا، پھر ماہ رمضان ۱۴۱۱ھ میں اسی نے دو عمرے ادا کئے، ایک اپنے والد کی جانب سے اور ایک اپنی والدہ کی جانب سے، حالاں کہ اس کے والدین تندرست اور حیات ہیں، تو کیا وہ

شخص اپنے والدین کی جانب سے عمرہ کرسکتا ہے؟ کیا عمرہ کرنے کے بعد اس کے والدین پر حج فرض ہو جائے گا؟ اور یہ آدمی سعودی عربیہ کمانے گیا ہے، اور اس کی اتنی استطاعت نہیں کہ والدین کو حج کرائے، تو برائے کرم اس سوال کا جواب عرض کیجئے۔

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

مذکور آدمی کا اپنے والدین کی طرف سے عمرہ کرنا درست ہے، ان کو عمرہ کا ثواب ملے گا، اور اس آدمی کے عمرہ کرنے کی وجہ سے والدین پر حج فرض نہیں ہوا؛ البتہ اگر والدین کے پاس اتنی مالی استطاعت ہے کہ وہ حج کرسکیں تو ان پر حج فرض ہوگا؛ ورنہ نہیں۔ بیٹا کتنا صاحب استطاعت کیوں نہ ہو، اس پر ضروری نہیں کہ والدین کو حج کرائے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۸/ ذوالقعدہ ۱۴۱۱ھ
الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

والدین نے حج نہ کیا ہو تو بیٹا مع اہلیہ حج کو جا سکتا ہے؟

سوال: میاں بیوی دونوں پانچ سال سے الگ رہتے ہیں، اور بیوی کو ان کے والد صاحب نے ملکیت کے طور پر ان کے نام پر الگ پیسے دیے ہیں۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ شوہر کی ساس سسر کہتے ہیں کہ تم حج کا فارم بھر دو، اور حج پڑھ لو، اور اتنے پیسے ہیں کہ حج آسانی سے ہوسکتا ہے، اور حج کا فارم وغیرہ بھی بھر دیا ہے، اور دیگر تمام کاروائی بھی ہو چکی ہے۔ اب اصل بات یہ ہے کہ بیوی کے والد والدہ نے تو حج پڑھ لیا ہے، اور شوہر کے والد والدہ نے حج نہیں پڑھا اور بات ایسی بنی ہے کہ اگر شوہر بیوی

کے ساتھ حج کو جاتا ہے تو ماں باپ ناراض ہوتے ہیں اور ناراض ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے ابھی تک حج نہیں پڑھا اور بیٹا حج کو جائے؟ یہ ظاہری وجہ ہے۔ اور گاؤں میں ایک عام ذہن بنا ہوا ہے کہ جب تک ماں باپ حج نہ پڑھیں وہاں تک اولاد حج کو نہیں جاسکتی، اور اس خیال میں عوام وخواص سب ہی مبتلا ہیں اور سب کا کہنا ہے کہ اگر تم حج کو چلے گئے اور حج پڑھ لیا تو تمہارا حج قبول نہیں ہوگا، اور شوہر کے پاس اتنی طاقت نہیں ہے کہ ان کو ساتھ میں حج پڑھائے اور شوہر کی تو یہ دعا ہے کہ اللہ تعالی والدین کو بھی حج نصیب فرمائے، اور اللہ تعالی جب بھی ان کے لیے حج میں جانا مقدر فرمائیں گے، وہ حسب استطاعت ان کے خرچ میں پوری مدد کرے گا۔ اور میاں بیوی جو حج میں جارہے ہیں اس میں شوہر کا کچھ بھی حصہ نہیں ہے وہ بیوی کی ملکیت ہے جس میں شوہر محرم بن کر ساتھ میں جارہا ہے تو اس طرح ناراض کر کے حج کو جانے میں حج کے اندر کچھ خرابی آسکتی ہے؟ اور خواص وعوام کے اس طرح کہنے کی وجہ سے حج میں تاخیر کی جاسکتی ہے؟ کیا والدین کے حج کرنے کا انتظار کیا جاسکتا ہے؟ اور دوسری بات یہ ہے کہ اگر بیوی ساس سسر سے معافی مانگنے جائے جو حقوق ادا نہیں ہوئے اس کی، اور ساس سسر معاف نہ کریں تو بیوی کے حج میں کوئی خرابی آسکتی ہے؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

حج اسلامی ارکان میں سے ایک اہم رکن ہے جس کی فرضیت کے لیے شریعت مطہرہ کی طرف سے کچھ شرائط ضروری قرار دیے گئے ہیں، ان میں سے ایک شرط استطاعت یعنی مالدار ہونا ہے، استطاعت سے مراد یہ ہے کہ زادِ راہ (توشہ) اور راحلہ (سواری) پر اس طرح قدرت ہو کہ وہ اس کا مالک ہو یا کرایہ پر لے کر قابض

ہو، زادِراہ اور سواری کا مالک ہونے سے مراد یہ ہے کہ اس کے پاس اپنی حاجت سے زیادہ مال ہو، یعنی اس کے رہنے کا مکان، لباس، خادم، اور گھر کے اسباب کے سوا اس قدر سرمایہ ہو کہ سواری پر مکہ مکرمہ کو جائے اور واپس آئے۔ (عمدۃ الفقہ ۴/ ۳۳، ۳۴)

حج فرض ہو جانے کے بعد اسی سال حج کرنا واجب ہے، بغیر عذر تاخیر کرنے سے گنہگار ہوگا۔ (انمول حج ص ۲۰)

اگر بیٹے میں حج کی فرضیت کی شرطیں پائی جاتی ہیں تو اس پر حج فرض ہو جاتا ہے چاہے اس کے ماں باپ نے حج کیا ہو یا نہ کیا ہو۔ عوام میں جو یہ مشہور ہے کہ بیٹا جب تک کہ والد صاحب کو حج نہ کرائے اپنا حج بھی نہ کرے یہ شریعت کے خلاف اور غلط مشہور ہے۔ "فتاوی محمودیہ" سے ایک سوال جواب نقل کیا جارہا ہے:

سوال: ایک شخص نے اپنی کمائی سے حج کے لیے روپیہ اکٹھا کیا اور وہ حج کو جانا چاہتا ہے؛ مگر لوگ کہتے ہیں پہلے والد کو حج کرانا چاہیے بعد میں خود کرے اب اس کو کیا کرنا چاہیے، جب کہ اس کے پاس اتنی گنجائش نہیں کہ والد کو بھی ساتھ لے جاسکے؟

جواب: اس کو خود اپنا حج کرنا چاہیے، پھر اگر کسی وقت وسعت ہو اور اپنے والد کو بھی حج کرادے تو عین سعادت ہے۔ یہ بات کہ جب تک والد کو حج نہ کرائے اپنا حج بھی نہ کرے، شرعی مسئلہ نہیں، بلکہ بے علم عوام میں غلط مشہور ہے۔ (فتاوی محمودیہ ۳/ ۱۷۸)

اِسی طرح "آپ کے مسائل اور ان کا شرعی حل" میں ہے:

سوال: (۱) جو شخص غیر شادی شدہ ہو اور اس کے والدین زندہ ہوں، اور والدین نے حج نہیں کیا ہو اور یہ شخص حج کرنا چاہے تو کیا اس کا حج ہو سکتا ہے؟

(۲) اگر والدین اس کو حج پر جانے کی اجازت دیں تو کیا وہ حج کر سکتا ہے؟

جواب: اگر یہ شخص صاحب استطاعت ہو تو خواہ اس کے والدین نے حج نہ کیا ہو اس کے ذمہ حج فرض ہے اور حج فرض کے لیے والدین کی اجازت شرط نہیں۔

(آپ کے مسائل اور ان کا شرعی حل ۴/ ۴۷)

اِس لیے صورت مسئولہ میں بیوی صاحب استطاعت ہے اور اس پر حج فرض ہو چکا ہے، وہ اپنا فرض حج ادا کرنے کے لیے سفر میں اپنے شوہر کو بھی لے جا رہی ہے تو شوہر کو بیوی کے ساتھ حج کے لیے جانے میں شرعاً کوئی حرج یا گناہ نہیں، چاہے شوہر کے ماں باپ نے حج نہ کیا ہو، لوگوں کا یہ سمجھنا کہ ماں باپ نے اگر حج نہیں کیا ہے اور بیٹا حج کر لے گا تو اس کا حج قبول نہیں ہوگا یہ سب غلط اور بے اصل ہے، اور لوگوں کے اس طرح کہنے سے حج میں تاخیر کرنے کی وجہ سے عورت گنہگار ہوگی، اگر اس کا شوہر ماں باپ کا خیال کر کے حج میں آنے کے لیے تیار نہ ہو تو عورت کے لیے ضروری ہے کہ اپنے دوسرے محرم رشتہ دار باپ، بھائی یا چچا یا ماموں میں سے کسی کو ساتھ لے جائے اور اپنا فرض حج ادا کرے، اور بیوی کو ایسا کرنے کے لیے شرعاً شوہر کی اجازت کی بھی ضرورت نہیں اگر شوہر اجازت نہ بھی دے تب بھی عورت جا سکتی ہے، بیوی سفر حج سے پہلے ساس سسر سے معافی تلافی کے لیے جائے پھر بھی ساس سُسر معاف نہ کریں تو اس سے بیوی کے حج میں کوئی کمی نہیں آئے گی۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

املاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۳/ ۶/ ۱۴۲۶ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ

بیٹے کا والدہ کے ہوتے ہوئے والد کے ساتھ حج کرنا

سوال: میرے والد مجھے آئندہ سال حج کو جانے کے لیے کہتے ہیں کہ میں اور

تو یعنی باپ بیٹا حج کریں گے امی کو نہیں میری والدہ ابھی زندہ ہے اور میں چاہتا ہوں کہ امی ابا حج کرے تو اچھا ہے کیوں کہ ان کا حق ہے چاہے اس معاملہ میں وہ خود کے پیسے سے حج کریں یا کوئی اللہ کا بندہ ان کو روانہ کرے تو اس صورت میں بیٹے کا حج کرنا کیسا ہے؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

آپ پر حج فرض نہیں ہے آپ کے والد صاحب آپ کو حج کروا رہے ہیں تو آپ کے لیے ان کی اس فرمائش اور خواہش پر عمل کرتے ہوئے حج کرنے میں کوئی اشکال نہیں آپ کی والدہ کا حج نہیں ہوا اور والد صاحب ان کو لے جانے کے بہ جائے آپ کو لے جا رہے ہیں یہ بات آپ کے لیے حج میں جانے سے رکاوٹ نہیں ہے آپ کا حج ادا ہو جائے گا۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

املاہ: العبد احمد خانپوری، ۱۲ر رمضان المبارک ۱۴۲۳ھ
الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ

مدینہ منوّرہ سے مکہ مکرمہ بغیر احرام جانے سے دم لازم ہوگا یا کوئی اور صورت ہے؟

سوال: مکہ مکرمہ کے اندر مدرسہ صولتیہ میں ہم نے ایک مولانا سے معلوم کیا کہ مدینہ شریف سے مکہ بغیر احرام باندھے ہوئے آئے تو کیا اس کے متعلق دم دینا پڑے گا؟ تو جواباً انہوں نے کہا کہ ہاں دم دینا ہوگا؛ مگر پھر ہم نے کہا کہ دم کے بغیر اور کوئی راستہ

ہے؟ جس کے جواب میں انہوں نے کہا کہ اگر آپ دوسری مرتبہ ہندوستان سے مدینہ منورہ آویں تو اس طرح نیت کریں کہ گذشتہ وقت میں ہم مکہ شریف بغیر احرام کے چلے گئے تھے تو وہ احرام بھی شامل کرتے ہوئے حالیہ احرام کرنے کی نیت کرتا ہوں۔ تو معلوم کرنا یہ ہے کہ اس طرح نیت کرنے سے گذشتہ چھوٹے ہوئے احرام کی ادائیگی درست ہو جائے گی؟ برابر اسی طرح اگر جدہ سے مکہ مکرمہ بغیر احرام باندھے داخل ہو گئے اور اس کی قضاء بھی مذکورہ بالا صورت کے مطابق دوسری مرتبہ جانے پر ترک شدہ احرام کی بھی نیت کر لینے سے احرام باندھنا صحیح ہوگا یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً

تحریر کردہ حیلہ صحیح ہے؛ مگر اتنا یاد رہے کہ بغیر احرام باندھے داخل ہونے کے بعد اس سال اس نے حج یا عمرہ نہ کیا ہو تو یہی مسئلہ ہے کہ آئندہ جب میقات سے احرام باندھ کر جائے گا تو دم ساقط ہو جائے گا اور اگر بغیر احرام باندھے داخل ہو گیا اور حج یا عمرہ کر لیا تو دم ساقط نہ ہوگا۔ (زبدہ ۲/ ۱۲۳) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

واپسی میں جدہ سے مکہ برائے طواف جانے پر احرام کا حکم

سوال: فتاویٰ رحیمیہ ۳/ ۵۲ ''مکہ معظمہ میں داخل ہونے کے لیے احرام باندھے یا نہیں؟'' کے ذیل میں یہ پوچھنا ہے کہ حج، عمرہ اور زیارت کے بعد وطن واپسی کے لیے مدینہ سے جدہ پہنچ کر ٹکٹ نہ ملنے کی وجہ سے کچھ دن یا کچھ وقت رکنا پڑا، اس وقت عمرہ کی نیت سے حرم میں جائے تو احرام باندھ کر جانا ہے، یہ تو سمجھ میں

آ گیا؛ لیکن اگر نماز وطواف کے لیے کعبہ شریف جانا ہوا تو اس وقت بھی احرام باندھنا پڑے گا یا نہیں؟ کیوں کہ جدہ پہنچنے کے بعد وہ اہلِ حل میں داخل ہو گیا؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

یہ مسئلہ فتاویٰ رحیمیہ میں قرۃ العینین (زبدۃ المناسک) کے حوالے سے دیا گیا ہے، اس میں پوری تفصیل مع تعلیل مذکور ہے، وہ آدمی جدہ کے ارادہ سے وہاں نہیں گیا؛ بلکہ اپنے وطن جانے کے ارادہ سے جدہ پر سے ان کا مرور ہو رہا ہے اس لیے وہ جدہ والوں کے حکم میں نہیں؛ بلکہ ابھی راستہ ہی میں ہے، اور اس نے مکہ میں دخول کا ارادہ کیا اور مکہ کا دخول آفاقی کے لیے بغیر احرام کے درست نہیں ہے، اگر وہ خاص جدہ کے ارادہ سے وہاں پہنچا ہوتا اور پھر وہ مکہ جانے کا ارادہ کرتا تو اس کو جدہ والوں کے حکم میں شمار کرتے۔ دیکھئے زبدہ ۱ / ۵۴۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۴ / رمضان المبارک ۱۴۱۸ھ
الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

حج کی سعی سے پہلے عمرہ

سوال: کسی حاجی نے پندرہ ذی الحجہ تک حج کی سعی نہیں کی، وہ حج کی سعی سے پہلے عمرہ کرنا چاہتا ہے تو کیا اس کا عمرہ ہو جائے گا یا اس کو عمرے سے پہلے حج کی سعی کرنا ضروری ہے؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

اس کو چاہیے کہ پہلے حج کی سعی کر لے اس کے بعد عمرہ کرے، اس کے باوجود

اگر کسی نے سعی سے پہلے عمرہ کرلیا تو وہ درست ہوجائے گا۔

املاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۱/محرم الحرام ۱۴۲۵ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ

حج کی سعی سے پہلے صحبت کرنا کیسا ہے؟

سوال: سعی سے پہلے میاں بیوی صحبت کرسکتے ہیں؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

اگر حلق بھی کراچکا ہے تو صحبت حلال ہوجائے گی؛ ورنہ نہیں۔

وحل له النساء بالحلق السابق حتى لو طاف قبل الحلق لم يحل له شيء(درمختار) (قوله حل له النساء) أي بعد الركن منه وهو أربعة أشواط بحر (شامی۲/۱۹۹)

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۴/رمضان المبارک ۱۴۱۸ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

سواری چلانے والے کے لیے مستقل سعی کی ضرورت نہیں

سوال: سوار ہونے والے اور سواری چلانے والے کی سعی ایک ساتھ ہوجاتی ہے یا سواری چلانے والے کو مستقل طور پر اپنی سعی کرنی ہوگی؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

سواری چلانے والے کی سعی بھی ادا ہوجائے گی، چاہے نیت کی ہو یا نہ کی ہو؛

البتہ نیت کر لینا سنت ہے۔ (زبدۃ المناسک ص ۱۲۳) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد خانپوری عفی عنہ

محرم کے لیے سلی ہوئی لنگی پہننے کا جواز

سوال: ① حالتِ احرام میں سلی ہوئی لنگی پہننا کیسا ہے؟ برطانیہ میں علماء کی ایک جماعت سلی ہوئی لنگی پہننے کی نہ صرف یہ کہ اجازت دیتی ہے؛ بلکہ ان کا عمل بھی اسی پر ہے، فتاوی رحیمیہ ۸ / ۲۸۶، اور معلم الحجاج ص/ ۱۲۸ سے حفاظتِ ستر کی صورت میں اس کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، اور معلم الحجاج کے ص/ ۳۴۶ کے جزئیہ سے بغیر عذر کے بھی پہننے کا جواز مفہوم ہوتا ہے، کیا بغیر عذر کی صورت میں کوئی لنگی سی کر پہنے تو دم واجب ہوگا یا نہیں؟

② آج کل برطانیہ میں ایک کپڑا اس طرح بنایا جاتا ہے جو لنگی کی شکل میں گول ہوتا ہے، مگر اس میں کہیں بھی سلائی نہیں ہوتی، اس کی بُنائی ہی اس طرح سے کی جاتی ہے کہ اس میں سلائی نہ آئے، اس طرح کی لنگی جس کی بُنائی میں کسی طرح کی سلائی نہ ہو اس کا استعمال جائز ہے یا نہیں؟ اگر کوئی اس طرح کی لنگی حالتِ احرام میں استعمال کرے تو دم واجب ہوگا؟

③ کیا لنگی کا شمار فقہاء کے یہاں ان کپڑوں میں سے ہے جو جسم کی ہیئت کے مطابق بنائے گئے ہیں، جیسے: کرتہ، قمیص، پاجامہ وغیرہ۔

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

① تمام اہلِ علم کا اس پر اتفاق ہے کہ محرم مرد کے لیے سلا ہوا کپڑا پہننا ناجائز ہے۔

حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

قال ابن المنذر: اجمع اهل العلم على ان المحرم ممنوع من لبس القميص والعمائم والسراويلات و البرانس و الخفاف، و الاصل فى هذا حديث ابن عمر؛ ان رجلاً سأل النبى ﷺ مايلبس المحرم من الثياب؟ وحديث يعلى فى رجل احرم و عليه جبة، فقال له: اخلع عنك الجبة الحديث متفق عليه) نص النبى ﷺ على هذه الاشياء، والحق بها اهل العلم ما فى معناه مثل الدرعة والتبان واشباه ذلك، فلا يجوز للمحرم ستر بدنه بما عمل على قدره، ولا ستر عضومن اعضائه بما عمل على قدره، كالقميص والسراويل والقفازين وا لخفين ونحو ذلك، وليس فى هذا اختلاف قال ابن عبد البر: لا يجوز لبس شيئ من المخيط بشرط كونه معمولاً على قدر البدن او العضو) عند جميع اهل العلم، واجمعوا على ان المراد بهذا الذكور دون الاناث اه (اعلاء السنن ١٠/ ٥٧)

سلے ہوئے کپڑے کے متعلق حضراتِ فقہاء نے ضابطہ بیان فرمایا ہے: ضابطہ ’’غنیۃ الناسک‘‘ سے نقل کیا جاتا ہے، یہ کتاب فقیہِ وقت حضرت مولانا حسن شاہ ابن مولانا مکرم شاہ حنفی قادری پشاروی مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کی ہے، جو ہمارے اکابر کے یہاں مناسک میں بہت ہی قابلِ اعتماد سمجھی جاتی ہے، فرماتے ہیں:

قال الحلبي: ان ضابطه لبس كل شيء معمول على قدر البدن او بعضه بحيث يحيط به بخياطته او تلزق بعضه ببعض وغيرهما ويستمسك عليه بنفس لبس مثله؛ الا المكعب بكسر الميم و فتح العين اه

ضابطہ بیان فرما کر فوائدِ قیود کی تشریح بایں الفاظ میں فرماتے ہیں:

فخرج ماخيط بعضه ببعض لا بحيث يحيط بالبدن مثل المرقعة فلا بأس بلبسه، وكذا لو اردى بالقميص اواتشح به فلا بأس به لعدم الاحاطة بواسطة الخياطة، و كذا لو لبس الطيلسان و لم يزره لعدم الاستمساك بنفسه، ولهذا يتكلف فى حفظه، فلو زره فهو لبس المخيط لحصول الاستمساك بالزرمع الاحاطة بالخياطةاه و افاد قوله او بعضه حرمة لبس القفازين فى يد ى الرجل، وبه صرح فى الكبير وغيره(غنية الناسك فى بغية المناسك ص٤٤مطبوعه مطبع خيريه ميرٹھ)

سلے ہوئے کپڑے کا یہی ضابطہ من وعن علامہ ابن نجیم رحمۃ اللہ علیہ نے ''بحر'' میں نقل فرمایا ہے۔ ملاحظہ ہو: بحر الرائق، باب الاحرام ۲ / ۳۴۸۔

ضابطہ کی تشریح ''عمدۃ الفقہ'' میں اس طرح بیان فرمائی ہے:

سلے ہوئے کپڑے سے مراد وہ لباس ہے جو پورے بدن یا بدن کے کسی عضو کے مطابق بنا ہوا ہو، اور وہ سلائی یا بنائی کے ذریعہ یا اس کے بعض حصوں کو بعض کے ساتھ چپکا کر یا کسی اور طریقہ سے بدن یا کسی عضو کا احاطہ کرلے اور اس کو معمول (یعنی جسم کی وضع وتراش) کے مطابق پہنا جائے، اور کپڑا کسی چیز سے روکے بغیر بدن پر خود بخود ٹھہرا رہے سوائے ملعب کے (جس کی تفصیل کتابِ ہذا میں مذکور ہے) پس احرام کی حالت میں سلا ہوا کپڑا پہننا اس وقت منع ہے جب کہ اس کپڑے میں دو باتیں پائی جائیں: یعنی ① سلائی وغیرہ کے ذریعہ بدن یا کسی عضو کا احاطہ کرنا۔ ② خود بخود بدن یا عضوِ بدن پر ٹھہرے رہنا، اگر ان دونوں میں سے کوئی ایک بات نہ پائی گئی تو وہ کپڑا سلے ہوئے کے حکم میں نہیں رہے گا، پس دستانے بھی سلے ہوئے کپڑے کے حکم میں ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ جو کپڑا بدن یا کسی عضو کی ساخت پر بنا ہوا نہ ہو؛ بلکہ پیوند لگا

کر چادر کی طرح) سیا گیا ہو یا عرض کم ہونے کی وجہ سے دو پاٹ کو جوڑ کر چادر کی طرح سی کر ایک بنالیا ہو تو وہ سلے ہوئے کے حکم میں نہیں ہے، پس اس کے پہننے میں کوئی حرج نہیں ہے، اسی طرح اگر قمیص کو چادر کی طرح اوڑھ لیا یا تہ بند کی طرح باندھ لیا تو کوئی مضائقہ نہیں ہے؛ کیوں کہ اس طرح پہننے میں سلائی کے ذریعہ بدن کا احاطہ کرنا نہیں پایا گیا، اور اسی طرح طیلسان (چوغا جبہ) پہننے کا مضائقہ نہیں ہے؛ جبکہ اس کی گھنڈی (بٹن وغیرہ) نہ لگائے؛ کیوں کہ یہ بھی خود بخود بدن پر نہیں ٹھہرتا اور اس کے سنبھالنے میں تکلف کرنا پڑتا ہے۔ (عمدۃ الفقہ، کتاب الحج ۴/ ۴۸۷)

آپ کے سوالات کے جوابات حسبِ ذیل ہیں:

(الف) ستر کھلنے کا اندیشہ ہو تو حالتِ احرام میں سلی ہوئی لنگی پہننے کی گنجائش ہے؛ کیوں کہ یہ لنگی باندھے بغیر بدن پر نہیں ٹھہرتی، پس لنگی اس لباس میں داخل ہے جس کے استعمال سے دم واجب نہیں ہوتا۔

وعقد الازار والرداء بأن يربط طرف احدهما بطرفه الاخر شرح: وان يخلله بخلال او يشده بحبل و نحوه.

(غنية الناسك،فصل فی مكروهات الاحرام و محظوراته إلخ ص٤٧)

بلا ضرورت ایسی سلی ہوئی لنگی سے احتراز کرے۔ (ماخوذ از فتاوی رحیمیہ ۸/ ۲۸۶)

معلم الحجاج کی عبارت جزئیہ ضرورت پر محمول ہے "سترِ عورت کی خاطر" کی قید لگانا اس کا قرینہ ہے۔

(ب) اس کی بنائی سینے کے حکم میں ہے، لہذا اس کے استعمال کا وہی حکم ہوگا جو اوپر گذرا۔

(ج) نہیں؛ بلکہ ہمیانی باندھنے کی طرح ہے جو روپیہ، پیسہ کی حفاظت کی خاطر کمر سے باندھی جاتی ہے۔

ولا بأس ان يشد فی وسطه الهميان ليس فيه معنى لبس المخيط.

(هدايه ١/ ٢٤٠)

جو حضرات عام حالات میں کھلی لنگی پہننے کے عادی ہیں یا ایسی کھلی لنگی میں ستر کی حفاظت پر قادر ہیں ان کو ایسی سلی ہوئی لنگی استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

حالت احرام میں نیکر یا لنگوٹ پہننا

سوال: کسی تکلیف کی وجہ سے حج میں سلا ہوا کپڑا پہن سکتے ہیں یا نہیں؟ مثلاً خصیتین بڑے ہو گئے ہوں تو کیا انڈرویر یا لنگوٹ پہن سکتے ہیں؟ بینوا توجروا

الجواب: حامداً ومصلياً ومسلماً

عذر کی وجہ سے لنگوٹ باندھنا جائز ہے، اور بدونِ عذر مکروہ ہے، مگر اس پر کوئی جزا واجب نہیں، نیکر پہننا بہر حال ناجائز ہے، اور اس پر لبس مخیط کی جزا واجب ہے۔ (احسن الفتاوی ۵۲۱/۴) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۶/ ذوالقعدہ ۱۴۱۳ھ
الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

کیا محرم کے لیے سلی ہوئی لنگی کا پہننا بلا کراہت جائز ہے؟

سوال: انوار مناسک "ص ۲۱۰" پر لکھا ہے۔ "لہذا سلی ہوئی لنگی پہننا

بلا کراہت جائز اور درست ہے''۔ نیز ص ۲۶۰ پر لکھا ہے ''لیکن سلی ہوئی لنگی کا پہننا بلا کراہت جائز اور درست ہے، اسی طرح احرام کی دو چادروں میں سے ایک کو لنگی کی طرح سل دیا جائے؛ تا کہ چلتے وقت ران اور ستر نہ کھلے تو بلا کراہت جائز اور درست ہے'' تو کیا احرام کی حالت میں لنگی پہننا بلا کراہت جائز اور درست ہے؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

احرام کی حالت میں سلا ہوا کپڑا پہننے کی ممانعت کے سلسلہ میں حضرات فقہاء ایک ضابطہ اور اصول تحریر فرماتے ہیں۔ چناں چہ شامی میں ہے:

وفی البحر عن مناسك ابن امیر حاج الحلبی: ان ضا بطه لبس کل شیء معمول علی قدر البدن او بعضه بحیث یحیط به بخیا طة او تلزیق بعضه ببعض او غیرهما ویستمسك علیه بنفس لبس مثله الا المکعب اه قلت: فخرج ما خیط بعضه ببعض لا بحیث یحیط بالبدن مثل المرقعة فلا باس بلبسه کما قدمناه (شامی کوئٹه ۲/ ۱۷۷)

(ترجمہ): ''بحر الرائق'' میں ابن امیر حاج حلبی کی مناسک کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اس کا اصول یہ ہے کہ جو لباس انسان کے تمام بدن یا بدن کے بعض حصے کے موافق بنایا گیا ہو اس طرح پر کہ وہ سلائی کے ذریعہ یا بعض حصوں کو بعض کے ساتھ چپکانے سے یا کسی اور طرح سے (مثلاً بنائی سے) کل بدن یا بدن کے بعض حصوں کو ڈھانپ لے اور وہ خود بخود جسم پر ٹھہرا رہے، ایسا لباس احرام کی حالت میں پہننا منع ہے سوائے مکعب کے، میں کہتا ہوں کہ اس حکم سے وہ کپڑا خارج ہے جس کا بعض حصہ بعض کے ساتھ اس طرح سلا ہوا ہو کہ وہ بدن یا اس کے کسی حصہ کی وضع پر نہ ہو، مثلاً

پیوند لگا ہوا کپڑا کہ اس کے پہننے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

یہی ضابطہ غنیۃ الناسک میں ص ۴۴ پر موجود ہے۔

چناں چہ اسی اصول کے ماتحت فقہاء ایسے آدمی کے لیے جس کے پاس اتنی بڑی چادر موجود نہیں، جس سے وہ اپنے جسم کو ڈھانپ سکے؛ لیکن دو ٹکڑوں کو جوڑ کر اس چادر کو تیار کیا گیا ہے تو اگر چہ یہاں پر کپڑے کے دو ٹکڑوں کو جوڑنے کے لیے سلائی کی گئی ہے اور لغوی اعتبار سے یہ سلا ہوا کپڑا کہا جا سکتا ہے؛ لیکن چوں کہ یہ سلائی آدمی کے بدن یا کسی عضو کے موافق نہیں کی گئی ہے؛ اس لیے اگر اس آدمی کے پاس پوری لمبی چادر نہیں ہے اس کے لیے اس چادر کے استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں؛ البتہ اگر پوری لمبی چادر موجود ہو جس کے ذریعہ جسم کو ڈھانپا جا سکتا ہے تو اس کا استعمال بہتر ہے۔ چناں چہ ''امداد الفتاوی'' میں ایک سوال کے اندر یہ پوچھا گیا ہے کہ کوئی ازار یا چادر جو کہ کم عرض ہونے کی وجہ سے احرام کی حالت میں دو پاٹ کر کے پہن لی جاوے تو اس کا کیا حکم ہے؟ اس کے جواب میں حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

''گو افضل یہی ہے کہ اس میں بالکل سلائی نہ ہو؛ لیکن اگر دو پاٹوں کو جوڑنے کے لیے سلائی کی جاوے تب بھی جائز ہے''۔ (امداد الفتاوی ۲/۱۴۶)

خلاصہ یہ ہے کہ ایک تو سلا ہوا وہ لباس جس کو احرام کی حالت میں پہننے کی وجہ سے دم واجب ہوتا ہے، اس کے لیے تو وہی ضابطہ ہے جو جواب کے شروع میں بتلایا گیا؛ اس لیے اگر کوئی ایسا لباس جو بدن یا بدن کے کسی عضو کی ہیئت پر سلا یا بنایا نہیں گیا ہے؛ لیکن اس میں سلائی موجود ہے تو اس کے پہننے سے دم تو واجب نہیں ہوگا؛ مگر افضل اور بہتر یہی ہے کہ سلائی کسی شکل میں موجود نہ ہو جیسا کہ اوپر ''امداد الفتاوی''

کے جواب سے ظاہر ہے۔

رہا سلی ہوئی لنگی کا پہننا، تو اگر کسی آدمی کو ستر کھل جانے کا اندیشہ ہے اگر وہ اس سے حفاظت کی غرض سے سلی ہوئی لنگی استعمال کرتا ہے تو اس کے لیے اجازت ہے ورنہ عام حالات میں محرم کا سلی ہوئی لنگی پہننا مکروہ تنزیہی اور خلاف اولیٰ ہے؛ چناں چہ ''معلم الحجاج'' میں مسئلہ ہے: ''تہبند کے دونوں پلوں کو آگے سے سینا مکروہ ہے، اگر کسی نے ستر عورت کی حفاظت کی وجہ سے سی لیا تو دم واجب نہ ہوگا''۔ (معلم الحجاج ص ۱۱۴)

''عمدۃ الفقہ'' میں ہے: ⑦ چادر اور تہبند میں گرہ لگانا یعنی چادر یا تہبند کے ایک سرے کو دوسرے سرے کے ساتھ باندھنا یا کانٹے وسوئی اور پن وغیرہ سے اٹکانا یا چادر و تہبند کو رسی و کمر بند وغیرہ سے باندھ لینا۔ (عمدۃ الفقہ مکروہات احرام ۴/۱۴۹)

''غنیۃ الناسک'' میں ''فصل فی مکروھات الاحرام ومحظورات التی لا جزاء فیھا سوی الکراھۃ'' کے ماتحت لکھا ہے: ''وعقد الازار والرداء بان یربط طرف احد ھما بطرفہ الآخر (شرح) وان یخللہ بخلال او یشددہ بحبل ونحوہ''. (٤٧)

صاحبِ ''انوارِ مناسک'' نے معلم الحجاج ص ۱۰۵ کی عبارت ذیل ''چادر لنگی اگر بیچ میں سے سلی ہوئی ہے تو جائز ہے؛ مگر افضل یہ ہے کہ احرام کا کپڑا بالکل سلا ہوا نہ ہو'' سے جو استدلال کیا ہے وہ غلط فہمی پر مبنی ہے، مسئلۂ بالا کا مطلب تو یہ ہے کہ اگر کوئی لنگی کپڑے کے دو پاٹ کو جوڑ کر تیار کی ہو تو اس کو پہننے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ لنگی کے دو پلوں کو سیا گیا ہو تو وہ بھی بلا کراہت جائز ہے، اس مسئلہ کو صاحب ''معلم الحجاج'' نے ص ۱۱۴ پر مکروہات احرام کے عنوان کے ماتحت الگ سے

بیان کیا ہے، چناں چہ لکھا ہے:

مسئلہ: تہبند کے دونوں پلوں کو آگے سے سینا مکروہ ہے، اگر کسی نے ستر عورت کی حفاظت کے لیے سی لیا تو دم واجب نہ ہوگا۔ (۱۱۴)

اس لیے سلی ہوئی لنگی کے متعلق علی الاطلاق یہ کہنا کہ اس کا حالتِ احرام میں پہننا بلاکراہت جائز اور درست ہے، صحیح نہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

املاہ: احمد خانپوری، ۱۹ / جمادی الاولیٰ ۱۴۲۸ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ　　　الجواب صحیح: عبدالقیوم راجکوٹی

حجاج کرام کے لیے مرکنٹائل بینک کی اشیاء کا استعمال

سوال: بمبئی میں حجاج کرام کو حج میں جانے کی کاروائی کرنی ہوتی ہے اس مکمل کاروائی کا ایک جزء یہ بھی ہے کہ مروج بینک (مرکنٹائل بینک) کی جو مقررہ رقم سعودی میں جا کر خرچ کرنے کے لیے درکار ہوتی ہے اتنی رقم کا ڈرافٹ اس بینک کا لینا ہوتا ہے، عام رواج میں اسی بینک کا ڈرافٹ لیتے ہیں، ویسے کسی دوسری بینک کا بھی ڈرافٹ اگر حاجی لے لیتا ہے تو بھی کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی، اب یہ مرکنٹائل بینک حج کمیٹی کے دفتر کو اپنے برانچ کی طرف سے ایک ڈرم پانی کا، ایک چھوٹا سا کیٹ پاسپورٹ وغیرہ رکھنے کے لیے، ایک مصلی نماز پڑھنے کا، یہ اشیاء دیتی ہے کہ ہر حاجی کو بلا کسی استثناء کے بینک کی طرف سے یہ اشیاء دی جائیں تو حاجی نے چاہے کسی دوسرے بینک کا بھی ڈرافٹ لیا ہو، پھر بھی اس کو اور دوسرے حاجیوں کو جنھوں نے اس بینک کا ہی ڈرافٹ لیا ہے سب کو حج کمیٹی یہ اشیاء دیتی ہے، اور جس کو یہ اشیاء نہ لینی ہو اس کو اس کی قیمت

۵۶ (چھپن) روپیہ نقد دی جاتی ہے، تو اب سوال یہ ہے کہ ان اشیاء کا استعمال ہر حاجی صاحبان کریں یا عدم ضرورت کی صورت میں نقد روپیے لے کر خود کے استعمال میں لانا چاہیے؟ یہ استعمال مباح ہے یا نہیں؟ اگر مباح نہیں ہے تو اس کا کیا مصرف کیا جائے؟ یہ چیزیں سود میں شمار ہوں گی؟ اور اس کا لینا کیسا ہے؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

مرکنٹائل بینک بواسطۂ حج کمیٹی یہ اشیاء یا اس کی قیمت دیتی ہے وہ رقم کہاں سے لاتی ہے؟ اگر کسی مخصوص آدمی کی طرف سے حجاج کرام کو بطور ہدیہ یہ اشیاء دی جاتی ہیں تب تو اس کا استعمال مباح ہے، اور اگر بینک اپنی سودی آمدنی سے یہ دیتی ہے تو اس کا استعمال نہ کریں بلکہ قبول ہی نہ کریں، اس سلسلہ میں بینک کے ذمہ داروں سے رابطہ قائم فرما کر حقیقت حال معلوم کی جاسکتی ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

احرام کی حالت میں کیسا جوتا پہننا جائز ہے؟

سوال: حالت احرام میں کیسی چپل استعمال کی جائے؟ اس کے متعلق ایک مسئلہ کی تحقیق کے سلسلہ میں یہ عریضہ ارسال کر رہا ہوں امید کہ تفصیلی جواب مرحمت فرما کر مشکور فرمائیں گے۔

(۱) اگر جوتا نہ ہو تو موزہ کو وسط قدم پر سے کاٹ کر پہنے۔ (زبدہ) اس طرح کہ پیر کی پشت کھلی رہے مع اوپر کے دونوں ٹخنوں کے۔ (ناقل) ضروری انتباہ...... اکثر عوام وخواص میں یہ مشہور ہے، کہ فقط پیر کی بیچ کی ہڈی کھلی رکھنا ضروری ہے، یہ بالکل غلط

ہے؛ مگر وضو میں جو دو کعبین دھونے واجب ہیں ان کے اوپر سے لے کر پیر کی بیچ کی ہڈی سے بھی کچھ نیچے تک کاٹنا چاہیے، کہ اچھی طرح پیر کی ہڈی سے نیچے سے اوپر دونوں ٹخنوں تک مع اطراف پیر اور ایڑی کے موزہ وغیرہ سے خالی رہے، اور مثل جوتی کے رہ جائے۔ (ناقل)

"الذی فی الحدیث ویقطعهما حتی یکونا اسفل من الکعب وهو افصح مما هذا ابن کمال؛ والمراد قطعهما بحیث یصیر الکعبان ومافوقها من الساق مکشوفا لا یقطع موضع الکعبین فقط کما لا یخفی".

(ردالمحتار ص:۲۲٤)

"ایضاً لو کان الکوش الهندی یستر العقب ومافوقه مما یحاذی الکعب ینبغی ان لا یجوز لبسه لانه لم یکن اسفل من الکعبین فی کل جانب وهو الظاهر من النص ولعله محل النص علی قطع الخفین حتی یکونا کالنعلین من جانب الموخر". (زبدة المناسك ص:۱۰٤)

② "وعن هذا فسر الشارح رحمه الله تعالیٰ المکعب بالکوش الهندی؛ ولم یلتفت الی انه یستر العقب؛ فما فی ردالمحتار: والظاهر انه لا یجوز ستر العقب اه ویتفرع علی عدم جواز لبس الکوش الهندی ونحوه مما یستر العقب؛ لیس بظاهر؛ نعم لو کان الکوش الهندی یستر العقب ومافوقه مما یحاذی الکعب ینبغی ان لا یجوز لبسه؛ لانه لم یکن اسفل من الکعبین فی کل جانب؛ وهو الظاهر من النص". (غنیة الناسك ص:۸۷ باب الاحرام)

③...... احرام کی حالت میں پاؤں میں ہر اس جوتے کا پہننا جائز ہے، جس سے وسط قدم کی ابھری ہوئی ہڈی کھلی رہے، خواہ وہ چپل ہو یا سلیپر، یا ہندوستانی

یا پاکستانی دیسی جوتا اور نیو کٹ وغیرہ۔

(بحر الرائق ۲/ ۳۲۴، عمدۃ الفقہ ۴/ ۱۴۰، عمدۃ المناسک ص: ۲۱۴)

④......حاصل یہ کہ احرام کی حالت میں دونوں ٹخنے اور پیروں کے اوپر جہاں بال اگتے ہیں جو ابھرا ہوا حصہ ہے، اس کا کھلا رہنا ضروری ہے، پس احرام کی حالت میں مردوں کو بہتر تو ہوائی چپل پہننا ہے، اور اگر جوتا یا چپل ایسا ہو جو ٹخنوں اور مذکورہ پیروں کے بالائی حصہ کو نہ چھپاتا ہو، تو اس کا پہننا بھی درست ہے؛ البتہ اگر ایڑی، پنجہ انگلیاں چھپی رہیں، تو کوئی حرج نہیں۔ (مسائل حج وعمرہ ص: ۲۱۲)

ان عبارات میں سے بعض سے سمجھ میں آتا ہے کہ احرام کی حالت میں جوتے ایسے ہونے چاہیے جس میں ایڑی وغیرہ چھپی ہوئی ہوں، اور دوسرے حوالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ایڑی وغیرہ کا چھپا رہنا ضروری نہیں۔ اب آپ سے درخواست ہے کہ اس مسئلہ کی تفصیلی وضاحت فرمائیں کہ احرام کی حالت میں جوتا کس طرح کا ہونا چاہیے؟ کیا صرف قدم کے اوپر کا حصہ کھلا رکھنا کافی ہے یا ایڑی اور ٹخنہ کے نیچے تک کا سارا حصہ کھلا رکھنا ضروری ہے؟

بعض سنڈل اس قسم کی بنی ہوئی ہے کہ اوپر کی پشت تو کھلی ہوئی ہے؛ مگر پشت سے اوپر ایک پٹی ہے جو سنڈل کو پکڑ کر رکھتی ہے اور اس میں ایڑی بھی چھپی رہتی ہے، اس کا استعمال احرام کی حالت میں جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں پاؤں کی حفاظت کے لیے دو چیزیں استعمال کی جاتی تھیں: ایک کو خُف سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور دوسری کو نَعل سے۔ خف چمڑے یا

اسی طرح کی چیز سے اس طرح بنا ہوا ہوتا تھا کہ وہ پاؤں کو دونوں ٹخنوں اور اوپر کے کچھ حصہ سمیت چھپالیتا تھا، اور خف کو وہ حضرات پاؤں میں تنہا بھی پہن کر چلتے پھرتے تھے۔ دوسری کو نعل سے تعبیر کیا جاتا تھا، ان کے یہاں نعل کا اطلاق چپل پر ہوتا تھا، اور جس کو ہمارے یہاں جوتی سے تعبیر کیا جاتا ہے، اس کو اہل عرب مداس سے تعبیر کرتے ہیں، اور عربی زبان کا لفظ حذاء اسی معنی میں استعمال ہوتا ہے؛ لیکن وہ عرب میں رائج نہیں تھا، متاخرین اسی کو مکعب کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

حضرت مولانا محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ ''ترمذی'' کی شرح ''معارف السنن'' میں تحریر فرماتے ہیں:

''الخف فی الشرع اسم للمتخذمن الجلد أو نحوه الساتر لكعبين فصاعداً متصلاً بالقدم من غير أن يشف، هذامايستفادمن مواضع من البحر الرائق وغيره وكان الخف كالنعل يمشون فيه والنعل عندهم ما يسميه أهل الهند''چپل'' ومايسمونه ''جوتی'' فهوالمداس (بالفتح) كما ذكره صاحب القاموس وفيه هواسم لمايلبس فى الرجل اهـ قال الراقم وفى هذا المعنى حذاء عند هم قديما وحديثا ولم يكن رائجا فى العرب وقديسمى عندهم فى متأخريهم بالمكعب''. (معارف السنن ۱/ ۳۳۳، ۳۳٤)

حالت احرام میں محرم کے لباس کے سلسلہ میں پوچھے گئے ایک سوال کے جواب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: الا ان يكون احدليست له نعلان فليلبس الخفين وليقطعهما مااسفل من الكعبين یعنی حالت احرام میں محرم کو چاہیے کہ خفین کا استعمال نہ کرے، البتہ اگر کسی محرم کے پاس نعلین (چپل) نہ ہوں تو خفین کو

کعبین سے نیچے کاٹ کر استعمال کرسکتا ہے۔عربی زبانی میں لفظ کعب دو معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

①وہ ابھری ہوئی ہڈی جو پنڈلی اور پاؤں کے جوڑ پر ہے(جس کو اردو میں ٹخنہ کہتے ہیں)۔

②اور وہ ابھری ہوئی ہڈی جو چپل کے تسمہ کے پاس پاؤں کی پشت پر ہے، اس ارشاد میں نبوی میں امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے لفظ کعب کو اسی دوسرے معنی میں بر بنائے احتیاط لیا ہے۔

حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

ونسب الی محمد بن الحسن انه فسر الكعب بالعظم الذى فى وسط القدم المسمى عندالاطباء بـ:"العظم الزورقى" وبعضهم جره الى غسل الرجلين أيضاًوهوخطأ،وانما الكعب عنده بذلك المعنى فى قطع الخفين للمحرم لاغير،وخلاصة مادارالبحث:ان لفظ الكعب عند محمد والاصمعى فى اللغة يستعمل بالمعنيين:بمعنى العظم الناتى عند مفصل الساق والقدم، وبمعنى العظم عند معقد الشراك فأخذه محمد بهذا المعنى فى المحرم لكونه احوط ومحمدحجة فى اللغة فلاعبرة بقول من لم يعرفه وراجع العمدة (٤/ ٥٢١)والفتح(٣/٣٢٠) للتفصيل (معارف السنن ٦/ ٣٣٢)

مطلب کہ کعب کا جو مشہور مفہوم ہے، یعنی پنڈلی اور پاؤں کے جوڑ پر دائیں بائیں جو ابھری ہوئی ہڈی ہے، اس کے ساتھ اس کا جو غیر معروف مفہوم اور معنی یعنی پاؤں کی پشت کا ابھرا ہوا حصہ، جس کا حاصل یہ ہوا کہ خفین یعنی چمڑے کے موزوں کو اس طرح کاٹ دیا جائے کہ یہ دونوں حصے کھلے رہیں؛ البتہ ان دونوں حصوں کے کھلے رہنے

کے ساتھ ساتھ پاؤں کا پچھلا حصہ جس کو عربی میں لفظ عقب، اور اردو میں لفظ ایڑی سے تعبیر کیا جاتا ہے، اس کا بھی کھلا رہنا ضروری ہے یا نہیں؟ تو کتب فقہ کی عبارتوں سے اتنی بات تو واضح ہوتی ہے کہ قدم کی پشت کا اوپر والا حصہ (جو لفظ کعب کے ایک مفہوم کا مصداق ہے) اور دونوں ٹخنے اور ان کے محاذات کا پورا حصہ اور ان کے اوپر کا حصہ کھلا رہنا ضروری ہے، البتہ ایڑی کے متعلق بعض عبارتوں سے مفہوم ہوتا ہے کہ اس کا کھلا رہنا ضروری نہیں، یعنی پاؤں کا پچھلا حصہ جو ٹخنوں سے نیچے ہے، اور ہندوستانی دیسی جوتا پہننے کی صورت میں وہ بھی کچھ چھپ جاتا ہے، تو اس کی گنجائش ہے، البتہ آپ نے جس سنڈل کے متعلق دریافت کیا ہے کہ اس میں پشت تو کھلی رہتی ہے؛ مگر پشت سے اوپر ایک پٹی ہوتی ہے، اس کے متعلق کوئی صراحت نظر سے نہیں گزری۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

أملاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، یکم جمادی الاولیٰ ۱۴۳۰ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ　　الجواب صحیح: عبد القیوم راجکوٹی

عورتوں کا حرمین میں نماز پڑھنا

سوال: عورتوں کو حرم شریف میں نماز پڑھنا افضل ہے یا اپنی رہائش گاہ میں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً

عورتوں کے لیے مسجد نبوی اور حرم شریف میں نماز پڑھنے سے اپنے مکان میں پڑھنا زیادہ ثواب ہے۔ (احسن الفتاوی ۴/ ۵۶۷ حج کے ضروری مسائل) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد خانپوری عفی عنہ

عورتیں اقتداء کی نیت نہیں کرتیں

سوال: حرم شریف میں جو عورتیں امام کے پیچھے نماز ادا کرتی ہیں، اکثر وہ امام کی اقتداء کی نیت نہیں کرتیں تو کیا ان کی نماز ہو جائے گی یا یہ نمازیں دہرانی پڑیں گی؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً

امام کے پیچھے ادا کی جانے والی نماز کے صحیح ہونے کے لیے اقتداء کی نیت بھی شرط ہے؛ اس لیے اگر کسی نے اقتداء کی نیت نہیں کی تو اس کی وہ نماز درست نہیں ہوئی، چاہے وہ مرد ہو یا عورت۔

املاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۱/محرم الحرام ۱۴۲۵ھ
الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ

ایام حج میں نماز میں قصر یا اتمام؟

سوال: حج کے ایام میں امامت کرے تو کیا حکم ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً

اگر وہ خود امامت کرائے تو خود تنہا پڑھنے کی صورت میں جو حکم ہے وہی حکم امامت کرانے کی صورت میں بھی ہوگا یعنی جن صورتوں میں قصر واجب ہے ان صورتوں میں قصر، اور جن صورتوں میں اتمام ضروری ہے ان صورتوں میں اتمام کرائے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد خانپوری عفی عنہ

عرفات میں ظہر وعصر میں جمع

سوال: اس میں ائمہ کے اختلاف سے کیا فرق ہوتا ہے؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

حنفی شخص تنہا نماز پڑھتا ہے یا امام بن کر پڑھاتا ہے تو اختلاف ائمہ سے کوئی فرق نہیں پڑے گا؛ البتہ وہ شخص کسی ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھے جو حنفی نہیں ہے، تو وہ کہاں اور کونسے مسلک رکھنے والے امام کے پیچھے نماز پڑھ رہا ہے؟ یہ معلوم ہونے پر اس کا حکم بتلایا جاسکتا ہے؛ البتہ ایک صورت جو عموماً زیر بحث آتی ہے اس کا تفصیلی حکم عرض کرتا ہوں: عرفات میں ظہر اور عصر کے درمیان جو جمع ہوتا ہے اگر حاجی مسجد نمرہ میں امام کے پیچھے ظہر وعصر پڑھنے نہیں گیا؛ بلکہ اپنی قیام گاہ ہی پر رہا تو اس کو چاہیے کہ ظہر اپنے وقت میں اور عصر کو اس کا وقت داخل ہونے کے بعد اس کے وقت میں پڑھے، اگر وہاں کئی حضرات ہیں تو دونوں نمازیں اپنے اپنے وقت پر باجماعت ادا کریں، اور اگر حاجی مسجد نمرہ میں گیا ہے کہ امام کے پیچھے دونوں نمازیں ادا کرنا چاہتا ہے تو امام اگر مسافر ہے (یعنی مسافت قصر سے آیا ہے) اور وہ دونوں نمازیں قصر پڑھا رہا ہے تو حاجی بھی اگر مسافر ہے تو امام کے پیچھے قصر ہی پڑھے، اور حاجی اگر مقیم ہے تو امام کے سلام پھیرنے کے بعد اپنی نماز پوری کرلے، اور اگر امام مسافر نہیں، اس کے باوجود قصر کررہا ہے، (جیسا کہ مالکیہ کے یہاں ہوتا ہے) تو اس کے پیچھے نہ تو مقیم حاجی کی نماز درست ہوگی، اور نہ مسافر کی؛ بلکہ اگر پڑھ لی تو لوٹائی جائے، نہ لوٹانے سے

فرض سر پر لازم رہے گا۔ (زبدۃ المناسک) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد خانپوری عفی عنہ

حجر اسود کے بوسہ میں چاندی کے دائرہ سے بچے

سوال: آدمی کے لیے چاندی کے استعمال کی مقدار بہت کم ہے، اب حجر اسود کو جب بوسہ دینے کے لیے جاتے ہیں، تو اس کا دائرہ چاندی کا ہے تو لوگ اس دائرہ کو اپنے ہاتھوں سے پکڑ کر پتھر کا بوسہ دیتے ہیں، اور وہ چاندی کا دائرہ جائز مقدار سے زائد ہے تو آدمی کا اس دائرہ کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر بوسہ دینا چاندی کے استعمال میں شمار ہوگا یا نہیں؟ اس طرح بوسہ دینا کیسا ہے؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

حجر اسود کو استلام کرتے وقت ہاتھ لگانے اور بوسہ دینے میں یہ خیال رہے کہ جو گول حلقہ چاندی کا حجر اسود پر چڑھا ہوا ہے اس کو ہاتھ نہ لگے، اور نہ بوسہ دے؛ کیوں کہ اس سے چاندی کا استعمال لازم آئے گا جو ممنوع ہے۔ (زبدۃ المناسک ۱/ ۹۷) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۷/ رمضان المبارک ۱۴۱۱ھ
الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

سابق دم کی ادائیگی

سوال: میں نے ۹۵ء میں حج کیا تھا، اس وقت میں نے خطا سے قربانی سے

پہلے سر منڈوالیا تھا، اب مجھے احساس ہوا تو مجھے اس کا دم دینا ہوگا؟ اگر دینا ہے تو کیا ہوگا؟ دمِ کفارہ وغیرہ جو بھی ہو جواب دے کر احسان فرمائیں۔

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

ایک دنبہ یا بکری بطورِ دم ذبح کروانا ضروری ہے، آپ وہ رقم کسی آدمی کو دیجئے کہ وہ اس سے دنبہ یا بکرا بطورِ دم خرید کر آپ کی طرف سے حدودِ حرم میں ذبح کرے، مکہ مکرمہ میں مدرسہ صولتیہ کے ذمہ داران بھی یہ کام کر دیتے ہیں، یہ یاد رہے کہ یہ ذبح حدودِ حرم میں ہی ہونا چاہیے، یہاں ہندوستان میں نہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد خانپوری عفی عنہ

حج ہیلپ کمیٹی کے اخراجات، اور نقلی کعبہ بنانا

سوال: ہم لوگوں نے اس سال حاجیوں کی خدمت کے جذبہ سے میر پور شہر میں "حج ہیلپ کمیٹی" کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا ہے، یہ ادارہ حاجیوں کے فارم بھروانا، بلڈ گروپ کروانا، وقت بوقت حج کمیٹی بمبئی کے اعلانات حاجیوں تک پہنچانا اور دیگر جو بھی خدمت ہو سکتی ہو حاجیوں کی کرنا تربیتی کیمپ لگانا وغیرہ کام کرتے ہیں، اس سلسلہ میں سوال یہ ہے کہ:

(۱) حج ہیلپ کمیٹی نے حاجیوں کی خدمت کے جذبہ سے جو بھی کام کئے ہیں: اس میں بلڈ گروپ کروانا، تمام کاغذات کی فوٹو کاپی کروانا، بھوپال و بمبئی حاجیوں کے کام سے جانا، حاجیوں کو انجکشن لگوانا وغیرہ دیگر چھوٹے چھوٹے اخراجات حج ہیلپ کمیٹی نے کئے ہیں، کچھ حضرات کا یہ کہنا ہے کہ حج ہیلپ کمیٹی نے جو خرچ حاجیوں پر

کیا ہے وہ غلط ہے؟

(۲) حاجیوں کی فہمائش کے لیے کمیٹی نے خانۂ کعبہ کا ایک چھوٹا سا ماڈل بنا کر اس میں مقام ابراہیم، زمزم کا کنواں، حجرِ اسود وغیرہ کی نشان دہی کر کے تربیتی کیمپ میں دکھا کر فہمائش کی گئی کہ طواف کہاں سے شروع ہوگا؟ کہاں پورا ہوگا؟ طواف کے دوران کیا دعائیں پڑھی جائیں گی وغیرہ فہمائش کی گئی اور اس سے عازمینِ حج کو کافی سہولت ہوئی، اس کام کی سبھی لوگوں نے کافی تعریف کی؛ لیکن کچھ حضرات کا کہنا ہے کہ خانۂ کعبہ کا ماڈل بنانا غلط ہے، جبکہ یہ ماڈل وقتی طور پر حاجیوں کی فہمائش کے لیے بنایا گیا تھا۔

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

(۱) حج ہیلپ کمیٹی حاجیوں کی خدمت اور ادائیگیٔ حج؛ نیز سفرِ حج میں سہولت وراحت پہنچانے کی غرض سے جو کام کر رہی ہے جس کی تفصیل سوال میں منسلکہ پوسٹر میں ہے، وہ بڑے اجر وثواب کے کام ہیں اور اس سلسلہ میں خرچ کی جانے والی رقم صحیح مصرف میں استعمال ہوئی ہے، ان مصارف کو بے کار اور غلط کہنا نصوصِ قرآن وحدیث سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔

(۲) حاجیوں کو طواف اور مناسکِ حج بخوبی سمجھانے کے لیے کعبۃ اللہ کا ماڈل بنانے کی بھی اجازت ہے؛ البتہ اس کو مکمل طور پر کعبۃ اللہ کے مشابہ بنانے کے بجائے ضرورت کے مطابق سادہ رکھا جائے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۳/ صفر ۱۴۱۹ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ

کیا عرفہ کا روزہ حاجی کے لیے بھی مستحب ہے؟

سوال: دوران حج میدان عرفات میں روزہ رکھنا کیسا ہے؟ زید سے جب اس بارے میں دریافت کیا گیا تو زید نے کہا روزہ ہر حال میں مستحب ہے چاہے وہ دوران حج عرفات کا میدان ہی کیوں نہ ہو؛ لیکن بکر کا کہنا ہے کہ صرف یہاں یعنی جو شخص حج کے سفر پر نہ ہو اس کے لیے ہی عرفہ کا روزہ مستحب ہے نہ کہ حج کے دوران، قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب دیں؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

جو حاجی میدان عرفات میں روزہ رکھ سکتا ہے اور روزہ کی وجہ سے افعال ومناسک کی ادائیگی میں کمزوری کا اندیشہ نہیں ہے، اس کے لیے مستحب ہے؛ ورنہ نہیں۔

درمختار میں ہے: والمندوب كأيام البيض من كل شهر ويوم الجمعة ولو منفردا، وعرفة ولو لحاج لم يضعفه. (درمختار علی ھامش الشامی ۲/ ۹۱)

قوله لم يضعفه: صفة لحاج اى إن كان لا يضعفه عن الوقوف بعرفات ولا يخل بالدعوات محيط فلو اضعفه كره (شامی۲/ ۹۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

املاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۳/ ذی الحجہ ۱۴۲۸ھ

آخری چکر کے بعد مروہ پر دعا کا ثبوت

سوال: صفا مروہ کی سعی کے آداب میں یہ بھی ہے کہ ہر چکر کے بعد دعا کی جائے، آخری چکر کے بعد مروہ پر دعا کا ثبوت ہے؟ یا صرف چھ چکر میں، اور آخری چکر کے

بعد دعا نہیں، بعض حضرات کا کہنا ہے کہ آخری چکر کے بعد دعا نہیں، سرسری تتبع سے اس کی وضاحت نہ مل سکی، اگرچہ مطلق دعا سے آخری چکر کے بعد بھی دعا کرنا معلوم ہوتا ہے۔

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

صفا کی طرح مروہ پر دعا کرنا ہر چکر میں اور آخری چکر کے بعد حضور ﷺ سے ثابت ہے، امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت بیان فرمائی ہے، اس میں ہے:

ثم مشى حتى اتى المروة فصعد فيها ثم بدا له البيت قال لا اله الا الله وحده لاشريك له له الملك و له الحمد و هو على كل شيئ قديرقال ذلك ثلاث مراة ثم ذكر الله و سبحه و حمده ثم دعا عليها بما شاء الله فعل هذا حتى فرغ من الطواف(سنن النسائی ۲ /۴۱)

مسلم شریف میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی طویل حدیث جس میں آں حضور ﷺ کے حج کا تفصیلی بیان ہے اس میں ہے:

ثم نزل الى المروة حتى انصبت قدماه فى بطن الوادى سعى حتى اذا صعدتا مشى حتى اتى المروة ففعل على المروة كما فعل على الصفا حتى اذا كان آخر طواف على المروة (مسلم شریف ۱/ ۳۹۶)

حدیثِ بالا کی تشریح میں امام نووی رحمۃ اللہ علیہ رقمطراز ہیں:

(قوله ففعل على المروة كما فعل على الصفا)فيه انه يسن عليها من الذكر و الدعاء و الرقئ مثل ما يسن على الصفا و هذا متفق عليه (ایضاً)

مسلم شریف والی روایت ابوداؤد میں ۱ / ۲۶۲ تا ۲۶۴ پر موجود ہے۔

مؤطا مالک میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت کے اخیر میں ہے:

ويدعوا ويصنع على المروة مثل ذلك. (موطأ مالك:۱۴۵)

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا نور اللہ مرقدہ اس کی شرح میں تحریر فرماتے ہیں:

(و يصنع على المروة مثل ذلك)استدل به العز بن عبدالسلام على ان المروة افضل من الصفالانها تقصد للذكر والدعاء اربع مرات بخلافِ الصفا فانها تقصد ثلاثاً الخ (اوجز المسالك٧ /١٥٤)

امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ "باب رفع اليدين عند رؤية البيت" کے ذیل میں فرماتے ہیں: وقد رأينا الرفع بعرفة والمزدلفة وعند الجمرتين وعلى الصفا والمروة من طريق الدعاء فى الموطن الذى جعل ذلك الوقوف فيه لعلة الاحرام (طحاوی شریف ١ /٣٩١) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد خانپوری عفی عنہ

دورانِ طواف بیت اللہ شریف کو دیکھنے کی کراہیت پر شبہ

سوال: معلم الحجاج میں ہے: "طواف کرتے وقت بیت اللہ کو دیکھنا مکروہِ تحریمی ہے"۔ (ص ٣٤٩، طواف کی غلطیاں)

کیا اس مسئلہ میں فقہاء رحمۃ اللہ علیہ کی عبارات مل سکتی ہیں یا کوئی حدیث یا اثر؟ شبہ اس لیے ہوا کہ بیت اللہ کو دیکھنے کی فضیلت منصوص ہے اور طواف کی حالت میں دیکھنے کو مکروہِ تحریمی کہنا کسی مضبوط دلیل کا متقاضی ہے، باوجود تلاش کے کوئی ایسی دلیل نہ ملی جس سے اس جزئیہ کی تائید ہوتی ہو۔

الجواب: حامداً ومصلياً ومسلماً

بیت اللہ شریف کا طواف کرنے کے دوران بیت اللہ کو دیکھنا مکروہ ہے، اس پر

آپ کو بیت اللہ کو دیکھنے کی فضیلت سے کیوں اشکال ہوا؟ قرآن شریف پڑھنا بلکہ دیکھنا بھی عبادت ہے تو کیا دورانِ صلاۃ جدارِ قبلہ پر لکھی ہوئی آیتِ کریمہ کو پڑھنا مفسدِ صلاۃ یا مکروہ نہیں؟

واذاقرا الامام من المصحف فسدت صلاته عندابی حنیفة، وقال هی تامة لانه عبادة انضافت الی عبادة الا انه یکره. (هدایه۱/ ۱۳۷)

اصل بات یہ ہے کہ حدیث شریف میں بیت اللہ شریف کے طواف کو نماز کے مانند کہا گیا ہے۔عن ابن عباس ان النبی ﷺ قال الطواف حول البیت مثل الصلاۃالحدیث(مشکوۃ۲۲۷) جس طرح نماز میں اِدھر اُدھر دیکھنا یا کوئی ایسا عمل کرنا جو خشوع کے منافی ہو منع ہے، یہی حکم طواف کا ہے۔

حضرت مولانا مفتی شبیر احمد صاحب مفتی مدرسہ شاہی مراد آباد تحریر فرماتے ہیں: کعبۃ اللہ کی طرف منہ کرنے کو بھی فقہاء نے مکروہِ تحریمی اور خلافِ ادب لکھا ہے کہ جس طرح نماز کے اندر اِدھر اُدھر دیکھنا مکروہ ہے اسی طرح طواف کے اندر اِدھر اُدھر دیکھنا مکروہ اور خلافِ ادب ہے اور آداب میں سے یہ ہے کہ بوقتِ طواف اپنے سامنے کی طرف دیکھتا رہے۔(معلم الحجاج ص/ ۱۳۰، غنیۃ الناسک ص/ ۱۶۵، ایضاح المناسک ص/ ۱۱۸۔ بحوالہ ماہنامہ ''ندائے شاہی'' حج و زیارت نمبر شوال، ذی القعدہ ۱۴۲۱ھ)

کوئی شخص کعبہ کے سامنے نماز پڑھ رہا ہو وہ درمیانِ نماز موضعِ سجود کو دیکھتا رہے یا کعبہ کو؟ حضراتِ شوافع میں یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے، علامہ بدرالدین زرکشی رحمۃ اللہ علیہ جو شوافع کے بڑے فقیہ ہیں پوری بحث ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: و المذهب انه ینظر إلی موضع سجوده لانه لا یأمن ما یشغله(اعلام الساجد۱۰۴)

لہٰذا یہ اشکال نہ کیا جائے کہ درمیانِ طواف کعبہ کی طرف منہ کرنے سے طواف کے خشوع وخضوع میں خلل نہ آئے تو مکروہ نہ ہونا چاہیے۔

طواف نہایت ہی دلجمعی، سکون ووقار کے ساتھ کرنا چاہیے، اللہ تعالیٰ کے جلال اور بیت اللہ شریف کی عظمت کا تصور ہو گویا اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہا ہے، اپنے گناہوں پر نادم ہو جیسے کوئی قصوروار غلام اپنے آقا کے سامنے کھڑا ہے، حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم اسی شان سے طواف کرتے تھے۔

صاحبِ ارشاد الساری تحریر فرماتے ہیں: وینبغی ان یطوف کابن عمر حیث قال: کنا نتراءی اللہ فلایدری احدنا یمینه من یساره و لا یلتفت الی سواء و یکون فی مقام الاحسان موصافاً بما فسر ہ علیه الصلاة و السلام حیث قال: ان تعبد اللہ کانك تراہ.

(ارشاد الساری الی مناسك الملا علی قاری ص۱۱۰)

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: (وترك الکلام و کل عمل ینافی الخشوع) ای التذلل و کذا الالتفات بوجهه الی الناس لغیر ضرورة ووضع الید علی الخاصرة او علی القفا و نحوها (وصون النظر) ای حفظه عن کل ما یشغله) ای مما هو فی صدده من الحضور.

(المسلك المتقسط مع ارشاد الساری ص/۱۱۰،۱۰۹)

الحاصل! بیت اللہ شریف کو دیکھنا بلاشبہ عبادت ہے؛ لیکن بعض احوال (میں جیسے حالتِ نماز، حالتِ طواف وغیرہ) میں نہیں دیکھنا چاہیے۔

بیت اللہ شریف کا اندرونی حصہ یعنی چھت والا حصہ بیت اللہ ہی کا ایک جزء ہے اس کے باوجود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا چھت کی جانب نظر اٹھا کر دیکھنے والے شخص پر تعجب فرماتی،

اور حضور ﷺ کا معمول بیان فرماتی ہیں کہ دخولِ بیت اللہ کے موقع پر آں حضور ﷺ کی نگاہ مبارک سجدہ کی جگہ نیچے جھکی رہتی تا آنکہ بیت اللہ سے باہر نکل جاتے۔

وقد اخرج الحاكم فی مستدركه و البيهقی فی سننه عن ظهير بن محمد المكی عن موسى بن عقبة عن سالم بن عبد الله ان عائشة كانت تقول عجباً للمرأ المسلم اذا دخل الكعبة كيف يدع بصره قبل السقف اجلالاً لله تعالى و اعظاماً ! دخل رسول الله ﷺ الكعبة ما خلف بصره موضع سجوده حتى خرج منهاو قال حاكم صحيح على شرط الشيخين و لم يخرجاه (اعلام الساجد باحكام المساجد ١٠٤، ١٠٥)

تنبیہ: آپ نے سوال میں ''معلم الحجاج'' کے حوالہ سے تحریر فرمایا ہے: ''طواف کرتے وقت بیت اللہ کو دیکھنا مکروہِ تحریمی ہے'' حالاں کہ ہمارے سامنے ''معلم الحجاج'' کا جو نسخہ ہے اس میں ہے ''طواف کرتے وقت بیت اللہ کی طرف منہ کرنا مکروہِ تحریمی ہے'' ص ۳۴۹، مطبوعہ سہارنپور، صفحہ نمبر یکساں ہونے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسئلہ آپ نے اپنے الفاظ میں تحریر فرمایا ہے۔ واضح ہو' دیکھنے' اور' منہ کرنے میں' بڑا فرق ہے۔ دیکھنے کے لیے منہ پھیرنا ضروری نہیں؛ بلکہ بغیر منہ پھرائے گوشۂ چشم سے بھی دیکھنے کا عمل ہوسکتا ہے۔

كما صرح فی عبارة البناية و لا يلتفت ای يميناًاو يساراً و لو نظر بمؤخر عينه يمنة و يسرة من غير ان يلوی عنقه لا يكره (بناية ٢ /٥٢٤)

لہٰذا نقلِ عبارت میں احتیاط درکار ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: عبدالقیوم راجکوٹی

الجواب صحیح: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

متمتع کا عمرہ کر کے حج سے پہلے مدینہ جانا

سوال: ایک شخص نے حج تمتع کی نیت سے احرام باندھا عمرہ سے فراغت کے بعد حج سے پہلے وہ مدینۂ منورہ چلا گیا وہاں سے اس نے حج افراد کا احرام باندھا تو اب اس کا تمتع باطل ہوگا یا نہیں اگر تمتع باطل ہوتا ہے تو اس صورت میں اس پر قربانی دم شکر کی واجب ہوگی یا نہیں؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

زبدۃ المناسک ۲/۱۴۲ پر ہے اکثر حاجی اشہر حج میں آکر عمرہ کرتے ہیں پھر اشہر حج میں حج کرنے سے پہلے مدینۂ منورہ روضۂ اقدس اور حجرۂ مطہرہ ومعطرہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت کے لیے چلے جاتے ہیں پس ان کو چاہیے کہ وہاں سے جب واپس ہوں تو فقط حج مفرد ہی کا احرام باندھ کر آئیں تو امام صاحب کے نزدیک ان کا تمتع صحیح ہے اس سفر کرنے سے تمتع باطل نہ ہوگا کیوں کہ وہ لوگ اشہر حج میں عمرہ کر چکے ہیں اور عمرہ کرنے کے بعد وہ حکماً مکیوں میں داخل ہیں اگرچہ اشہر حج میں میقات سے بھی باہر نکل گئے ہوں کیوں کہ وہ اپنے اصلی وطن میں نہیں گئے ہیں تو ان کا سفر بہ اعتبار حکم کے واحد ہے اس کو المام فاسد کہتے ہیں جو کہ مبطل تمتع نہیں اب ان کو مدینۂ طیبہ سے قران کا احرام باندھنا ممنوع ہے کہ وہ مکیوں کے حکم میں ہیں اگر قران کا احرام باندھیں گے تو دم جنایت لازم ہوگا۔ (شرح اللباب وغنیۃ) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

املاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۷/شوال ۱۴۲۲ھ

الجواب صحیح: عباس داود بسم اللہ

پیسہ جمع کر کے قرعہ اندازی سے حج کرنا

سوال : دس آدمی دس دس ہزار آدمی جمع کریں ایک لاکھ ہوجاتے ہیں، اب قرعہ سے جس شخص کا نام نکلے اس کو حج کے لیے روانہ کریں، ہر سال ایسا کریں تو دس میں سب کا حج ہو جائے گا۔ ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اس کام کو عام کیا جائے تو کیسا ہے؟ اس ترتیب سے کافی لوگ حج کر سکتے ہیں، تو ایسا کرنا مناسب ہے؟

الجواب : حامداً ومصلیاً ومسلماً

آپس میں تعاون اور تناصر کے جذبہ سے اس طرح کرنے میں شرعاً کوئی قباحت نہیں جب کہ باری باری سب کو اس کی رقم واپس مل جاتی ہو اور اس طرح جمع کی ہوئی رقم سے حج کی ادائیگی بھی درست ہے؛ لیکن یاد رہے کہ شروع میں قرعہ اندازی میں جن کا نام نکلا اور وہ رقم وصول کر چکے ان کی طرف سے بعد میں قسطوں کی ادائیگی میں غفلت اور بے پرواہی نہ ہو، عموماً ایسا ہوتا ہے اس لیے اس سے منع بھی کرتے ہیں، اور اسی لیے اس کو عام کرنے کے لیے لوگوں کو ہرگز ترغیب نہ دی جائے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد خانپوری، ۱/ محرم الحرام ۱۴۲۴ھ

تجارت کی نیت سے حج کرنے کا حکم

سوال : ہمارے شہر...... سے ایک کمپنی کا مالک جو کہ غیر مسلم ہے، اور وہ چالیس مسلمانوں کو اپنی نئی (بائیک) موٹر سائیکل (گاڑی)، اور اس کے اپنے سفرِ حج سے حج کے لیے بھیج رہا ہے۔ تو اس وقت بہت سے مسلمان جو بے چارے اپنے خرچ سے

جانے کی استطاعت نہیں رکھتے، وہ اس موقع پر جانے کے لیے تیار ہیں، اور اس کمپنی کے مالک کو ان حجاج کرام کے بھیجنے کا مقصد یہ ہے کہ اس کی گاڑی باہر کی ممالک میں شہرت ہو، جس سے کہ اس کی گاڑیوں کی کھپت بڑھے، اور وہ کمپنی کا مالک ان کے پورے سفر حج کا ان حجاج کا قافلہ جہاں جہاں ٹھہرے وہاں کا خرچ، مطلب کے کل خرچ کا ذمہ اپنے اوپر لیتا ہے؛ لہٰذا قابلِ دریافت امر یہ ہے کہ یہ مسلمان جو جانا چاہتے ہیں اس طریقہ کا حج کر سکتے ہیں یا نہیں؟ اور اگر کر سکتے ہیں تو اس کی کیا صورت ہونی چاہیے؟ اور نہیں کر سکتے تو کیوں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً

آیت قرآنی ﴿لیس علیکم جناح ان تبتغوا فضلاً من ربکم﴾ کی تفسیر میں مولانا مفتی محمد شفیع صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ: واقعہ اس نزولِ آیت کا یہ ہے کہ: زمانۂ جاہلیت میں اہلِ عرب نے جس طرح تمام عبادات و معاملات کو مسخ کر کے طرح طرح کی بیہودہ رسمیں ان میں شامل کر دی تھیں، اور عادات کو بھی کھیل تماشہ بنا دیا تھا، اسی طرح افعالِ حج میں بھی طرح طرح کی بیہودگیاں کرتے تھے، منیٰ کے عظیم اجتماع میں ان کے خاص خاص بازار لگتے تھے، نمائش ہوتی تھی، تجارتوں کو فروغ کے ذرائع لگائے جاتے تھے، اسلام آیا اور حج مسلمانوں پر فرض کیا گیا، تو ان تمام بیہودہ رسموں کا قلع قمع کیا گیا۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین جو اللہ تعالیٰ کی رضا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات پر مٹ جانے والے تھے، اب ان کو یہ خیال ہوا کہ ایام حج میں تجارت کرنا یا مزدوری کر کے کچھ کما لینا یہ بھی جاہلیت کی پیداوار ہے۔ شاید اسلام میں اس کی مطلقاً حرمت و ممانعت ہو جائے، یہاں تک کہ ایک صاحب عبداللہ

بن عمر رضی اللہ عنہم کے پاس آئے اور یہ سوال کیا کہ: ہمارا پیشہ پہلے سے یہ ہے کہ ہم اونٹ کرایہ پر چلاتے ہیں، کچھ لوگ ہمارے اونٹ حج کے لیے کرایہ پر لے جاتے ہیں، ہم ان کے ساتھ جاتے ہیں اور حج کرتے ہیں، کیا ہمارا حج نہیں ہوگا؟ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ: ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تھا، اور آپ سے وہی سوال کیا تھا جو تم مجھ سے کر رہے ہو، آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو اس وقت کوئی جواب نہ دیا، یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی ﴿لیس علیکم جناح ان تبتغوا فضلاً من ربکم﴾ اس وقت آپ نے اس شخص کو بلوایا اور فرمایا کہ: ہاں! تمہارا حج صحیح ہے۔

الغرض! اس آیت نے یہ واضح کر دیا کہ اگر کوئی شخص دورانِ حج میں کوئی بیع و شراء یا مزدوری کرے جس سے کچھ نفع ہو جائے تو اس میں کوئی گناہ نہیں۔ ہاں! کفارِ عرب نے جو حج کی تجارت کی منڈی اور نمائش گاہ بنا لیا تھا اس کی اصلاح قرآن کے دو لفظوں سے کر دی گئی: ایک تو یہ کہ جو کچھ کمائیں اس کو اللہ تعالیٰ کے فضل اور عطا سمجھ کر حاصل کریں، شکر گزار ہوں، محض سرمایہ سمیٹنا مقصود نہ ہو ﴿فضلا من ربکم﴾ میں اسی طرف اشارہ ہے۔ دوسرے ﴿لا جناح﴾ کے لفظ نے یہ بتلا دیا کہ اس کمائی میں تم پر کوئی گناہ نہیں، جس میں ایک اشارہ اس طرف ہے کہ اگر اس سے بھی اجتناب کیا جائے تو بہتر ہے، کیوں کہ اخلاص کامل میں فرق آتا ہے اور حقیقت مسئلہ کی یہ ہے کہ اس کا معیار اصل نیت پر ہے۔ اگر کسی شخص کی نیت اصل میں دنیوی نفع تجارت یا مزدوری ہے اور ضمنی طور پر حج کا بھی قصد کر لیا یا نفعِ تجارت اور قصدِ حج دونوں مساوی صورت میں ہیں تب تو یہ اخلاص کے خلاف ہے، حج کا ثواب اس سے کم ہو جائے گا،

اور برکاتِ حج جیسی حاصل ہونی چاہیے وہ حاصل نہ ہوں گی، اور اگر اصل نیت حج کی ہے؛ اس لیے شوق میں نکلا ہے؛ لیکن مصارفِ حج میں یا گھر کی ضروریات میں تنگی ہے، اس کو پورا کرنے کے لیے کوئی معمولی تجارت یا مزدور کرلی، یہ اخلاص کے بالکل منافی نہیں۔ ہاں اس میں بھی بہتر یہ ہے کہ خاص ان پانچ ایام میں جن میں حج کے افعال ادا ہوتے ہیں ان میں کوئی مشغلہ تجارت و مزدوری کا نہ رکھے؛ بلکہ ان ایام کو خالص عبادت و ذکر میں گزارے۔ اسی وجہ سے بعض علما نے خاص ان ایام میں تجارت و مزدوری کو ممنوع بھی فرمایا ہے۔ (معارف القرآن ۱/۴۸۶، ۴۸۷)

صورت مسئولہ میں ان حجاج کو بھیجنے والے کی نیت اپنی مصنوعات کو فروغ دینے اور اس کے اشتہار کی ہے، مزید برآں وہ غیر مسلم بھی ہے، اگرچہ جانے والے حجاج کی نیت سعادتِ حج سے مشرف ہونے کی ہے؛ لیکن جب بھیجنے والے کی نیت اور ارادہ معلوم اور ظاہر ہے، تو جانے والے اس میں تعاون کررہے ہیں، اور اس طرح ایک خالص اسلامی فریضہ کو تجارت و مصنوعات کی فروغ کا ذریعہ بنایا جارہا ہے، یہ چیز غیرتِ ایمانی کے خلاف ہے، پھر بھی اگر وہ حضرات اس طرح حج کریں گے تو ان کا حج ادا ہوجائے گا۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

املاہ: العبد احمد خانپوری، ۴/رجب المرجب ۱۴۲۴ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ

قرض لے کر عمرہ کرنا

سوال: قرض لے کر عمرہ کے لیے جاسکتے ہیں؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

عمرہ فرض نہیں ہے، اس کے لیے قرض لے کر جانا مناسب نہیں، پھر بھی اگر قرض کی ادائیگی کا نظم کر کے جانا چاہے، تو گنجائش ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۷/ شعبان ۱۴۱۶ھ

شوہر کی ناراضگی کی حالت میں حج کی ادائیگی

سوال: ہندہ کئی سالوں سے اپنے شوہر سے ناراض ہو کر (کئی سالوں سے) اپنے ماں باپ کے پاس رہتی ہے، ہندہ کا دادا حج کے لیے جا رہے ہیں اور اس کو اپنے ساتھ حج کے لیے لے جانا چاہتا ہے، کیا ہندہ اپنے شوہر کی اجازت کے بغیر اپنے دادا کے ساتھ حج کو جا سکتی ہے، کیا اجازت ضروری ہے؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

ہندہ کا اس طرح اپنے شوہر سے ناراض ہو کر اس کے گھر سے بلا اجازت اپنے ماں باپ کے گھر چلا جانا اور اپنے شوہر کی ناراضگی کے ساتھ وہاں قیام کرنا گناہ اور معصیت ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا پاک ارشاد ہے کہ: تین آدمیوں کی نماز قبول نہیں ہوتی، اور ان کی کوئی نیکی (اللہ تعالیٰ کی طرف) نہیں جاتی (یعنی قبول نہیں ہوتی) پہلا وہ غلام جو اپنے آقا کے یہاں سے بھاگ گیا جب تک کہ لوٹ کر ان کے پاس پہنچ کر اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ میں نہ دے دے، دوسری وہ عورت جس کا شوہر اس سے ناراض ہو، تیسرا شراب کے نشہ والا یہاں تک کہ اس کا نشہ اتر جائے۔ (مشکوۃ ۲۸۳)

اس لیے ہندہ کو چاہیے کہ وہ اولین فرصت میں اپنے شوہر کے گھر جائے، اس کے

بعد اگر اس پر حج فرض ہے تو شوہر اجازت نہ دے پھر بھی اپنا فریضہ ادا کرنے کے لیے جاسکتی ہے، اور اگر اس پر فرض نہیں ہے تو بلا اجازت نہیں جاسکتی۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲/ذوالقعدۃ الحرام ۱۴۱۵ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

باب طواف الزیارۃ

طواف زیارت کی تکمیل نفلی طواف سے

سوال: کسی حاجی نے طوافِ زیارت کے دو تین شوط چھوڑ دیے اور ایام نحر کے بعد اس نے نفل طواف کیا تو کیا اس نفل طواف کے شوط طواف زیارت میں شامل کر لیے جائیں گے؟ اور کیا اس طرح طوافِ زیارت مکمل ہو جائے گا اور تاخیر کی وجہ سے اس حاجی پر صدقہ وغیرہ آئے گا یا نہیں؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

جی ہاں، اس طرح طواف زیارت کی تکمیل ہو جائے گی اور دم ساقط ہو جائے گا؛ البتہ ہر شوط کے بدلہ میں ایک کامل صدقہ نکالنا ضروری ہے۔ (زبدۃ المناسک ۲/۷۸، عمدۃ الفقہ کتاب الحج ۴/۵۳۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

املاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۰/صفر ۱۴۲۵ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ

طواف زیارت کیے بغیر نئی شادی والی بیوی بھی حلال نہیں

سوال : ایک آدمی نے حج کیا، اور طواف زیارت نہیں کیا اور وطن واپس چلا گیا تو کیا اس کی بیوی اس کے لیے حلال ہے۔ اور اگر نہیں ہے تو کیا پھر دوسری شادی کر سکتا ہے یا اس کی صورت کیا ہوگی۔ ''معلم الحجاج'' میں لکھا ہے کہ جب تک طواف زیارت نہیں کرے گا بیوی حلال نہیں ہوگی چاہے سالہا سال گزر جائے۔

الجواب : حامداً و مصلیاً و مسلماً

''معلم الحجاج'' میں جیسا کہ لکھا ہے اس آدمی کے لیے عورت کے ساتھ وطی اور دواعی وطی حلال نہیں جب تک کہ طواف زیارت نہ کرلے، دوسری شادی کرنے سے بھی مسئلہ حل نہ ہوگا نئی آنے والی بیوی کا بھی یہی حکم ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

املاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۸/ ذی الحجہ ۱۴۲۴ھ

طواف زیارت کیے بغیر وطن لوٹنے والا جرم کا تدارک نیا احرام باندھ کر کرے یا سابق احرام سے؟

صاحب فتاویٰ رحیمیہ کا تسامح

سوال : فتاوی رحیمیہ ۵ / ۲۲۷ سوال نمبر: ۱۵۱۸ میں ایک عورت کے متعلق سوال کیا گیا ہے، جو بیماری کی وجہ سے طواف زیارت نہ کرسکی، اور طواف زیارت کیے بغیر ہی وطن واپس لوٹی، کہ وہ طواف زیارت کے لیے مکہ مکرمہ احرام باندھ کر جائے یا بغیر

احرام باندھے؟ اس کے جواب میں حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے تحریر فرمایا ہے کہ ''اب اسے چاہیے کہ طواف زیارت ادا کرنے کے لیے عمرہ کا احرام باندھ کر جائے'' تو کیا اس کے لیے نیا احرام باندھ کر جانا ضروری ہے؟ یا اس کا پہلے والا احرام ابھی مکمل ختم نہیں ہوا بلکہ باقی ہے؛ اس لیے نیا احرام باندھنے کی ضرورت نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً

جو شخص (چاہے وہ مرد ہو یا عورت) طواف زیارت کیے بغیر اپنے وطن واپس آ گیا، اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ واپس مکہ مکرمہ جا کر طواف زیارت ادا کرے، جب تک کہ طواف زیارت ادا نہیں کرے گا، اگر وہ مرد ہے تو اس کے لیے اپنی بیوی کے ساتھ صحبت کرنا، اور اگر وہ عورت ہے تو اس کے ساتھ اس کے شوہر کا صحبت کرنا جائز نہیں، طواف زیارت کی ادائیگی کے لیے جب وہ مکہ مکرمہ جائے گا تب اس کے لیے نیا احرام باندھنے کی ضرورت نہیں، طواف زیارت نہ کرنے کی وجہ اس کا پہلے والا احرام ختم نہیں ہوا بلکہ باقی ہے، اپنے اسی احرام کے ساتھ وہ مکہ مکرمہ جائے گا۔

چناں چہ ''بدائع الصنائع'' میں ہے:

''واما حكمه اذا فات عن ايام النحر فهو انه لا يسقط بل يجب ان ياتى به لان سائر الاوقات وقته، بخلاف الوقوف بعرفة انه اذا فات عن وقته يسقط لا نه موقت بوقت مخصوص ثم ان كان بمكة ياتى به باحرامه الاول لا نه قائم اذ التحلل بالطواف ولم يوجد وعليه لتاخيره عن ايام النحر دم عند ابى حنيفة وان كان رجع الى اهله فعليه ان يرجع الى مكة باحرا مه الاول ولا يحتاج الى ا حرام جد يد، وهو محرم عن

النساء الی ان یعود فیطوف، وعلیه للتاخیر دم عند ابی حنیفة ولا یجزئ عن هذا الطواف بدنة لا نه رکنه وارکان الحج لا یجزئ عنها البدل ولا یقوم غیرها مقامها بل یجب الاتیان بعینها کالوقوف بعرفة (بدائع ۲/ ۱۳۳)

(ترجمہ) اور طواف زیارت کا حکم یہ ہے کہ اگر وہ (اپنے مقررہ وقت یعنی) ایام نحر سے فوت ہو جائے تو وہ معاف نہیں ہوتا، بلکہ ضروری ہے کہ اس کو ادا کیا جائے؛ اس لیے کہ پوری زندگی اس کا وقت ہے، برخلاف وقوف عرفہ کے کہ اگر وہ اپنے وقت سے فوت ہو گیا تو وہ ساقط ہوئے گا؛ اس لیے کہ وہ مخصوص وقت کے ساتھ موقت ہے، پھر اگر وہ آدمی (جس کا طواف زیارت ایام نحر میں ادا نہیں ہو پایا ہے) مکہ مکرمہ ہی کے اندر موجود ہے تو وہ اپنے پہلے والے احرام ہی کے ذریعہ طواف کرے گا؛ اس لیے کہ جب تک طواف نہیں کیا ہے پہلے والا احرام موجود ہے اور طواف کو ایام نحر سے مؤخر کرنے کی وجہ سے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس پر ایک دم واجب ہے، اور اگر وہ اپنے گھر لوٹ چکا ہے تب بھی اس پر ضروری ہے کہ اپنے پہلے والے احرام کے ساتھ مکہ واپس جائے اور اس کو نیا احرام باندھنے کی ضرورت نہیں ......الخ۔

"غنیۃ الناسک" میں ہے: "ولو ترك طواف الزیارة کله او اکثره فهو محرم ابدا فی حق النساء حتی یطوف، فکلما جامع لزمه دم اذا تعدد المجلس الا ان یقصد الرفض فلا یلزمه بالثانی شی ء فعلیه حتما ان یعود بذلك الاحرام ویطوف ولا یجزئ عنه البدل اصلا". (غنیة الناسك ۱۴۶)

"معلم الحجاج" میں ہے۔ مسئلہ: اگر طواف زیارت کے چار چکر یا پورا طواف چھوڑ دیا تو ساری عمر عورت حلال نہ ہوگی، اور عورت کے حق میں احرام باقی رہے گا،

اوراسی احرام سے آکر طواف کرنا واجب ہوگا، بدل دینا کافی نہ ہوگا، جب ادا کرے گا اس وقت عورت حلال ہوگی اور اس حالت میں اگر جماع کرلے گا تو ہر جماع کے بدلہ میں مجلس مختلف ہونے کی صورت میں ایک دم واجب ہوگا۔ (معلم الحجاج ۲۴۵، ۲۴۶)

''زبدۃ المناسک'' میں ہے۔ مسئلہ: اور اگر طواف زیارت کے چار شوط چھوڑ دیے جب تک ادا نہ کرے ساری عمر حقِ عورت میں احرام سے نہ نکلے گا اسی احرام سے آکر ادا کرنا واجب ہوگا، دوسرے احرام کی ضرورت نہیں ہے اگر چہ میقات سے نکل گیا ہو، کیوں کہ جب مکہ معظّمہ کو عود کرے گا تو میقات سے گزرتے وقت کے لیے وہ پہلا احرام جو حق نساء میں باقی ہے وہی کافی ہے، طواف زیارت کا بدل دینا کافی نہیں ہوگا۔ (زبدۃ المناسک ۲/ ۷۹)

عباراتِ بالا سے معلوم ہوا کہ اس عورت کے لیے طواف زیارت کی ادائیگی کے لیے مکہ مکرمہ جاتے وقت نیا احرام باندھنے کی ضرورت نہیں، اس کا پہلے والا احرام جو ابھی تک باقی ہے وہی اس کے لیے کافی ہے، اور اسی احرام کے ساتھ وہ مکہ مکرمہ لوٹے گی؛ اس لیے ''فتاوی رحیمیہ'' میں حضرت اقدس مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے نیا احرام باندھنے کا جو حکم لکھا ہے وہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا تسامح ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

املاہ: احمد خانپوری، ۱۹/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۸ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ		الجواب صحیح: عبدالقیوم راجکوٹی

طوافِ زیارت کی سعی سے پہلے صحبت کرنا

سوال: حج کے موقع پر طوافِ زیارت تو ایامِ نحر میں کرلیا؛ لیکن ہجوم کی وجہ سے

سعی کو مؤخر کیا: سعی کرتے وقت نفل طواف کرنا ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً

نہیں۔ (زبدۃ المناسک ۱/ ۱۲۳)

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۴/ رمضان المبارک ۱۴۱۸ھ
الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

حج ٹورس کے مسائل

ٹورس والوں کا بزرگ اشخاص کو مفت حج کرانا یا رعایت دینا اور ایجنٹ کے کمیشن کا حکم

سوال: (۱) بہت سارے لوگ حج و عمرہ ٹورس چلاتے ہیں، اپنے کاروبار کو بڑھانے کے لیے اور زیادہ حاجی وصول کرنے کے لیے دو طریقے اپناتے ہیں۔ کسی ایسے آدمی کو جو کسی علاقہ یا شہر میں باعزت ہو ایسے شخص کو یا تو مفت میں حج میں لے جاتے ہیں یا بہت کم میں لے جاتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ حضرت آپ کے ہونے سے لوگوں کو فائدہ ہوگا؛ لیکن دلی مقصد یہ نہیں ہوتا، بلکہ مقصد یہ ہوتا ہے کہ اتنا بڑا آدمی ان کے ساتھ جاتا ہے تو ہمیں بھی ان کے ساتھ جانا چاہیے اور حج کے بعد دوسرے سال کے لیے لوگوں سے یوں کہتے ہیں کہ فلاں بزرگ نے میرے ساتھ حج کیا تھا، اور وہ بھی اس کے احسان کی وجہ سے لوگوں سے کہتے ہیں کہ اچھی ٹور ہے تا کہ دوبارہ پھر

ان کو حج میں لے جائے؛ حالاں کہ دیگر لوگ جنہوں نے بلا واسطہ کسی کے اس کے ساتھ حج کیا ہوتا ہے وہ اس ٹور والے کو بہت برا بھلا کہتے ہیں پھر بھی لوگ بزرگ کی بات پر بھروسہ کرتے ہیں۔

(حضرت مجھ کو بہت ڈر لگتا ہے کہ میں آپ کے سامنے اتنا سب لکھوں؛ اس لیے گستاخی کی معافی چاہتا ہوں) مجھ کو یہ صرف اس وجہ سے لکھنے کی نوبت آئی ہے کہ بہت سارے ہمارے اپنے مجھ سے کہتے ہیں تو اپنی ٹور چلانے کے لیے ایسا کیوں نہیں کرتا جیسا کہ اور ٹور والے کرتے ہیں، (یعنی اوپر والی بات) میں ان کو جواب دیتا ہوں کہ میرا ضمیر گوارا نہیں کرتا کہ میں ان بزرگوں کو اپنی دنیا کمانے کا ذریعہ بناؤں، میرا مقدر میرے ساتھ ہے اور الحمد للہ خوب چلتا ہے، بس آپ سے صرف یہ جواب مطلوب ہے کہ میرے لیے بھی یہ ترتیب جائز ہے اور ان لوگوں (بزرگوں) کو بھی ایسا کرنے کی اجازت ہے؟ میرے استاد محترم ہونے کی وجہ سے میری صحیح رہبری فرمائیں، اللہ تعالیٰ آپ کا سایہ تادیر باقی رکھے۔ آمین۔

۲ حضرت استاذی! دوسرا سوال یہ عرض کرنا ہے کہ بہت سے ٹور والے حج میں حاجیوں کو بہت زیادہ پریشان کرتے ہیں، حاجی ان سے ناراض ہوتے ہیں، حج سے آنے کے بعد اس ٹور والے کو یہ فکر ہوتی ہے کہ آئندہ مجھ کو حاجی کیسے ملیں گے، امسال کے تمام حاجیوں نے اپنے اپنے علاقوں میں میری خوب برائی کی ہوگی تو ناراض ہونے والے حاجیوں میں ایسے آدمی کو تلاش کرتے ہیں جس کا لوگوں میں رسوخ ہو، اس کے پاس جاتے ہیں اور معافی تلافی کرتے ہیں، اور چکنی چپڑی باتیں کر کے پھر اس کو کہتے ہیں کہ حاجی صاحب آپ اگر مجھ کو حاجی دلوا دو گے تو میں آپ کو ایک حاجی پر مثلاً پانچ

ہزار دوں گا، اگر آپ نے دس بیس حاجی کروا دیے تو آپ کا گزشتہ سال کا حج کا خرچہ نکل جائے گا، اس لالچ میں آکر وہی آدمی اس کی تعریف کرنے لگتا ہے (اپنے مفاد کے خاطر) اور اس میں رقم بھی زیادہ طے کرتا ہے تا کہ اس کو دینے کے پیسے بھی نکل جائیں۔

③ دوسری شکل: بعض ٹور والے ہر جگہ پر اپنے ایجنٹ بناتے ہیں اور ان ایجنٹوں سے کمیشن طے کرتے ہیں اور چوں کہ اس کو کمیشن دینا ہوتا ہے؛ اس لیے زیادہ دام رکھتے ہیں، پھر اس نے جو کام کیا اس کے عوض یا تو اس کو حج میں لے جاتے ہیں یا نقد اس کو دے دیتے ہیں، مکہ مکرمہ پہنچنے کے بعد ہر حاجی ایک دوسرے سے پوچھتا ہے تم سے کتنے پیسے لیے تو جو لوگ بغیر ایجنٹ کے ڈائریکٹ ہم سے بک کرواتے ہیں ان سے ہم کچھ پیسے کم لیتے ہیں تو ایجنٹ کے معرفت آنے والے ٹور والے سے کہتے ہیں کہ تم نے ہم سے پیسے کیوں زیادہ لیے اور ان سے کم لیے؟ تو ٹور والے کو مجبوراً کہنا پڑتا ہے کہ تم لوگ ایجنٹ کی معرفت آئے تھے تو مجھ کو ایجنٹ کو کمیشن دینا پڑا تو وہ حاجی ایجنٹ کو بہت برا بھلا کہتے ہیں؛ کہ ہم تو یہ سمجھتے تھے یہ ایجنٹ بزرگ آدمی ہے یا باعزت با وقار آدمی ہے، اس لیے یہ ہمدردی میں ہماری رہنمائی کرتا ہے، کاش ہم کو معلوم ہوتا تو ہم بھی ڈائریکٹ جاتے، ہم نے ہمارا نقصان کر دیا، حج سے واپس آنے کے بعد اگر وہ ایجنٹ کوئی بزرگ یا کوئی داعی آدمی تھا تو عوام الناس میں اس کے مقام کی وجہ سے لوگ خاموش رہتے ہیں کہ ایسے لوگوں کے لیے کسی کے سامنے کچھ کہنا مناسب نہیں ہے۔

خلاصۂ کلام یہ عرض ہے کہ کوئی آدمی ایجنٹ بن کر کام کرے تو اس کو یہ ظاہر کرنا چاہیے، ہر اس کے پاس آنے والے حاجی کو کہ: میرا کمیشن ہے تا کہ لوگ ناراض نہ ہوں، مکانوں کی دلالی میں عامۃ الناس جانتے ہیں ان کی دلالی ہوگی تو کوئی جھگڑا ہی نہیں ہوتا۔

حج ٹور کے ایجنٹ کے متعلق اکثر لوگوں کا گمان یہ ہوتا ہے یہ اچھی ٹور میں حج کرنے کی ہمدردی کے لیے ہمارا تعاون کرتا ہے، اور پچھلی باتوں میں جو ٹور والوں کی مکاّریاں بیان کی ہیں یہ طریقہ جائز ہے؟ مجھ کو کسی سے کوئی شکایت نہیں ہے نہ آپ کے جوابات کا افشاء کر کے اپنا مفاد ڈھونڈوں، بس میرے اپنے علم کے لیے آپ استاذ محترم ہونے کی وجہ سے رہبری فرمائیں، اگر میری بھی کوئی شکایت آپ کے پاس پہنچی ہو تو میری اصلاح فرمائیں میں آپ کا شاگرد ہوں، باپ کے لیے بیٹے کی شکایت کو چھپانا بیٹے کے لیے نقصان ہے، اور استاذ کا مقام شاگرد کے لیے باپ سے بھی زیادہ ہے، گستاخی معاف فرمائیں۔

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

① آپ نے اپنے سوال میں جن نکات کو اٹھایا ہے، اس کا خلاصہ دو باتیں ہیں: نمبر ایک یہ ہے کہ حج اور عمرہ کے لیے ٹور لے جانے والے حضرات کسی ایسی شخصیت کو جو اپنے صلاح اور دین داری کی وجہ سے اپنے علاقہ میں مشہور ہے، بلا معاوضہ یا کم معاوضہ پر اپنے ساتھ حج یا عمرہ کے لیے یہ کہہ کر لے جاتے ہیں کہ آپ کے ہونے سے لوگوں کو فائدہ پہنچے گا؛ لیکن ان کو لے جانے والوں کا دلی مقصد یہ ہوتا ہے کہ ایسی بزرگ اور عالم شخصیت کے ہمارے ساتھ ہونے سے بہت سے حج میں جانے والے حضرات ہماری ٹور میں سفر حج کرنے کو ترجیح دیں گے؛ تاکہ ان بزرگ کی برکات اور فیوض سے فائدہ اٹھانے کا موقعہ ملے، اور اس طرح ہماری ٹور میں حج کے لیے سفر کرنے والوں کی تعداد بڑھ کر ہمیں مالی طور پر فائدہ حاصل ہوگا؛ نیز آنے والے سالوں میں بھی لوگوں کو ہماری ٹور میں سفر کرنے کے لیے آمادہ کرنے کے واسطے ہمیں یہ کہنے کا موقعہ

ملے گا کہ فلاں بزرگ شخصیت نے گزشتہ سال ہمارے ساتھ حج کیا تھا۔

نمبر دو یہ ہے کہ خود وہ بزرگ شخصیت جن کو اس ٹور کے چلانے والے نے اپنے ساتھ حج کرایا، وہ باجود یہ جانتے ہوئے کہ اس ٹور کا نظم وانتظام ٹھیک نہیں ہے، اور اس میں سفر کرنے والوں کو وہ سہولتیں مہیا نہیں کی جاتیں جن کا وعدہ ٹور کے ذمہ داروں کی طرف سے معاملہ کرنے کے وقت کیا جاتا ہے، اس کے باوجود وہ بزرگ لوگوں کے سامنے اس کی تعریف اور اس کے نظم کی تحسین محض اس لیے کرتے ہیں کہ اس نے ان کو بلا معاوضہ حج کا سفر کرنے کی سہولت فراہم کی تھی۔ اب ہر ایک نمبر کا حکم لکھا جاتا ہے۔

نبی کریم ﷺ نے جو بنیادی ہدایتیں امت کو عطا فرمائیں، اور قرآن پاک میں بھی جن کی تاکید کی گئی ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ ہر عمل خالص اللہ کی رضا جوئی کے لیے انجام دیا جائے۔ ﴿وما امروا الا لیعبدوا الله مخلصین له الدین﴾ "انما الاعمال بالنیات" یہاں تک کہ کسی کے ساتھ محبت یا بغض بھی اللہ ہی کے واسطہ رکھنے کی ترغیب دی گئی ہے اور اس کو کمال ایمان کی علامت قرار دیا گیا ہے، چناں چہ ارشاد ہے: "من اعطیٰ لله ومنع لله واحب لله وابغض لله فقد استکمل ایمانه" (ترمذی) کہ جو شخص کسی کو کچھ دے تو اللہ کے لیے دے، اور کسی کو دینے سے منع کرے تو اللہ کے لیے منع کرے، اگر کسی سے محبت کرے تو اللہ کے لیے کرے، اور اگر کسی سے بغض وعناد رکھے تو اللہ کے لیے رکھے تو اس کا ایمان کامل ہو گیا۔

اس کی تشریح کرتے ہوئے حضرت مولانا مفتی محمد تقی صاحب عثمانی زید مجدہم فرماتے ہیں کہ: تیسری علامت یہ بیان فرمائی کہ اگر محبت کرے تو اللہ کے لیے محبت کرے۔ ایک محبت تو بغیر کسی شائبہ کے خالصۃً اللہ کے لیے ہوتی ہے جیسے کسی اللہ والے

سے محبت ہے، ظاہر ہے کہ اس سے محبت؛ اس لیے نہیں ہوتی ہے کہ اس سے پیسے کمائیں؛ بلکہ اس سے محبت اس نیت سے ہوتی ہے کہ اس سے محبت اور تعلق رکھیں گے تو ہمارے دین کا فائدہ ہوگا اور اللہ تعالی راضی ہوں گے، یہ محبت اللہ تعالیٰ کے لیے ہے اور بڑی برکت کی اور بڑے فائدہ کی چیز ہے۔

بعض اوقات شیطان اور انسان کا نفس اس محبت میں بھی صحیح راستہ سے گمراہ کر دیتا ہے، مثلاً اولیاء سے تعلق کے وقت شیطان یہ نیت دل میں ڈال دیتا ہے کہ اگر ہم ان کے مقرب بنیں گے تو دنیا والوں کی نگاہ میں ہماری قدر و قیمت بڑھ جائے گی، العیاذ باللہ۔ یا مثلاً لوگ یہ کہیں گے کہ یہ صاحب تو فلاں بزرگ کے خاص آدمی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو محبت خالص اللہ کے لیے ہونی چاہیے تھی وہ اللہ کے لیے نہیں ہوتی، بلکہ وہ محبت دنیاداری کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ یا بعض لوگ کسی اللہ والے کے ساتھ؛ اس لیے رابطہ جوڑ لیتے ہیں کہ ان کے پاس ہر قسم کے لوگ آتے ہیں، صاحب منصب اور صاحب اقتدار بھی آتے ہیں، اور بڑے بڑے مالدار لوگ بھی آتے ہیں، جب ہم ان بزرگوں کے پاس جائیں گے تو ان لوگوں سے بھی تعلقات قائم ہوں گے اور پھر اس تعلق کے ذریعہ ان سے اپنی ضروریات اور اپنے مقاصد پورے کریں گے، العیاذ باللہ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو محبت اللہ کے لیے ہونی تھی وہ دنیا حاصل کرنے کے لیے ہوگئی۔ (اصلاحی خطبات ۹/ ۳۲،۳۱)

اللہ تعالی کے نیک بندوں کی خدمت اور ان کے ساتھ حسن سلوک اور ان کی راحت رسانی بھی اسی محبت کی بنیاد پر ہونی چاہیے، اگر یہ ٹور والے ان بزرگ شخصیتوں کو خالص اللہ کی محبت کی نسبت پر حج کے لیے لے جاتے تو میں سمجھتا ہوں کہ ان کا یہ عمل اللہ تعالیٰ

کی خوشنودی اور اس کی رضا کا ذریعہ تو بنتا ہی، ساتھ ہی ان کے کاروبار میں بھی برکت اور اضافہ ہوتا؛ لیکن نفس اور شیطان نے ان کی ایسی راہ ماری کہ اس عمل میں دنیاوی غرض شامل کر کے اس کے اجر وثواب سے بھی محروم کر دیا اور کاروبار کی ترقی کا بھی خدا حافظ۔

دوسری بات یہ ہے کہ وہ بزرگ شخصیت جن کو ٹور والے اس مقصد کے لیے اپنے ساتھ لے جاتے ہیں، اگر ان کو بھی ٹور والے کی اس بدنیتی کا علم یا احساس ہے، اس کے باوجود وہ اپنی ذات کو اس مقصد میں استعمال کرنے کی اجازت دے رہے ہیں، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ اپنی بزرگی یا دین داری یا علم کو بکاؤ مال سمجھ کر اس کی قیمت وصول کر رہے ہیں۔ جو بہت ہی خطرناک چیز ہے۔

حضرت مولانا اعزاز علی صاحب نور اللہ مرقدہ ''نور الایضاح'' کے مقدمہ میں طلبہ اور علماء کو نصیحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

حذار ثم حذار أن تريد بالعلوم الدينية الدنيا وجاهها ومالها، فان البهلوان الذى يلعب فوق الجبال خير من العلماء الذين يميلون الى المال لأنه يأكل الدنيا بالدنيا وهؤلاء يأكلون الدنيا بالدين وقال بعض العلماء استجرار الجيفة بالمعازف أهون من استجرارها بالمصاحف وقال تعالى جده: ﴿ولا تشتروا بآيٰتى ثمناً قليلاً و اياى فاتقون﴾.

(مقدمۂ نور الایضاح:٦)

یعنی خبردار پھر خبردار! علوم دینیہ کے ذریعہ سے دنیا اور اس کا جاہ و مال طلب کرنے سے بچو؛ اس لیے کہ وہ پہلوان جو پہاڑوں کے اوپر تماشہ کرتا ہے، وہ ان علماء سے بہتر ہے جو مال کی طرف مائل ہوتے ہیں؛ اس لیے کہ وہ دنیا کے ذریعہ سے دنیا کماتا ہے اور یہ لوگ دین کے ذریعہ دنیا حاصل کرتے ہیں۔ بعض علماء کا ارشاد ہے کہ

مردار (دنیا) معازف (گانے بجانے کے آلات) کے ذریعہ حاصل کرنا مصاحف (قرآن وحدیث) کے ذریعہ حاصل کرنے کے مقابلہ میں سہل ہے، اور ارشاد خداوندی ہے: میری آیتوں کے بدلہ میں ثمن قلیل نہ حاصل کرو۔

حضرت مولانا مفتی محمد تقی صاحب عثمانیؔ زید مجدہم حضرت حکیم الامت تھانویؔ نور اللہ مرقدہ کے حوالے سے ان کے کسی استاذ یا شیخ کا واقعہ نقل فرماتے ہیں کہ: ایک مرتبہ وہ کسی دوکان پر کوئی چیز خریدنے گئے، اور انہوں نے اس چیز کی قیمت پوچھی، دوکان دار نے قیمت بتادی جس وقت قیمت ادا کرنے لگے تو اس وقت ایک اور صاحب وہاں پہنچ گئے جو ان کے جاننے والے تھے، وہ دوکان دار ان کو نہیں جانتا تھا کہ یہ فلاں مولانا صاحب ہیں، چناں چہ ان صاحب نے دوکان دار سے کہا کہ یہ فلاں مولانا صاحب ہیں، لہٰذا ان کے ساتھ رعایت کریں، حضرت مولانا نے فرمایا کہ: میں اپنے مولوی ہونے کی قیمت نہیں لینا چاہتا، اس چیز کی جو اصل قیمت ہے وہی مجھ سے لے لو؛ اس لیے کہ پہلے جو قیمت تم نے بتائی تھی اس قیمت پر تم خوش دلی سے یہ چیز دینے کے لیے تیار تھے، اب اگر دوسرے آدمی کے کہنے سے تم نے رعایت کردی اور دل اندر سے مطمئن نہیں ہے تو اس صورت میں وہ خوش دلی سے دینا نہیں ہوگا، اور پھر میرے لیے اس چیز میں برکت نہیں ہوگی، اور اس کا لینا بھی میرے لیے حلال نہیں ہوگا؛ لہٰذا جتنی قیمت تم نے لگائی ہے اتنی قیمت لے لو۔

اس واقعہ سے اس طرف اشارہ فرمادیا کہ یہ ''مولویت'' بیچنے کی چیز نہیں کہ بازار میں اس کو بیچا جائے کہ لوگ اس کی وجہ سے اشیاء کی قیمت کم کردیں۔ (اصلاحی خطبات ۱۱/۱۲۸)

پھر ان بزرگ یا عالم صاحب کا اس ٹور کے متعلق یہ جانتے ہوئے کہ اس کا انتظام

ٹھیک نہیں ہے؛ نیز گاہکوں سے معاملہ کرتے وقت جن سہولتوں کا وعدہ کرتے ہیں وہ فراہم نہیں کرتے، اس کے باوجود وہ اس کی تحسین وتعریف کریں تو یہ ایک طرح کی جھوٹی شہادت ہے، اور جھوٹی گواہی اتنی بری چیز ہے کہ حدیث شریف میں نبی کریم ﷺ نے اس کو شرک کے ساتھ ملا کر ذکر فرمایا۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضور اقدس ﷺ ٹیک لگائے ہوئے بیٹھے تھے، صحابہ کرام سے فرمایا کہ: کیا میں تم کو بتاؤں کہ بڑے بڑے گناہ کون کون سے ہیں؟ صحابہ کرام نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ضرور بتائیے، آپ نے فرمایا کہ: بڑے گناہ یہ ہیں کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا، والدین کی نافرمانی کرنا، اس وقت تک آپ ٹیک لگائے ہوئے بیٹھے تھے، پھر آپ سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور پھر فرمایا کہ جھوٹی گواہی دینا، اور اس جملے کو تین مرتبہ دہرایا۔ (صحیح مسلم کتاب الایمان باب بیان الکبائر، حدیث نمبر ۱۴۳)

آپ اس سے اس کی شناعت کا اندازہ لگائیں کہ ایک طرف تو آپ نے اس کو شرک کے ساتھ ملا کر ذکر فرمایا، دوسرے یہ کہ اس کو تین مرتبہ ان الفاظ کو اس طرح دہرایا کہ پہلے آپ ٹیک لگائے ہوئے بیٹھے تھے، پھر اس کے بیان کے وقت سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ اور خود قرآن کریم نے بھی اس کو شرک کے ساتھ ملا کر ذکر فرمایا ہے چناں چہ فرمایا کہ: ﴿فاجتنبوا الرجس من الأوثان واجتنبوا قول الزور﴾ (الحج: ۳۰) یعنی تم بت پرستی کی گندگی سے بھی بچو اور جھوٹی بات سے بھی بچو۔ اس سے معلوم ہوا کہ جھوٹی بات اور جھوٹی گواہی کتنی خطرناک چیز ہے۔

جھوٹی گواہی دینا، جھوٹ بولنے سے بھی زیادہ شنیع اور خطرناک ہے؛ اس لیے کہ اس میں کئی گناہ مل جاتے ہیں، ایک جھوٹ بولنے کا گناہ، اور دوسرا دوسرے شخص

کو گمراہ کرنے کا گناہ؛ اس لیے کہ جب آپ نے جھوٹی گواہی دی اور جھوٹی گواہی کی وجہ سے دوسرا شخص یہ سمجھا کہ یہ آدمی بڑا اچھا آدمی ہے اور اچھا سمجھ کر اس سے کوئی معاملہ کرلے گا اور اگر اس معاملہ کرنے کے نتیجہ میں اس کو کوئی نقصان پہونچے گا تو اس نقصان کی ذمہ داری بھی آپ پر ہوگی۔ (اصلاحی خطبات ۳/۱۴۶، ۱۴۷)

یہ تو آپ کے سوال میں اٹھائے گئے نکات کا حکم تھا؛ لیکن میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ آپ کو کیسے پتہ چلا کہ ٹور والا اس بزرگ اور عالم شخصیت کو اپنے کاروبار کو بڑھاوا دینے کے لیے بلا معاوضہ یا کم معاوضہ پر لے جارہا ہے؟ اسی طرح وہ بزرگ اس ٹور والے کی (بقول آپ کے) بدنیتی کو جانتے ہوئے اپنی بزرگی سے اس طرح فائدہ اٹھانے کا موقعہ فراہم کرتے ہیں؟ اگر خود ٹور والے نے آپ کے سامنے اپنے اس اندرونی ارادہ کا اظہار کیا ہے یا ان بزرگ نے اس حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے، تب تو اس کا حکم وہی ہے جو اوپر مذکور ہوا۔ اور اگر ایسی بات نہیں ہے بلکہ آپ اپنے گمان اور قیاس سے یہ بات فرمارہے ہیں تو حدیث پاک میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ارشاد ہے: ایاکم والظن، فان الظن اکذب الحدیث اور باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿یایھا الذین اٰمنوا اجتنبوا کثیرا من الظن ان بعض الظن اثم﴾ ہمیں تو شریعت مطہرہ نے ظاہر کے مطابق معاملہ کرنے کا حکم دیا ہے اور دلوں کے اندر کا حال خدا کے حوالہ کرتے ہوئے ظنوا بالمؤمنین خیراً کی تاکید کی گئی ہے، اور دلوں کے اندرونی کیفیات کی ٹوہ میں لگنے کے بجائے ﴿ولا تجسسوا﴾ فرماکر دلوں کے اندر کے حال کو ﴿یوم تبلی السرائر﴾ پر محول کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔

(۲) اوپر کے جواب میں اس کا حکم بھی آچکا ہے۔

③ ایجنٹ بن کر کام کرنے والے کو بطور کمیشن جو رقم دی جاتی ہے، وہ دلالی ہے، اور فقہاء نے دلالی کا جواز ہی عرف کی بنیاد پر دیا ہے؛ اس لیے جس طرح مکانوں کی دلالی میں مکان خریدنے یا بیچنے والے کو یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ میرے اس کام میں جو آدمی میری مدد کر رہا ہے، وہ اپنی اس محنت پر دلالی کی شکل میں معاوضہ وصول کر رہا ہے۔ اور دلالی بھی اسی صورت میں جائز ہے ورنہ نہیں۔ صورت مسئولہ میں حاجی اگر یہ سمجھ رہا ہے کہ ٹور والے کے ساتھ میرا معاملہ طے کرانے والی یہ شخصیت محض میری خیر خواہی میں نہیں بلکہ اپنی اس محنت پر ملنے والے معاوضہ اور دلالی کی خاطر کام کر رہی ہے، تب تو اس آدمی کے لیے یہ کمیشن لینا جائز اور درست ہوگا، ورنہ اس سے بڑا دھوکا اور کیا ہو سکتا ہے کہ حاجی تو یہ سمجھ رہا ہے کہ یہ عالم صاحب یا داعی صاحب میری خیر خواہی کے جذبہ سے یہ ساری مشقت اٹھا رہے ہیں، اور اسی بنیاد پر وہ ان کے متعلق اپنے دل کو احساس ممنونیت سے بھرا ہوا پاتا ہے، جب کہ حقیقت اس کے بالکل برخلاف ہے، چناں چہ جب حاجی کے سامنے حقیقت سے پردہ اٹھتا ہے تو وہ اس کے متعلق لعن وطعن کرتا ہے اور اول فول بکنے لگتا ہے، دین کی نسبت پر عزت کے مقام پر فائز شخصیت کے لیے اس سے بڑا المیہ کیا ہو سکتا ہے؟ العیاذ باللہ۔ ٹور والے کو بھی چاہیے کہ وہ حاجی کے سامنے پہلے ہی یہ اظہار کر دے کہ آپ کا معاملہ مجھ سے طے کرانے والی شخصیت کو میں ان کی محنت کا معاوضہ ادا کر رہا ہوں، ورنہ تو ٹور والا بھی اس تزویر اور دھوکہ بازی میں برابر کا شریک ہو کر آخرت میں مسئول ہوگا۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

املاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۹/ جمادی الاخریٰ ۱۴۲۳ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ

حج ٹور کے ایجنٹ کی اجرت کا حکم

سوال: یہ مسئلہ ان ایجنٹ حضرات پر ہے جو حج ٹور والوں کو حاجی صاحبان کمیشن پر دیتے ہیں، اور ان ایجنٹ حضرات کی نیت یہ ہوتی ہے کہ کمیشن بھی مل جائے گا اور حج بھی ہو جائے گا، اور یہ حضرات حج کے ارکان بھی حاجیوں کو مکمل کراتے ہیں، اور حاجی صاحبان کو لانا اور لے جانا ان کی ذمہ داری ہوتی ہے، اور ایسا ہر سال ہوتا ہے؛ لہٰذا کیا ایسا کرنے سے یعنی کمیشن کی وجہ سے ان لوگوں کا حج اور عمرہ کامل ہوتا ہے؟ اور ثواب کے اعتبار سے اجر بھی پورا کا پورا مل جاتا ہے یا پھر اس حج اور عمرہ میں کچھ کمی رہ جاتی ہے، اس عمل پر فتویٰ کیا ہے؟ جب کہ ان ایجنٹ صاحبان کی نیت یہ ہوتی ہے کہ ہمارا حج بھی ہو جائے گا اور کمیشن بھی مل جائے گا۔ نیز ان ایجنٹ صاحبان کا خرچ یعنی آنا جانا اور طعام و مکان کا کرایہ وغیرہ وغیرہ یہ سب خرچ مالکِ ٹور پر ہوتا ہے۔ آپ اس مسئلہ کا مکمل و مدلل جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً

سوال میں دریافت کردہ صورت دلالی کی ہے، جس کی فقہائے احناف نے تعامل اور لوگوں کی حاجات کے پیش نظر اجازت دی ہے بشرطیکہ اجرت پہلے سے طے کر دی گئی ہو؛ اس لیے اگر کوئی آدمی ٹور والوں کو گاہک لا کر دیتا ہے، اور ٹور والے اس کو بطور کمیشن پہلے سے مقرر شدہ اجرت دیں تو درست ہے؛ لیکن اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ ٹور والا کمیشن کی مقدار بڑھا کر وصول نہ کرے بلکہ اپنی طرف سے کمیشن کی رقم

ادا کرے۔(ماخوذ از جدید معاشی نظام میں اسلامی قانون اجارہ) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

اَملاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری ۷/محرم الحرام ۱۴۳۰ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ الجواب صحیح: عبد القیوم راجکوٹی

ٹورس والے کو ملنے والی تصریح دوسرے کو بیچنے کے مسائل

سوال: (۱) ۲۰۰۳ء سے جو ٹور گورنمنٹ آف انڈیا کے فورین افیرس حج سیل میں رجسٹرڈ (Registerd) ہو وہی ٹور حج کے لیے حاجی لے جاسکتا ہے۔ اور جو ٹور حج سیل سے رجسٹرڈ ہے انہیں حج سیل کی اور سے لائسنس اور کوٹا (Quota) یعنی تصریح ایلوٹ کیا جاتا ہے۔ اور جس ٹور کو جتنا کوٹا ملتا ہے، اس کے مطابق حاجی لے جاسکتا ہے، (مثلاً جس ٹور آپریٹر کے پاس لائسنس ۱۰۰ کے کوٹا کا ہے، وہ ٹور آپریٹر ۱۰۰ حاجی لے جاسکتا ہے)۔

(۲) اب ان ٹور آپریٹروں میں کچھ ٹور آپریٹر ایسے ہیں جو گورنمنٹ آف انڈیا کے فورین افیرس حج سیل میں رجسٹرڈ نہیں ہے یعنی ان کے پاس نہ حج کا ٹور لے جانے کا لائسنس ہے، نہ تو حج کا کوٹا (تصریح) ہے۔ ایسے ٹور آپریٹر رجسٹرڈ ٹور آپریٹر سے کوٹا (تصریح) خرید کر اپنی ٹور لے جاتے ہیں۔ یہ کاروبار گورنمنٹ آف انڈیا کے قانون کے خلاف ہے تو کیا اس طرح کا کاروبار شرعی اعتبار سے درست ہوگا؟

(۳) ان ٹور آپریٹر میں کچھ آپریٹر ایسے ہیں جو حج کا ٹور لے جاتے ہیں، اب انہیں جو کوٹا (تصریح) گورنمنٹ آف انڈیا کے حج سیل سے ملا ہے اتنے کوٹا (تصریح) کا بکنگ (Booking) پورا ہو جانے پر جو ٹور آپریٹر اپنا کوٹا (تصریح) بیچتے ہیں ان

سے کوٹا (تصریح) خرید کر جو ٹور کا دام ہوتا ہے+ کوٹا (تصریح) کے روپے (مثلاً ٹور کا دام ۱۰۰۰۰۰+۲۰۰۰۰ کوٹا کے روپیئے) پر اپنا بکنگ کرتا ہے تو کیا یہ کاروبار شرعی اعتبار سے درست ہوگا؟

④ ان ٹور آپریٹر میں کچھ ٹور آپریٹر ایسے ہیں جو حج کا ٹور لے جاتے ہیں، اس ٹور آپریٹر کو معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے پاس جو کوٹا (تصریح) ہے اس سے زیادہ بکنگ آئے گا اس لیے وہ ٹور آپریٹر کوٹا (تصریح) بیچنے والے ٹور آپریٹر سے پہلے ہی سے کونٹیکٹ (Contact) کر کے انہیں ایڈوانس (Advance) میں کوٹا (تصریح) کے پورے روپیے دے کر ان سے کوٹا (تصریح) خرید لیتے ہیں اور پھر اپنے اوریجنل (Original) کوٹے کا بکنگ ہو جانے پر ٹور کا دام+ کوٹے کے روپیے لے کر اپنا بکنگ کرتے ہیں تو کیا اس طرح کا کاروبار شرعی اعتبار سے درست ہوگا؟

⑤ کچھ ٹور آپریٹر ایسے ہیں جو حج کا ٹور نہیں لے جا کر اپنا کوٹا (تصریح) جو ٹور آپریٹر حج کا ٹور لے جاتا ہے اسے دیتے ہیں، اور اس کے ساتھ پارٹنر شیپ (Partner ship) کرتے ہیں یعنی کوٹا (تصریح) جو ٹور آپریٹر ٹور نہیں لے جاتا اس کا ہوتا ہے، اور محنت جو ٹور لے جاتا ہے اس کی ہوتی ہے، اس معاملہ میں کوٹا کی خرید و فروخت نہیں ہوتی بلکہ ٹور پورا ہونے پر منافع میں حساب ہوتا ہے، اور ٹور کا جو دام ایک مرتبہ طے ہوتا ہے اس میں بھی فرق نہیں آتا تو کیا اس طرح کا کاروبار شرعی اعتبار سے درست ہوگا؟

⑥ کچھ ٹور آپریٹر ایسے ہیں جو حج کا ٹور کا دام شروع میں کم رکھتے ہیں، اور حج کمیٹی کی قرعہ اندازی (Draw) ہو جانے پر اور دوسرے ٹور میں جگہ بھر جانے پر ٹور کے دام زیادہ کر دیتے ہیں، تو اس طرح کا کاروبار کرنا اور حاجیوں کی مجبوری کا فائدہ اٹھانا

شرعی اعتبار سے درست ہوگا؟

⑦ اب میرا سوال ان حاجیوں کے بارے میں ہے جن کا فرض حج ادا ہو گیا ہوتا ہے، اور وہ حج نفل ادا کرنے جا رہے ہیں تو کیا ان کا ان ٹور والوں سے زیادہ قیمت دے کر کوٹا (تصریح) خریدنا شرعی اعتبار سے درست ہوگا؟

نوٹ: کوٹا (تصریح) کا بیچنا یا خریدنا گورنمنٹ آف انڈیا کے قانون کے سخت خلاف ہے۔ اس سوال کا جواب شریعت کی روشنی میں حوالہ کے ساتھ مرحمت فرمائیں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً

آپ کے سوالات کے جوابات سے پہلے تمہید کے طور پر کچھ عرض کیا جاتا ہے؛ تا کہ جوابات سمجھنے میں آسانی ہو:

آپ نے لائسنس اور کوٹا (Quota) یعنی تصریح کی جو تفصیل کی ہے اس سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ گورنمنٹ آف انڈیا (Government of India) کی طرف سے ان ہی ٹور اینڈ ٹراویلس (Tours&Travels) والوں کو حاجی لے جانے کی اجازت ہوتی ہے جو گورنمنٹ کے فورین افیرس کے حج سیل میں رجسٹرڈ (Registerd) ہوں، شاید اس کی وجہ یہ ہوگی کہ حاجیوں کو وہی ٹورس اینڈ ٹراویلس (Tours&Travels) حج کے لیے لے جا سکیں جو صحیح طریقہ سے اس ذمہ داری کو نبھانے کی صلاحیت رکھتے ہوں؛ تا کہ وہاں جا کر حاجیوں کو کسی پریشانیوں کا سامنا نہ ہو؛ نیز سعودی گورنمنٹ کی طرف سے ہر ملک کے واسطے حاجیوں کی ایک مخصوص تعداد مقرر ہوتی ہے، جن کو حج کا ویزا دیا جاتا ہے؛ تا کہ سعودی گورنمنٹ کے لیے حاجیوں کا انتظام کرنے میں کوئی دشواری نہ ہو، اسی کو حج کے کوٹے کا نام دیا گیا ہے۔ اس

کوٹے میں سے ایک بڑا حصہ تو وہ ہوتا ہے جن کو انڈیا گورنمنٹ اپنے ایک شعبہ یعنی حج کمیٹی کی طرف سے انتظام کر کے حج کے لیے بھیجتی ہے، اور ایک مخصوص تعداد جو ٹور اور ٹراویلس کمپنیاں حج کے لیے حاجی لے جاتی ہیں ان کے حوالہ کرتی ہے، اور وہ ان حاجیوں کو اپنے انتظام سے حج میں لے جا کر حج کراتی ہیں، اس مخصوص مقدار میں سے ایک مقررہ تعداد ہر ٹور والے کو اس کی گذشتہ سالوں کی کارکردگی کی بنیاد پر لے جانے کی اجازت دیتی ہے، اسی اجازت کو تصریح کے نام سے جانا جاتا ہے، اور پھر اسی کے مطابق سعودی کونسیولیٹ (Consulate) کی طرف سے اس ٹور والے کو ویزا جاری کیا جاتا ہے، گویا یہ ایک حق ہے جو اس ٹور والے کو اس کی سابقہ کارکردگی کو سامنے رکھ کر دیا گیا ہے، اور اس حق کے اس کو حاصل ہونے میں اس کی سابقہ کارکردگی کو دخل ہے؛، نیز اس تصریح پر کوئی معاوضہ بھی نہیں لیا گیا، شرعی اعتبار سے یہ ایک خالص حق ہے، جس کو صاحب حق خود تو استعمال کر سکتا ہے؛ لیکن کسی کو معاوضہ لے کر اس کا بیچنا شرعاً جائز نہیں، اگر وہ اپنی مجبوری یا حالات کی وجہ سے اس سال حج کے لیے حاجیوں کو لے جانے کی طاقت نہیں رکھتا یا اس کا ارادہ نہیں، تو اس کو چاہیے کہ وہ اپنے اس ارادہ سے گورنمنٹ کو باخبر کر دے؛ تا کہ وہ حق گورنمنٹ دوسرے کسی ٹور والے کو جو گورنمنٹ کے اصول کے مطابق یہ انتظام کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو دے دے، خود گورنمنٹ نے بھی اس کو بیچنا جائز نہیں رکھا، گویا گورنمنٹ کے مطابق بھی ایسا کرنا قانون کی خلاف ورزی ہے، اور اس طرح کے امور میں آدمی جس گورنمنٹ کے ماتحت رہتا ہو اس کا حکم ماننا ضروری ہو جاتا ہے، اور اس کی خلاف ورزی کرنے کی صورت میں چوں کہ جیل یا دنڈ کا اندیشہ ہے، اس لیے بھی ایسا کرنا جائز نہیں، وہ کام جس سے جان یا

مال کو خطرہ لاحق ہوتا ہو، اور شرعی اعتبار سے بھی اس میں کوئی قباحت نہ ہو، اس کا ارتکاب شرعاً جائز نہیں، چہ جائیکہ شرعاً بھی یہ عمل درست نہیں۔ اب آپ کے سوالات کے جوابات پیشِ خدمت ہیں:

① اپنی تصریح (Quota) کسی دوسرے ٹور آپریٹر کو بیچنا درست نہیں، اور جو رقم اس طرح حاصل کی گئی ہے وہ شرعاً ناجائز اور حرام ہے، جس سے لی گئی ہے اُسی کو لوٹا دی جائے۔

② یہ کاروبار بھی درست نہیں۔

③ یہ بھی درست نہیں۔

④ یہ بھی درست نہیں۔

⑤ جس ٹور آپریٹر کو کوٹا ملا ہوا ہے وہ خود بھی دوسرے ٹور آپریٹر کے ساتھ جو ٹور لے جا رہا ہے جاتا ہے، اور حاجیوں کو لے جانے، لانے کی خدمت میں حصہ لیتا ہے، تب تو ایسا کرنا درست ہے، ورنہ یہ بھی عملی طور پر تصریح بیچنے ہی کی طرح ہے جو درست نہیں۔

⑥ اپنی خدمات کی قیمت موقع اور محل کے اعتبار سے کم یا زیادہ وصول کرنا بشرطے کہ معاملہ کرتے وقت شروع ہی سے اس کی وضاحت کر دی گئی ہو درست ہے؛ البتہ سامنے والے کی مجبوری سے فائدہ اٹھانا شرافت ایمانی کے خلاف ہے۔

''احسن الفتاویٰ'' سے ایک سوال وجواب نقل کیا جاتا ہے اس سے یہ مسئلہ سمجھ میں آجائے گا:

سوال: ایک شخص ضرورت کی بنا پر اپنی کوئی چیز فروخت کرنا چاہتا ہے، اور خریدار اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر بہت کم دام لگاتا ہے، مثلاً ایک گھڑی جس کی قیمتِ

خرید ۲۰۰ روپئے ہے، اور بحالت موجودہ ۱۰۰ روپئے میں فروخت ہوسکتی ہے؛ لیکن خریدار ۲۵ سے زیادہ پر خریدنے کے لیے تیار نہیں تو کیا خریدار کا یہ عمل جائز ہے؟

جواب: یہ عمل جائز تو ہے؛ مگر خریدار اگر صاحب استطاعت ہے اور بیچنے والا واقعۃً مجبور ہے تو خریدار کو مروّت سے کام لینا چاہیے اور حتی المقدور بائع کو صحیح قیمت ادا کرنا چاہیے، غرض بیع تو بہر صورت صحیح ہے؛ مگر کسی کی مجبوری سے فائدہ اٹھانا اخلاق ومروّت کے خلاف ہے۔ (احسن الفتاوی ۶/ ۵۰۲)

⑦ اس کا جواب اوپر آچکا ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

أملاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱/ ۲/ ۱۴۳۰ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ الجواب صحیح: عبد القیوم راجکوٹی

حج سبسڈی کے مسائل

جھوٹا حلف نامہ داخل کرکے سبسڈی حاصل کرنا جائز نہیں

سوال: ہر سال حکومت ہند کے بیت المال سے حج کمیٹی کے ذریعہ حج کرنے جانے والوں کے لیے سبسڈی کے نام پر ہوائی جہاز کے کرایہ میں مخصوص رعایت تقریباً بیس ہزار روپے دی جاتی ہے، امسال حکومتِ ہند نے یہ قانون بنادیا ہے کہ جو گذشتہ سالوں میں حج کمیٹی کے ذریعے حج کرچکے ہیں، اور دوسرے وہ جو انکم ٹیکس بھرتے ہیں (اس زمرے میں تمام سرکاری ملازمین آتے ہیں)، انھیں یہ سبسڈی نہیں دی جائے گی، اس کے لیے خاص طور سے حج کمیٹی ایک حلف نامہ مانگ رہی ہے اور اس کا

مضمون صاف الفاظ میں یہی ہے کہ: ''میں (زید) نے اس سے قبل حج ادا نہیں کیا'' جب کہ میں حج کر چکا ہوں، دوسرے یہ کہ میرے دوست عمر کو یہ حلف دینا پڑ رہا ہے کہ ''وہ انکم ٹیکس ادا نہیں کرتے'' جب کہ وہ پابندی کے ساتھ ادا کر رہے ہیں، تو کیا جہاز کے کرائے میں بیس ہزار روپے بچانے کے لیے از روئے شرع جھوٹا حلف نامہ داخل کرنے کی اجازت ہوگی؟ اور کیا ایسا حج قبول ہوگا؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً

قرآن اور حدیث میں جھوٹ بولنے اور جھوٹی قسم کھانے کی سخت ممانعت وارد ہوئی ہے اور اس پر وعیدیں سنائی گئی ہیں اور ان کا شمار کبیرہ گناہوں میں کیا گیا ہے، حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کبیرہ گناہ یہ ہیں: اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا، اور ماں باپ کی نافرمانی کرنا، اور ناحق کسی کو قتل کرنا اور جھوٹی قسم کھانا۔ (مشکوۃ ۱۷)

جہاز کے کرایہ میں بیس ہزار روپئے بچانے کے لیے فارم کی خانہ پُری کرتے وقت جھوٹا حلف نامہ داخل کرنا سخت حرام اور کمینہ حرکت ہے، جب وہ آدمی حج کمیٹی کے ذریعہ پہلے حج کر چکا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ اس کا غالباً نفل حج ہے، اور سب جانتے ہیں کہ نفل کا مطلب یہ ہے کہ کرے تو ثواب اور نہ کرے تو کوئی گناہ نہیں؛ لیکن یہ شخص اس نفل حج کے لیے کبیرہ گناہ کا ارتکاب کر رہا ہے، جس سے بچنا اس کے لیے ضروری اور فرض تھا، بھلا ایسا حج کیا قبول ہوگا۔ حضرت تھانوی علیہ الرحمۃ ''اصلاح انقلاب'' میں تحریر فرماتے ہیں: ''بعض لوگ حج کو جاتے ہیں اور ریل میں یا جہاز میں یا اونٹ

پر فرض نمازیں برباد کرتے ہیں، سوانہوں نے ایک فرض تو ادا کیا اور اتنے کثیر فرض فوت کیے اور اگر حج فرض نہیں تھا، نفل تھا تو اور بھی غضب ہوا کہ ایک نفل کے لیے اتنے فرض گئے گذرے، سوایسے شخص کو حج کرنا جائز بھی نہیں"۔ (اصلاح انقلاب ۱/ ۱۶۲)

علما نے لکھا ہے کہ: حج مبرور وہ ہے جس میں کسی گناہ اور خلاف شرع کام کا ارتکاب نہ ہوا ہو۔ جھوٹا حلف نامہ کبیرہ گناہ ہے، لہٰذا اس کے بعد یہ حج کہاں مقبول اور مبرور رہا، چند کوڑیوں کے لیے ایسی شنیع حرکتوں کا ارتکاب اور وہ بھی حج جیسی عظیم الشان عبادت کی ادائیگی کے نام پر سراسر ایمانی غیرت کے خلاف ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد خانپوری عفی عنہ

حجاج کرام کا حکومت کی سبسڈی سے فائدہ اٹھا کر حج کرنا

سوال: حج اسلام کا پانچواں رکن ہے جو صاحب استطاعت اہل ایمان پر فرض ہے۔ اور ادائیگیٔ حج کے لیے حاجی کی ذاتی ملکیت کا زادِ راہ ہونا ضروری ہے۔

ہمارے ملک سے جو حجاج حج کمیٹی کے معرفت اس فریضہ کو انجام دیتے ہیں ان کے سفر کے کرائے میں حکومت ہند ایک حصہ سبسڈی (subsidy) دیتی ہے جس کی وجہ سے ان کا ہوائی سفر دوسرے ذرائع سے حج کرنے والے حجاج کے مقابلے میں کافی کم میں ہوتا ہے، نیز زرِ مبادلہ کی شرح بھی کم ہوتی ہے۔

سال گزشتہ بمبئی کے اخبارات میں سعودی عرب کے علماء سے منسوب یہ بیان شائع ہوا تھا کہ حکومت یا کسی اور طرح سے سبسڈی (subsidy) سے فائدہ لے کر ادا کیا ہوا حج صحیح نہیں ہوگا یا ادا نہیں ہوگا۔

برائے مہربانی اس بات کا خلاصہ کریں کہ حکومت کی سبسڈی (subsidy) سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کیا ہوا حج صحیح ہوگا یا نہیں؟ اور ادا ہوگا یا نہیں؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

کرایہ میں حکومت ہند کی طرف سے دی جانے والی سبسڈی یہ درحقیقت ایک رعایت ہے جو کرایہ کے سلسلہ میں حاجیوں کو دی جاتی ہے؛ اس لیے کہ حاجیوں کو لے جانے والی ہوائی سروس بھی حکومت کی ملک ہے، اسی طرح زرِ مبادلہ کی شرح میں کمی بھی ایک طرح کی رعایت ہے۔ عقد اجارہ میں اجرت پر لے جانے والے کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ کرایہ کی مقررہ مقدار میں کسی فرد یا جماعت کے لیے کوئی حصہ کم کر دے۔ اسی طرح خرید وفروخت میں بائع کو اختیار ہے کہ مبیع کے مقررہ ثمن میں کمی کر دے۔

صورت مسئولہ میں چوں کہ اجرت پر حاجیوں کو سفر کے لیے لے جانے والی بھی درحقیقت حکومت ہند ہے؛ اس لیے اس کا یہ اقدام شرح کرایہ میں ایک قسم کی تخفیف کہلائے گا۔ اسی طرح زرمبادلہ میں حکومت ہند بائع کی حیثیت رکھتی ہے، اور زرمبادلہ کی شرح میں کمی ایسی ہی ہے جیسے بائع کی طرف سے مقررہ ثمن میں کی جانے والی تخفیف۔ اور یہ دونوں امور بلاشبہ درست ہیں، ہم اس ملک میں رہتے ہوئے بہت سے معاملات میں حکومت کی طرف سے دی جانے والی ایسی رعایتوں سے بلا دریغ فائدہ اٹھاتے ہیں، مثلاً: گیس سلنڈر کی خریداری میں، حکومت کی طرف سے راشن کی دکان پر فروخت ہونے والے غلہ میں وغیرہ وغیرہ۔ بہر حال اس بنیاد پر یہ کہنا کہ حج صحیح نہیں ہوگا یا ادا نہیں ہوگا، اصول شرع کے مطابق سمجھ میں آنے والی بات نہیں۔ حج کے لیے جن چیزوں

کو شرائط وارکان وواجبات وسنن کا درجہ دیا گیا ہے ان تمام کے انجام دینے پر حج کے صحیح اورادا ہونے کا حکم لاگو کیا جاتا ہے۔ حکومت سے ملنے والی سبسڈی کا قبول نہ کرنا ارکان وشرائط وواجبات میں سے نہیں۔

(قوله كالحج بمال حرام) كذا فى البحر، والاولى التمثيل بالحج رياء و سمعة فقد يقال أن الحج نفسه الذى هوزيارة مكان مخصوص الخ ليس حراما بل الحرام هو انفاق المال الحرام ولا تلازم بينهما كما أن الصلاة فى الارض المغصوبة تقع فرضا و انما الحرام شغل المكان المغصوب لامن حيث كون الفعل صلاة لان الفرض لايمكن اتصافه بالحرمة، و هنا كذلك فان الحج فى نفسه مأمور به و انما يحرم من حيث الانفاق وكأنه أطلق عليه الحرمة لأن للمال دخلاً فيه فان الحج عبادة مركبة من عمل البدن و المال كما قدمناه، و لذا قال فى البحر و يجتهد فى تحصيل نفقة حلال فانه لا يقبل بالنفقة الحرام كما ورد فى الحديث مع أنه يسقط الفرض عنه معها ولا تنافى بين سقوطه و عدم قبوله فلا يثاب لعدم القبول ولا يعاقب عقاب تارك الحج اه أى لأن عدم الترك يبتنى على الصحة وهى الاتيان بالشرائط والاركان و القبول المترتب عليه الثواب يبتنى على أشياء كحل المال والاخلاص كما لوصلى مرائيا أوصام واغتاب فان الفعل صحيح لكنه بلا ثواب والله تعالى أعلم (رد المحتار على الدر المختار ٢ /١٥٢)

جولوگ حکومت ہند یا سعودی حکومت یا دنیا کی دیگر حکومتوں میں سے کسی حکومت کے مصارف پر پوراحج ادا کرتے ہیں، کیا آج تک ان کے متعلق سعودی عرب کے

علماء یا کسی اور عالم نے ایسا بیان دیا ہے کہ ان کا حج صحیح نہیں ہوگا یا ادا نہیں ہوگا۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

املاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۱/ رجب المرجب ۱۴۲۳ھ
الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ

حج سبسڈی سے استطاعت کا تحقق، سبسڈی پر شبہ اور مشورہ

سوال: حج اسلام کا مقدس اہم، بنیادی اور آخری فریضہ ہے، جو ہر صاحب استطاعت پر شرائط کے ساتھ صرف ایک بار فرض ہے، یعنی وہ شخص جو مکمل طور پر سفر خرچ، حرمین شریفین میں قیام طعام؛ نیز غیر حاضری میں اہل وعیال اور متعلقین کا نان ونفقہ، اور دیگر ضروریات پوری کرنے کی حیثیت رکھتا ہے، اس پر فریضۂ حج لازم آتا ہے۔ اسلام اس کے لیے تکلفات قرض اور کسی کے احسان کو پسند نہیں کرتا۔

ہمارے ملک ہندوستان سے عازمین حج بڑی تعداد میں مرکزی حج کمیٹی کے ذریعہ سفر کرتے ہیں، اور پرائیویٹ ٹورس اور ٹراویلس کے ذریعہ حج کرنے والوں کی بھی خاصی تعداد ہے، سینٹرل حج کمیٹی حکومت ہند کا ایک ادارہ ہے، جس کا کام پلیگریم پاس یعنی عارضی پاسپورٹ بنانا، زرمبادلہ دینا، حرمین شریفین میں قیام کا انتظام کرنا وغیرہ ہے، بحری جہاز میں کرایہ کم تھا اس وقت سبسڈی Subsidy دی جاتی تھی یا نہیں اس کا علم نہیں؛ لیکن جب سے وہ بند ہوئے اور ہوائی جہاز سے سفر شروع ہوا تو کرایہ میں بھی زبردست اضافہ ہوگیا، اس وقت مسلمان قائدین کی درخواست پر حکومت ہند نے کرایہ میں Subsidy کے نام سے رعایت دینی شروع کی، ہوائی جہاز ائیر انڈیا کی

چارٹر ہو یا کسی بھی ایئر لائنس کی ہو، حکومت ہر ایئر لائنس کو فی کس ۷۷۰ ڈالر تقریباً ۳۵۰۰۰ روپئے ادا کرتی ہے، جب کہ حاجیوں سے کرایہ صرف ۱۲۰۰۰ رلیتی ہے بقیہ ۲۳۰۰۰ حکومت اپنی طرف سے ادا کرتی ہے، امسال جو ایک لاکھ حاجی سینٹرل حج کمیٹی کے ذریعہ حج کے سفر پر گئے ہیں ان کی طرف سے حکومت نے 225 کروڑ روپیہ ادا کیا ہے، یہ امر بھی تحقیق طلب ہے کہ وہ رقم کہیں مشکوک تو نہیں؟ حکومت Subsidy آخر کس مد سے دیتی ہے؟ عام طور پر حجاج اس سے ناواقف ہوتے ہیں؛ لیکن اب یہ بات علم وشعور میں آنے لگی ہے کہ حکومت اس کو احسان سمجھتی ہے اور ملک کے دیگر طبقات میں اس کا اظہار بھی کیا جاتا ہے، مسلمانوں کے ساتھ مراعات واحسانات میں Subsidy کو گنایا جاتا ہے، اور جتلایا جاتا ہے۔

یہ کہنا کہ حکومت ہم سے بہت سے ٹیکس وصول کرتی ہے اور وہی رقم ہمیں Subsidy کے نام سے دے دیتی ہے، کہاں تک صحیح ہے؟ جب کہ یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ حکومت کی طرف سے بہت سے فلاح وبہبودی کے کام عوام کے لیے بلاتفریق مذہب وملت انجام دیے جاتے ہیں۔ جیسے اسکول چلانا، ہسپتال چلانا، اور سڑکیں بنوانا وغیرہ، اسی طرح یہ کہنا کہ حکومت جب دیگر مذاہب کے ماننے والوں کو ان کے مذہبی تہواروں میلوں کے لیے رعایتیں دیتی ہے تو مسلمانوں کو بھی وہ رعایتیں حاصل کرنی چاہیے کہاں تک صحیح ہے؟ مسلمانوں کی اپنی ایک شان ہے اس کا امتیاز ہے دوسروں کی نقالی کرنا بالخصوص فریضۂ اسلام کی ادائیگی میں اس کو کیا زیب دیتا ہے؟

ملت کا ایک طبقہ کہتا ہے کہ حج کے لیے مسلمانوں کو شرائط کی روشنی میں خود کفیل ہونا چاہیے تکلفات، احسانات اور بالخصوص حکومت کے زیر احسان حج کرے، یہ امر

روح اسلام کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔

پتہ نہیں یہ Subsidy صرف ہمارے سیکولر ملک میں ہے یا دیگر اسلامی ممالک میں بھی اس کی نظیر پائی جاتی ہے؟ حضرات علمائے کرام سے مؤدبانہ درخواست ہے کہ کتاب وسنت کی روشنی میں جواب مرحمت فرمائیں۔

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

حضرات فقہاء نے حج کے لیے چار قسم کی شرائط بیان کی ہیں: ① شرائط وجوب حج ② شرائط وجوب ادا ③ شرائط صحت ادا ④ حج کے فرض کی جگہ واقع ہونے کے شرائط۔ (عمدۃ الفقہ ۴/۲۷)

وهی انواع ای اربعة: شرط الوجوب، وشرط الاداء، وشرط صحة الاداء، وشرط وقوعه عن الفرض. (مناسك ملا علی قاری ص۴۱)

حج کی شرطوں کی پہلی قسم شرائط وجوب حج ہے، اور یہ وہ شرطیں ہیں کہ جب کسی شخص میں وہ سب شرطیں پائی جائیں، تو اس پر حج فرض ہو جاتا ہے، اور اگر وہ تمام شرطیں یا ان میں سے کوئی ایک شرط بھی نہ پائی جائے تو اس پر حج بالکل فرض نہیں ہوتا، اس پر خود ادا کرنا بھی فرض نہیں ہوتا، اور زندگی میں کسی دوسرے سے حج کرانا یا مرتے وقت وصیت کرنا بھی اس پر واجب نہیں ہوتا۔

(النوع الاول) ای من انواع شرائط الحج (شرائط الوجوب) وهی التی اذا وجدت جميعها وجب الحج علی صاحبها، واذا فقد واحد منها لایجب اصلاً، لا بالنيابة، ولا بالوصاية. (مناسك ملاعلی قاری ص۴۲)

ان ہی شرائط وجوب میں سے چھٹی شرط استطاعت ہے۔ استطاعت سے

مراد یہ ہے کہ زادِراہ (توشہ) اورراحلہ (سواری) پراس طرح قدرت ہوکہ وہ اس کا مالک ہو یا کرایہ پرلے کرقابض ہو، اوراگر مانگ کر یااس کے مباح ہونے کی وجہ سے قادرہوا ہوتواس سے حج فرض نہیں ہوتا، خواہ وہ اس شخص نے مباح کیا ہوجس کا اس پراحسان شمارنہیں ہوتا جیسے ماں، باپ، اوراولاد، یاان کے علاوہ کسی اورنے مباح کیا ہو، جیسے اجنبی لوگ۔

(السادس الاستطاعة) وهى شرط الوجوب لاشرط الجواز (وهى ملک الزاد) اى النفقة فى المأتى والمعاد (والتمكن من الراحلة) اى الاقتدارعلى ركوب المركوب حيث شاء. (مناسك ص۲۷)

(ولاتثبت الاستطاعة ببذل الغير) اى باعطاء غيره له (مالاً) اى قدر زاد و راحلة، (اوطاعة) اى خدمة لمن يحتاج اليهافى الطريق كالزمن، (ملكاً) اى من جهة التمليك فى المال والخادم، (أوباباحة) اى بالاعارة فى الخادم والراحلة او بالاجارة فى استعمال الزادمن المال، فان ثقل المنة تدفع حصول الاستطاعة (مناسك ص۳۰)

لايجب عليه القبول عندنا (مناسك ص۳۱) قوله لايجب عليه القبول، لان شرائط اصل الوجوب لايجب عليه تحصيلهاعند عدمها، قاله فى البحرالرائق اه حباب قال العلامة طاهرسنبل وكذا لاتثبت الاستطاعة ببذل غيره الزادوالراحلة حتى لايجب عليه الحج عندنا (شرح لباب ص۳۱)

منها: ملك الزاد والراحلة فى حق النائى عن مكة، والكلام فيه فى موضعين احدهمافى بيان انه من شرائط الوجوب، والثانى فى تفسير الزاد والراحلة، اما الاول فقد قال عامة العلماء انه شرط، فلايجب

الحج باباحة الزاد والراحلة، سواء كانت الاباحة ممن له منّة على المباح له، اوكانت ممن لا منة له عليه كالاب. (بدائع ۲/ ۱۲۲)

اگر کسی نے اس کو مال دیا کہ اس سے حج کرلے تو اس پر اس کا قبول کرنا واجب نہیں، اس لیے کہ جب وجوب کی شرطوں میں سے کوئی شرط نہ پائی جائے تو اس کا حاصل کرنا اس پر واجب نہیں۔ (عمدۃ الفقہ ۴/ ۳۳)

''فتاویٰ محمودیہ'' سے ایک سوال وجواب نقل کیا جاتا ہے:

سوال: حکومتِ ہند موسمِ حج میں حاجیوں کی دیکھ بھال کے لیے ویلفیر آفیسر بنا کر کسی کو منتخب کر کے اس کے تمام مصارف برداشت کرتی ہے، اور اس کے لیے بقدر ضرورت تمام رقم پیشگی دے دیتی ہے، وہ منتخب آفیسر اپنے فرائض انجام دینے کے ساتھ ساتھ حج بیت اللہ بھی ادا کر لیتے ہیں، ان کا یہ حج کیسا ہوگا؟ اس کا وہ حج فرضیت حج میں شمار ہوگا یا نفل؟ کیا حکومت نے جب رقم دی اس وقت وہ صاحب نصاب شمار نہیں ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً: جب کوئی شخص خود صاحب نصاب نہیں جس سے اس پر حج فرض ہو، یعنی زادراہ پر قادر نہیں؛ مگر وہ پیدل پہنچ جائے، یا کوئی شخص اس کو اپنے ساتھ لے جائے، یا کسی نے اس کو روپیہ دیدیا جس سے وہ وہاں پہنچ گیا اور حج ادا کرلیا تو اس کا حج ادا ہوجائے گا۔ پھر غنی ہوجانے پر اس کے ذمہ دوبارہ حج فرض نہیں ہوگا۔

''الاشباہ والنظائر'' میں ہے: کہ کسی فرض کی ادائیگی کے لیے جو شرائط ہوں ان کی تحصیل مقصود نہیں بلکہ جب ان کا حصول ہوجائے خواہ کسی طریقہ سے ہو تو بھی کافی ہے، مثلاً نماز کے لیے طہارت شرط ہے، ایک شخص بلا اختیار نہر میں گر گیا پانی اس

کے بدن پر پہنچ گیا اور بہہ گیا، پھر اس نے نماز پڑھی تو اس کی نماز ہو جائے گی، یہ نہیں کہا جائے گا کہ اس نے اپنے قصد سے وضو نہیں کیا اس لیے اس کی نماز نہیں ہوئی، اسی طرح یہاں بھی اس کا حج ہو جائے گا۔ (فتاویٰ محمودیہ ۱۷/ ۲۱۲)

ہمارے ملک ہندوستان میں سینٹرل کمیٹی (جو حکومت کا ایک ادارہ ہے) حج کے لیے جانے والوں کے لیے ضروری انتظامات کرتی ہے، اس کے واسطے سے حج کے لیے جانے والے ہر شخص کے کرایہ میں سبسڈی کے نام سے ایک مخصوص رقم ادا کرتی ہے، اور اس کی طرف سے ہوائی کمپنی کو جو مجموعی کرایہ ادا کیا جاتا ہے وہ تقریباً ۳۵ ہزار روپے ہوتا ہے، جب کہ حکومت کا یہ ادارہ حاجیوں سے کرایہ کے نام پر صرف ۱۲ ہزار روپے وصول کرتا ہے، جس کا مطلب یہ ہوا کہ بقیہ ۲۳ ہزار روپے کرایہ کے طور پر حاجی کی طرف سے حکومت ادا کرتی ہے، اس صورت حال کے پیش نظر یہاں پر کئی مسائل کا حل اور وضاحت ضروری ہو جاتی ہے۔

① اگر حج کا ارادہ رکھنے والے کسی شخص کے پاس اتنی رقم موجود ہو کہ حکومت کی مذکورہ مدد کے بغیر وہ زاد اور راحلہ پر قدرت نہیں رکھتا، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وجوب حج کے شرائط میں سے چھٹی شرط استطاعت اس میں پائی نہیں جاتی؛ اس لیے اس پر شرعاً حج فرض نہیں ہوتا؛ لیکن اس کے باوجود اگر وہ حج کمیٹی کے ذریعہ سفر کر کے حج ادا کرلے گا، یعنی حکومت کی طرف سے دی جانے والی اس مدد کو قبول کر کے حج کر لے گا تو اس کا فریضۂ حج ادا ہو جائے گا، بشرطیکہ اس نے احرام کے وقت حج فرض یا مطلق حج کی نیت کی ہو، نفل یا نذر کی نیت نہ ہو، اب اگر اس کے بعد اس کے پاس اتنا مال آ گیا کہ حکومت کی مدد کے بغیر بھی زاد و راحلہ پر استطاعت حاصل ہو گئی تب بھی

دوبارہ حج کے لیے جانا ضروری نہیں، اس صورت میں اگر وہ حج کمیٹی کے واسطہ سے سفر کرنا پسند نہ کرے اور حج نہ کرے تب بھی گنہگار نہیں، اور نہ ہی اس پر بوقت وفات وصیت کرنا ضروری ہے۔

(۲) اگر کسی شخص کے پاس حوائج اصلیہ کو چھوڑ کر اتنی رقم موجود ہو کہ حکومت کی مذکورہ مدد کے بغیر بھی وہ زاد و راحلہ پر قدرت رکھتا ہے، تو اس پر حج فرض ہو جاتا ہے، اس کے بعد اگر وہ حج کمیٹی کے ذریعہ سفر کی شکل اختیار کر کے حج ادا کرے گا، یعنی حکومت کی طرف سے دی جانے والی اس مدد کو قبول کر کے حج کر لے گا، تو اس کا فریضۂ حج ادا ہو جائے گا۔

صورتِ مذکورہ میں اگر وہ شخص حج کمیٹی کے واسطہ سے سفر نہ کرتے ہوئے اپنے طور پر سفر کا انتظام کرتا ہے تب بھی اس کا فریضۂ حج ادا ہو جائے گا، اور اگر یہ سوچ کر کہ حج کمیٹی کی قرعہ اندازی میں نام نہیں نکلا حج کے لیے نہیں گیا تو گنہگار ہوگا، اور اگر موت تک حج ادا کرنے کا موقع نہ ملا تو اس پر بوقت وفات اپنی طرف سے حج فرض ادا کرنے کی وصیت کر جانا ضروری ہے۔

اوپر کی تفصیلات سے یہ بات تو واضح ہوگئی کہ چاہے حکومت کی امداد کے بغیر اس کے لیے حج کرنا ممکن نہ ہو یا ہو، دونوں صورتوں میں اگر اس نے حج کمیٹی کے ذریعہ سفر والی شکل اختیار کر کے حج ادا کیا، تو بلا شک وشبہ اس کا حج درست ہو جائے گا، اور اگر یہ زندگی میں پہلی مرتبہ حج کر رہا ہے، اور بوقت احرام حج فرض یا مطلق حج کی نیت بھی کر رہا ہے تو اس کا فرض حج بھی ادا ہوا سمجھا جاوے گا؛ لیکن یہاں پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس کے لیے حکومت کی اس امداد کو قبول کرنا مناسب ہے یا نہیں؟

فقہاء نے استطاعت والی شرط وجوب پر کلام کرتے ہوئے اس بات کی تصریح

کی ہے، کہ اگر کوئی شخص کسی کو بطور اباحت زاد و راحلہ دے رہا ہے، یعنی اس کو زاد و راحلہ کا مالک نہیں بنا رہا ہے بلکہ ایسی صورت اختیار کی جارہی ہے جس میں وہ شخص مالک بنے بغیر زاد و راحلہ سے فائدہ اٹھا کر حج کر سکتا ہے تو اس صورت میں اس پر حج فرض نہیں، چاہے وہ شخص جو بطور اباحت زاد و راحلہ دے رہا ہے وہ ان لوگوں میں سے ہو جس کا یہ سلوک احسان شمار نہیں ہوتا، مثلاً باپ بیٹے یا بیٹا باپ کے ساتھ یہ معاملہ کرے، اور چاہے وہ شخص ان لوگوں میں سے ہو جس کا یہ سلوک احسان شمار ہوتا ہے، مثلاً باپ، بیٹے کے علاوہ اور کوئی اجنبی شخص ایسا سلوک کر رہا ہو۔

اسی طرح فقہاء نے اس بات کی بھی تصریح کی ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے کو زاد و راحلہ بطور تملیک دے رہا ہو، اس صورت میں اگر اس نے قبول کر لیا تو اس پر حج فرض ہو جائیگا؛ لیکن اس کے لیے اس کو قبول کرنا ضروری نہیں، چاہے دینے والا ان لوگوں میں سے ہو جس کا دینا احسان شمار نہیں ہوتا، اور چاہے ان لوگوں میں سے ہو جس کا دینا احسان شمار ہوتا ہے۔ اس مسئلہ کو بیان کرتے ہوئے ''مناسک ملا علی قاری'' میں ایک جملہ یہ لکھا ہوا ہے: فان ثقل المنة تدفع حصول الاستطاعة (ص:۳۰)

اس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ ایسے شخص کے بطور تملیک دینے پر جس کا دینا احسان شمار ہوتا ہو قبول کرنا مناسب نہیں، چہ جائیکہ اس کا یہ دینا بطور اباحت ہو، اس لیے حکومت کی طرف سے دی جانے والی یہ امداد جب کہ حکومت غیر مسلمہ ہونے کے ساتھ اس کو اپنے احسان کے طور پر علانیہ بیان کرتی ہے، قبول کرنا غیرت ایمانی کا تقاضہ نہیں؛ البتہ حکومت کی یہ امداد واقعۃً کس درجہ میں احسان بنتی ہے یہ بھی قابل غور ہے، اس سلسلہ میں ایک جانکار کا مضمون جو اردو ٹائمز (بمبئی) کے حوالہ سے ندائے شاہی میں

شائع ہوا تھا ضرور پڑھ لیں ①۔ اور اس مضمون کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ فیصلہ کریں کہ

① حج سبسڈی کے عنوان سے مرکزی حکومت اور اس کے زیر اقتدار سرکاری ادارے سینٹرل حج کمیٹی کی جانب سے اوندھے سیدھے اقدامات کیے جارہے ہیں جو مسلمانوں اور خاص طور پر عازمین کے لیے تشویش اور فکر کا باعث ہے، جہاں تک ہوائی جہاز کے کرائے میں سبسڈی کا سوال ہے، حکومت ہند نے بحری جہازوں کے ذریعے ہندوستانی مسلمانوں کے ایک ہزار سالہ قدیم ذریعۂ سفر حج کو بند کرنے کے عوض ہرجانہ کے طور پر سبسڈی شروع کی تھی۔

اول تو یہ ہے کہ یہ سبسڈی نہیں، بحری جہاز کے ذریعے سفر حج ختم کرنے اور عازمین حج کو بذریعہ طیارہ سفر حج کرنے پر مجبور کرنے کے لیے حکومت ہند تب سے ہرجانہ ادا کررہی ہے، جب سے ہوائی جہاز سے تمام ہندوستانی عازمین کی روانگی ہورہی ہے۔

دوئم یہ کہ سبسڈی کے نام سے ہندوستانی مسلمانوں اور عوام سے دھوکہ دہی کی جارہی ہے کہ سبسڈی کی رقم اتنی ہرگز نہیں ہوسکتی کہ جتنی بتائی جارہی ہے، آج پرائیویٹ ٹور آپریٹرس ۲۸/ ہزار روپیوں میں حجاج کرام کو جدہ، ہندوستان۔ جدہ پہنچادیتے ہیں یہ ٹور آپریٹر ایک آدھ ٹکٹ کا چارج ۲۸/ ہزار روپئے کررہے ہیں، جب کہ ایئر انڈیا جس نے ۷۲/ ہزار عازمین حج کے ائیر ٹکٹوں کو اپنی مونوپولی بنادیا ہے، وہ حکومت ہند سے فی حاجی ۳۲/ ہزار تا ۳۶/ ہزار روپئے چارج کررہی ہے۔ یہ زیادتی ہے، دھوکہ بازی ہے، گھپلہ ہے، کیوں کہ ۷۲/ ہزار مسافروں کے ہند، جدہ، ہند واپسی کے ایئر ٹکٹوں کا اگر بین الاقوامی ٹینڈر منگوایا جائے تو اس کرایہ کی رقم پرائیویٹ آپریٹروں کے کرائے (۲۸/ ہزار) سے بھی بہت کم ہوجائے گی، حکومت ہند کا ادارہ (ایئر انڈیا) حجاج کرام کو مارکیٹ سے کہیں زیادہ چارج کرکے کروڑوں روپئے ہر سال منافع کمارہا ہے، اور حکومت ہند سبسڈی کا احسان کا خواہ مخواہ بوجھ ہندوستانی حجاج کرام اور ہندوستانی مسلمانوں پر لاد رہی ہے، گھی کہاں گیا؟ کھچڑی میں، کھچڑی کون کھارہا ہے؟ مرکزی حکومت کے عہدیداران وافسران۔ روپیہ جارہا ہے حجاج کرام کا، احسان جتایا جارہا ہے ہندوستانی مسلمانوں پر، اب اس ریاکاری کے سلسلہ کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنا ضروری ہے، اس لیے ہندوستانی مسلمانوں کو صاف موقف اپنالینا چاہیے کہ حکومت ہند حج سبسڈی (جو کہ اصلاً تو سبسڈی نہیں ہے اگر سبسڈی مان لی جائے تو بحری جہاز بند کرنے کا جرمانہ ہے) ختم کرنا چاہتی ہے، تو پھر تمام ۷۲/ ہزار حجاج کرام کو سبسڈی دینا بند کردے؛ لیکن اس کے عوض مندرجۂ ذیل اقدامات کرنے کے لیے بھی حکومتِ ہند آمادہ ہوجائے۔

(ا) عازمین حج کے لیے بحری جہازوں کا سلسلہ پھر سے شروع کیا جائے، یا پھر پرائیویٹ شپنگ کمپنیوں کو حجاج کرام کے لیے سروس شروع کرنے کی اجازت دی جائے، اگر حکومت ہند کراچی سے ممبئی لانچ سروس دوبارہ شروع کرنے پر غور کرسکتی ہے تو پھر ہندوستانی حجاج کرام کے لیے بحری جہاز دوبارہ کیوں شروع نہیں کیے جاسکتے؟ یہاں یہ واضح ←

امداد کی اتنی بڑی مقدار جو بتلائی جارہی ہے واقعۃً قابل تسلیم ہے؟ نیز حکومت نے ہندوستان سے حج کے لیے جانے والے حضرات کو ہوائی سفر کا پابند بنایا، کیا اس کا یہ اقدام ان کے حقوق شہریت کے منافی تو نہیں؟ نیز اگر حاجیوں کے سفر پر سے ایئر انڈیا کا اجارہ اٹھا دیا جائے؛ نیز بحری جہازوں کی بھی اجازت دے دی جائے تب بھی کیا

⬅ ہو کہ سعودی حکومت نے بھی بحری جہازوں پر پابندی عائد نہیں کی ہے، اور جدہ کی بندرگاہ پر آج بھی عازمین حج کو لے کر بحری جہازوں کے اترنے کی اجازت ہے۔

(۲) ہوائی سفر سے جدہ جانے والے عازمین کے لیے ایئر انڈیا نے جو مونو پولی کر رکھی ہے اسے ختم کیا جائے، جس طرح زر مبادلہ کا ٹھیکہ ہر سال کھلے عام نیلامی یا ٹینڈر کے ذریعہ دیا جاتا ہے، اور عازمین حج کو دیے جانے والے زر مبادلہ میں اسٹیٹ بینک آف انڈیا کی مونو پولی یا اجارہ داری ختم کر دی گئی ہے، اسی طرح ہوائی سفر میں ایئر انڈیا کی مونو پولی ختم کی جائے۔

(۳) دورانِ حج مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں ۲۷/ ہزار رہائشی یونٹوں اور عمارتوں کو کرائے پر لینے کے کام میں ہندوستانی وزارت خارجہ (حج سیل) اور ہندوستانی سفارت خانہ (جدہ) کے افسران نے بھی اجارہ داری (مونو پولی) قائم کر رکھی ہے، اور یہ معاملہ شفاف نہیں ہے۔ رہائشی عمارتوں کو کرائے پر لینے کی اجارہ داری بھی ختم کی جائے، اور اسے شفاف بنایا جائے، بس یہ تین اقدامات ہی کر دیے جائیں، تو پھر ہندوستانی مسلمانوں کو ایک کوڑی سبسڈی یا نام نہاد سبسڈی کی ضرورت باقی نہیں رہ جائے گی۔

(۴) ممبئی سمیت ملک کے جتنے شہروں پر سنٹرل حج کمیٹی اور ریاستی حج کمیٹیوں نے غاصبانہ قبضہ کر رکھا ہے اسے فوراً ختم کیا جائے اور ان حج ہاؤسز کو ایک مسلم ٹرسٹ تشکیل دے کر اس کے سپرد کیا جائے، سینٹرل حج کمیٹی اور دیگر تمام صوبوں کی ریاستی حج کمیٹیاں جو اپنے دفاتر ان حج ہاؤسز میں قائم رکھے ہوئے ہیں اپنے دفاتر کا کرایہ ہندوستانی حجاج ٹرسٹ کو ادا کریں۔

(۵) ہندوستانی حجاج ٹرسٹ کے حوالے حج سیزن کے ذریعہ زر مبادلہ فکسڈ ڈپازٹ عطیات حج ہاؤسز کے کرائے ہونے والی مکمل آمدنی کی جائے اور اس آمدنی سے حاجیوں کو کرائے میں سبسڈی دی جائے۔ سبسڈی کی ہندوستانی مسلمان از خود سرمایہ کاری (Self Financing) کر سکتے ہیں، حکومت سے مسلمانوں کو سبسڈی کی بھیک مانگنے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔ (ماہنامہ ندائے شاہی جنوری ۲۰۰۸ء از قلم سعید احمد اردو ٹائمز کے خصوصی نامہ نگار)

حکومت کے اس بار احسان کو اٹھانے کی ضرورت رہے گی، آپ حضرات اپنے صوبہ کے ذمہ داروں میں سے ہیں ایسا نہ ہو کہ اس احسان کو قبول نہ کرنے کے عنوان سے آپ کے ذریعہ حجاج کرام کو ملنے والی سہولت تو ختم ہو جائے؛ لیکن ان کا جو استحصال حکومت کی طرف سے ہو رہا ہے اس کا کوئی مداوا نہ ہو۔

آپ نے جو تحریر فرمایا ہے: ''ملت کا ایک طبقہ کہتا ہے: حج کے لیے مسلمان کو شرائط کی روشنی میں خود کفیل ہونا چاہیے، تکلفات، احسانات اور بالخصوص حکومت کے زیرِ احسان حج کرے، یہ امر روح اسلام کے خلاف ہے'' جو طبقہ یہ کہتا ہے اس کو چاہیے کہ خود کفیل ہونے کے اسباب اختیار کرے، اس میں کامیابی ہونے کے بعد حکومت کے سبسڈی والے احسان کو قبول نہ کرے، کہیں ایسا نہ ہو کہ روح اسلام والے حج کے حصول میں حجاج کرام کی ایک معتد بہ تعداد نفس حج سے محروم ہو جائے۔

دیگر یہ کہ آپ نے سبسڈی کے نام سے دی جانے والی رقم کے متعلق شبہ ظاہر فرمایا، کہ یہ امر بھی تحقیق طلب ہے کہ وہ رقم کہیں مشکوک تو نہیں؟ حکومت Subsidy آخر کس مد سے دیتی ہے؟ اس سے زیادہ تحقیق طلب بلکہ ذمہ داران حج کمیٹی کا فرض منصبی ہے کہ وہ حکومت کے اس دعویٰ کہ وہ ہر ایئر لائنس کو فی کس 770 ڈالر تقریباً 35000 روپے ادا کرتی ہے، کی صحت وصداقت کو ایئر کمپنیوں کے کرایوں کی شرح اور چارٹر جہازوں میں ملنے والی خصوصی رعایت وغیرہ اصولوں کے مطابق جانچیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

املاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۷/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۷ھ
الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ

عورت اور محرم کے مسائل

اکیلی عورت کا سفر حج اور حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا تفرد

سوال: ایک عورت پر حج فرض ہو گیا ہو اور کوئی مانع موجود نہ ہو، سوائے یہ کہ کوئی محرم سفرِ حج میں ساتھ جانے کے لیے نہیں ہے، تو کیا ایسی عورت اکیلی حج کر سکتی ہے؟ اس لیے کہ چند روز پہلے ''ملفوظات حضرت محدث کشمیری رحمۃ اللہ علیہ'' کا مطالعہ کرنے سے یہ بات معلوم ہوئی کہ عورت اس صورت میں بھی حج کر سکتی ہے، جس کی تفصیلی عبارت اس خط کے ساتھ ارسال ہے۔ فتاویٰ قاضی خان میں لکھا ہے کہ: فقہائے کرام کا اجماع ہے کہ ضعیف و کمزور عورت بھی بلا محرم سفر نہ کرے۔

ولا تثبت الاستطاعة للمرأة إذا كان بينها وبين مكة مسيرة سفر - شابة كانت أو عجوزة- إلا بمحرم (فتاویٰ ۸/۳۰۷) عن ابن عباس أن رسول الله ﷺ قال: لا تحجّن امرأة إلا ومعها ذو محرم (رواه الدار قطني: ۲٤٤٠)

الجواب: حامداً ومصلياً ومسلماً

آپ نے ''ملفوظات حضرت کشمیری رحمۃ اللہ علیہ'' کی تین نقول ارسال فرمائی ہے، اس میں جو کچھ بھی تحریر ہے وہ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق ہے، جامع ملفوظات حضرت مولانا بجنوری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی صرف احتمالی درجہ میں لکھا ہے: ''ایسی صورت میں امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک بھی ضرور دیگر ائمۂ مجتہدین کے موافق ہی ہوگا''؛ لیکن فقہِ حنفی کے اتنے بڑے ذخیرے میں سے کسی ایک کتاب سے بھی اپنے اس احتمال کی تائید میں دو جملے پیش نہیں فرمائے؛ اس لیے آپ کے مرسلہ ان تینوں صفحات میں پیش

کی گئی ساری باتوں سے اثر لینے کی ضرورت نہیں، اس کو حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے تفرد پر محمول کریں گے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

أملاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۲ / جمادی الاولیٰ ۱۴۲۹ھ

الجواب صحیح: عباس داود بسم اللہ

عورت کا بلا محرم اپنی سہیلیوں کے ساتھ حج میں جانا

سوال : ہماری والدہ محترمہ بیت اللہ شریف کی زیارت (حج یا عمرہ میں جانے) کی تمنا کر رہی ہیں؛ مگر کم نصیبی کہ مالی حالت کمزور ہونے کی وجہ سے بلا محرم اپنی سہیلیوں کے ساتھ حج یا عمرہ کرلیا جائے تو کیا اجر وثواب کی مستحق ہوں گی؟ حالاں کہ میں محرم ہونے کی وجہ سے اماں کے ساتھ جانا چاہتا ہوں؛ مگر مالی حالت اس قدر کمزور ہے کہ میں ساتھ جانے سے قاصر ہوں، تو کیا والدہ محترمہ بلا محرم سہیلیوں کے ساتھ حج یا عمرہ میں جاسکتی ہیں؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

عورت کو دوسری عورتوں کے ساتھ بلا محرم (حج یا عمرہ کے لیے) جانا جائز نہیں۔ (معلم الحجاج: ۸۶) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد خانپوری عفی عنہ

جس عورت کا شوہر یا محرم نہ ہو وہ حج کس طرح کرے؟

سوال : وہ عورت جس کا شوہر یا کوئی بھی محرم نہ ہو اور وہ حج کرنا چاہتی ہو تو اس کی کیا صورت ہوگی؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

جس عورت کا کوئی محرم یا شوہر نہیں ہے اور وہ حج کرنا چاہتی ہے تو اس کی صورت یہ ہے کہ کسی نیک صالح مرد سے نکاح کر کے اس کے ساتھ جائے، چناں چہ ایک روایت کے بموجب فرض حج کے لیے نکاح کو واجب لکھا ہے اگر چہ وہ قول مختار نہیں۔

(شامی ۲/ ۱۵۸)(زبدۃ المناسک ۱/ ۲۲)

ایسی عورت جس پر حج فرض ہو چکا تھا؛ لیکن محرم یا شوہر نہ ہونے کی وجہ سے جا نہ سکی، اس کے لیے موت کے وقت وصیت کر جانا ضروری ہے کہ اس کی طرف سے حج بدل کرا دیا جائے۔(شامی ۲/ ۱۵۷) البتہ اگر وہ اتنی بوڑھی ہوگئی کہ بوڑھاپے کی وجہ سے سفر کے قابل نہیں رہی یا اپاہج بن گئی یا اندھی ہوگئی تو زندگی ہی میں کسی کو حج بدل کے لیے بھیج سکتی ہے، اگر اس سے قبل کسی کو حج بدل کے لیے بھیج دیا اور محرم وشوہر نہ ہونے والا اس کا یہ عذر وفات تک رہا تو درست ہے ورنہ نہیں۔(شامی ۲/ ۲۵۹) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد خانپوری عفی عنہ

بیوہ عورت اپنے رشتہ داروں کے ساتھ حج میں جا سکتی ہے؟

سوال: ایک بیوہ عورت حج کرنا چاہتی ہے جس کا کوئی محرم نہیں ہے اس کے رشتہ داروں میں سے تین جوڑے یعنی تین مرد اور تین عورتیں حج کو جا رہی ہیں، اس بیوہ عورت کا مردوں سے کوئی رشتہ نہیں ہے؛ البتہ عورتوں میں سے کوئی اس کی چچازاد بہن ہے وغیرہ وغیرہ تو کیا یہ بیوہ عورت ان کے ساتھ حج کا سفر کر سکتی ہے؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

عورت کی جائے سکونت سے حرم کا فاصلہ اگر مسافتِ سفر یعنی اڑتالیس میل اور

اس سے زیادہ کا ہے تو اس صورت میں ایسی عورت کسی محرم یا شوہر کے بغیر حج کے لیے نہیں جاسکتی۔ (درمختار علی ھامش الشامی ۲/ ۱۵۷) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد خانپوری عفی عنہ

عدت میں حج ادا کرنا اور وطن سے محرم بلانا

سوال: (۱) ایک شخص مع اپنی زوجہ کے فرض حج کے لیے گیا، حج اداء کرنے سے پہلے مکہ میں یا مکہ آنے سے پہلے راستہ میں شوہر کا انتقال ہو گیا، تو عورت کیا کرے؟ حج اداء کرے یا عدت میں بیٹھے؟ اور اگر عورت کے لیے عدت میں بیٹھنا ضروری ہو تو وہ عدت کہاں گزارے گی؟

(۲) شوہر کا مکہ میں انتقال ہو گیا اور زوجہ کے ساتھ کوئی محرم نہیں ہے، اگر وہ حج ادا کرسکتی ہے تو وہ دوسرے لوگوں کے ساتھ حج ادا کرسکتی ہے یا نہیں؟ (اور وہ عورت ایسی ہے کہ ان کے پاس اتنے روپیہ نہیں ہے کہ وہ محرم کو اپنے ملک سے بلائیں)۔

(۳) اگر عورت کے پاس اتنے روپئے ہوں کہ وہ محرم کو اپنے ملک سے بلا سکتی ہے، تو اس کے لیے اپنے ملک سے محرم کو بلانا ضروری ہوگا یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً

(۱) اگر مکہ میں شوہر کا انتقال ہو گیا تو اب وہ عدت میں بیٹھے، عدت کی حالت میں حج ادا نہیں کرسکتی، راستہ میں انتقال ہو گیا ہو تو واپس جا کر عدت گزارے۔

(۲) عدت کے دوران حج اداء نہیں کرسکتی، چاہے محرم ساتھ موجود ہو۔

(۳) اگر بحفاظت وہاں عدت گزارنا ممکن ہے تو محرم بلانا ضروری نہیں ہے؛ لیکن

عدت کے بعد واپسی کے سفر میں محرم ہونا چاہیے، اور اگر بحفاظت وہاں عدت گزارنا ممکن نہ ہو یا حکومت قیام کی اجازت نہ دیتی ہو تو محرم کو بلا کر اس کے ساتھ وطن لوٹ جائے اور وطن میں عدت گزارے۔

نوٹ: زبدۃ المناسک (۱/ ۲۴،۲۵) کا بھی مطالعہ کر لیجئے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۷/ محرم الحرام ۱۴۱۷ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ

بیمار محرم والی عورت کا حج بدل

سوال: ایک عورت معمرہ جس کا محرم بھائی ہے، اور اس کے پاس سفر حج کے لیے پوری رقم موجود ہے؛ لیکن محرم جو ہے وہ اتنا بیمار ہے کہ سفر سے لاچار ہے؛ بلکہ کوئی امید نہیں کہ وہ سفر کر سکے، وہ عورت جانتی ہے کہ جب تک محرم نہ ہو سرمایۂ سفر کے باوجود حج اس پر فرض نہیں ہے، اب اپنی حیاتی میں وصیت کرے کہ مرنے کے بعد حج بدل کے لیے کسی کو بھیجا جائے یا بجائے اس کے اپنی حیاتی میں ہی ایک آدمی کو حج کے لیے بھیج دے؟ کیا اگر اس طرح آدمی بھیج دیا تو اس کی طرف سے حج ہو گیا؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

اگر اس عورت کا اس بھائی کے علاوہ اور کوئی محرم نہیں ہے، اور ان کے اس بھائی کی یہ معذوری اس عورت کی وفات تک قائم رہی؛ نیز وفات تک اس عورت کو دوسرا کوئی محرم بھی میسر نہ آیا تو عورت کا کرایا ہوا یہ حج اس کی طرف سے کافی ہو جائے گا؛ ورنہ نہیں۔

شامی میں ہے: ومن العجز الذي يرجى زواله عدم وجود المرأة محرماً

فتقعد إلى أن تبلغ وقتا تعجز عن الحج فيه أي لِكِبَرٍ أو عمى أو زمانة فحينئذ تبعث من يحج عنها، اما لو بعثت قبل ذلك لا يجوز لتوهم وجود المحرم؛ إلا إن دام عدم المحرم إلى أن ماتت فيجوز كالمريض إذا أحج رجلا ودام المرض إلى أن مات كما في البحر وغيره (۲/۲۵۹، بحر الرائق ۳/٦٦ فتاوى قاضيخان على هامش الهندية ۱/ ۳۰۸،۳۰۹) **فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔**

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۰/ ربیع الثانی ۱۴۱۷ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

معمر عورت کا محرم کے بغیر سفرِ حج کرنا

سوال: امینہ ایک معمرہ عورت ستر (۷۰) سال کی عمر ہے، وہ بغیر محرم کے حج بیت اللہ جاسکتی ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً ومصلياً ومسلماً

عورت چاہے جوان ہو یا معمر؛ شوہر یا محرم کے بغیر سفر حج نہیں کرسکتی بشرطیکہ مکہ مکرمہ اس کے وطن سے شرعی مسافت سفر پر واقع ہو۔

درمختار میں ہے: ولو عجوزا فی سفر، قال فی الشامیة: (قوله و لو عجوزا) ای لاطلاق النصوص بحر قال الشاعر:

لكل ساقطة فى الحى لاقطة		وكل كاسده يوما لها سوق

(قوله فى سفر) هو ثلاثة أيام ولياليها الخ (درمختار مع الشامی ۲/ ۱۵۸) **فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔**

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۳/ جمادی الاخریٰ ۱۴۱۸ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

منہ بولے بیٹے کے ساتھ سفرِ حج کرنا

سوال: فاطمہ نے ایک بچہ کو بچپن سے پال پوس کر بڑا کیا اور اس کو منہ بولا بیٹا بنایا، اب فاطمہ اس کو اپنے ہمراہ حج کو لے کر جا رہی ہے، کیا یہ شرعاً درست ہے؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

منہ بولا بیٹا بنا دینے سے وہ لڑکا فاطمہ کا حقیقی بیٹا نہیں بنا ہے، اس لیے اگر اس کے ساتھ فاطمہ کا دوسرا کوئی رشتۂ حرمت نہیں ہے تو فاطمہ اس کے ساتھ سفرِ حج میں نہیں جا سکتی۔

قال اللہ تعالیٰ: ﴿وَمَا جَعَلَ اَدْعِيَآءَ كُمْ اَبْنَآءَ كُمْ ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِاَفْوَاهِكُمْ﴾ (الاحزاب:٥) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد خانپوری عفی عنہ

عورت کا اپنے خسر کے ساتھ حج کے لیے جانا

سوال: بیوہ بہو اپنے سسرے کے ساتھ حج بیت اللہ کے لیے جا سکتی ہے؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

اگر فتنہ کا اندیشہ نہ ہو تو جا سکتی ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ١٧ر شعبان ١٤١٦ھ

داماد کے ساتھ حج

سوال: حورا بہن اور حورا بہن کی ماں حورا بہن کے داماد (جمائی) کے ساتھ حج کرنے کے لیے جا سکتے ہیں؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

حورا بہن اوران کی ماں حورا بہن کے داماد کے ساتھ حج میں جاسکتی ہیں۔اس لیے کہ وہ داماد دونوں کے حق میں محرم ہے۔

وحرم بالمصاهرة بنت زوجته الموطوئة و ام زوجته وجدتها مطلقا بمجرد العقد الصحيح الخ (در مختار)(و جدتها مطلقا) اى من قبل ابيها و امها وان علون بحر (شامی ۲/۳۰۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۹/ جمادی الاخری ۱۴۱۴ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

باب الرمي

تیرھویں کی رمی مغرب کے بعد کرنا

سوال: کسی حاجی نے تیرھویں ذی الحجہ کو منیٰ میں قیام کیا؛لیکن اس نے رمی مغرب کی نماز کے بعد کی تو کیا رمی ادا ہو جائے گی یا دم آئے گا؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

جی ہاں، دم واجب ہوگا۔(زبدۃ المناسک ۱/۱۹۱)

املاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۱/ محرم الحرام ۱۴۲۵ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ

چوتھے دن تک رمی کی تاخیر اور وجوبِ دم میں مفتیٰ بہ قول

سوال: رمی جمار کے متعلق ایک مسئلہ کی تحقیق کے سلسلہ میں ایک عریضہ ارسال کر رہا ہوں، امید کہ تفصیلی جواب مرحمت فرما کر مشکور فرمائیں گے۔

(۱)وفی الاصل لوترك رمی الجمار كلها فی سائرالایام الی الیوم الرابع قضاها علی التالیف فی الیوم الرابع؛لان وقت الرمی باق؛ والجنس واحد (المحیط البرهانی۴۱۰/۳الفصل الثالث تعلیم اعمال الحج كتاب المناسك)

(۲)فعلی هذاالقول لواخررمی الجمارالثلاث عن یوم القرّالی یوم النفر الاول؛ رماهابعدطلوع الفجرقبل طلوع الشمس؛یكون اداءً لاقضاءً؛ ولا یلزمه دم. (البحرالعتیق فی مناسك المعتمروالحاج الی بیت الله العمیق؛ ۸۸۰۱/٤ الباب الثانی عشر فی الاعمال المشروعة یوم النحر. فصل فیما یفعله الحاج ایام التشریق ولیالیها)

(۳)فان ترك الرمی كله فی سائرالأیام الی آخرأیام الرمی وهو الیوم الرابع فانه یرمیهافیه علی الترتیب وعلیه دم عنده؛ وعندهمالادم علیه لما بیّنا أن الرمی مؤقت عنده وعندهمالیس بمؤقت.

(بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع ص: ۳۲٦ كتاب الحج، الكلام فی عدد الجمار)

(٤)ثم بتاخیرهایجب الدم عنده خلافاً لهما (شامی ۵۸٦/۳باب الجنایات)

(۵)لو اخر رمی الایام كلهاالی الرابع مثلاًرماهاكلهافیه قبل الزوال أو بعده علی التالیف قضاء عنده وعلیه دم واحدللتاخیر، واداء عندهما ولاشئ علیه. (غنیة جدیدص:۱۸۲-قدیم ص:۹۷)

ان عبارات مذکورہ سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص تینوں دن کی رمی ترک کردے اور چوتھے دن ان سب دنوں کی کنکری مار دے، تو امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک تو

ایک دم واجب ہوگا، اور حضرات صاحبین رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ بھی ادا ہے، اور اس پر کوئی دم نہیں۔

کیا حضرات صاحبین رحمۃ اللہ علیہ کا قول مفتی بہ ہے یا حضرت امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا؟ آج کے سخت ہجوم کے حالات میں کوئی شخص حضرات صاحبین رحمۃ اللہ علیہ کے قول پر عمل کرلے تو اس میں کراہت کا ارتکاب لازم آئے گا یا نہیں؟

الجواب: حامداً ومصلياً ومسلماً

اصول افتاء کے پیش نظر امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہی کا قول راجح اور مفتی بہ قرار دیا جائے گا۔

فی شرح المنية للبرهان ابراهيم الحلبي من فصل التيمم حيث قال فلله در الامام الاعظم ماأدق نظره وماأسدفكره والأمرماجعل العلماء الفتوى على قوله فى العبادات مطلقاً (شرح عقودرسم المفتی ص:۱۱۰)

"هداية السالك الى المذاهب الاربعة فى المناسك" میں ہے: وعند الحنفية: أنه يدخل وقت رمى جمرة العقبة بطلوع الفجريوم النحر؛ ويبقى الى غروب شمسه وفيما بعدذلك من الليل الى طلوع الفجرمن الغديجزئ الرمى مع الكراهة؛ولاشئ عليه وفيمابعدذلك من أيام التشريق ولياليها يجزئه، وعليه مع ذلك دم عندأبى حنيفة، ولاشئ عليه عند الصاحبين؛ وقدأساء (هداية السالك الى المذاهب الاربعة فى المناسك ۱۰۹۷/۳)

اس کے حاشیہ پر شیخ نورالدین عتر تحریر فرماتے ہیں: المفتى به عندالحنفية قول أبى حنيفة بوجوب الدم. (حاشیہ صفحہ مذکورہ) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

أملاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۷ رصفر المظفر ۱۴۳۰ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ		الجواب صحیح: عبدالقیوم راجکوٹی

خوف زحام کی بناء پر ترک رمی

سوال: وتجوز الانابة فی الرمی لمن عجز عن الرمی بنفسه لمرض أو حبس أو كبر سن أو حمل المرأة فيصح للمريض بعلة لا يرجى زوالها قبل انتهاء وقت الرمی و للمحبوس و كبير السن والحامل أن يوكل عنه من يرمى عنه الجمرات كلها و يجوز التوكل عن عدة أشخاص على أن يرمی الوكيل عن نفسه أولاً كل جمرة من الجمرات الثلاث.

(الفقه الاسلامی وادلته ۳ /۱۹۳)

سوال: زید نے رمی جمرات ثلثہ ۱۲ / تاریخ کو عورتوں کی طرف سے وکالۃً کی، کیوں کہ قافلہ چل رہا تھا، عورتوں کو رمی کرنا بہت دشوار تھا، یہ رمی صحیح ہوئی یا نہیں؟ بہ حالتِ عدمِ صحت دم واجب ہے یا نہیں؟

الجواب: رمی جمار واجب ہے، اور ترک واجب اگر بہ سبب کسی عذر کے ہو تو اس میں کچھ نہیں آتا۔ کمافی رد المحتار: وكذا كل واجب اذا تركه بعذر لا شیء عليه كما روى البحر، شامی و هكذا فی المناسك وغيره۔ پس اس صورت میں بہ سبب عذر ازدحام کے جو عورتوں کی رمی ترک ہوئی تو اس میں دم واجب نہ ہوگا۔ (فتاویٰ دار العلوم مدلل ومکمل ٦ / ۵۵۳، ۵۵۴)

لكن لو تركه بعذر كزحمة بمزدلفة لا شیء عليه (در المختار ۲/ ۵۱۲)

و قد صرحوا بأنه لو أفاض من عرفات لخوف الزحام وجاوز حدودها قبل الغروب لزمه دم مالم يعد قبله، و كذا لو ند بعيره فتبعه كما صرح به فی الفتح وقد يجاب بأن خوف الزحام لنحو عجز و مرض انما جعلوه عذرا هنا لحديث أنها قدم ضعفة أهله بليل، ولم

يجعل عذراً في عرفات لما فيه من اظهار مخالفة المشركين، فانهم كانوا يدفعون قبل الغروب فليتأمل. (وقوله لا شيء عليه) وكذا كل واجب اذا تركه بعذر لا شيء عليه كما في البحر.

(رد المحتار ۲/۵۱۱، ۵۱۲ مطلب في الوقوف بمزدلفة)

اب سوال یہ ہے کہ:

① آج کل جمرات پر دن یا رات کے کسی بھی وقت میں حتی کہ رات بارہ بجے ایک بجے بھی اتنا ہجوم اور ازدحام ہوتا ہے کہ کمزور ضعیف اور بوڑھی عورتوں کے لیے تو بسا اوقات جان کا خطرہ لاحق ہوجاتا ہے، اور یہ بالکل مشاہدہ کی بات ہے۔ جس طرح بہ ذات خود رمی کرنا واجب ہے اسی طرح یوم النحر کے افعال میں ترتیب بھی واجب ہے اور ترتیب قائم رکھنے میں جان کا خطرہ تو نہیں؛ لہٰذا ترتیب قائم رکھنے کی مشقت و تکلیف بہ ذات خود رمی کرنے کی بہ نسبت اخف اور کمتر ہے، اور مذکورہ بالا لوگوں کو بہ ذات خود رمی کرنے کی مشقت و تکلیف اس سے بدرجہا سخت تر ہے۔

جمعیت علماءِ ہند کی زیر نگرانی محمود ہال، دیوبند میں منعقد ہونے والے چھٹے فقہی اجتماع نیز اسلامک فقہ اکیڈمی کے تحت ہونے والے فقہی سمینار میں آج کل کے حالات میں ازدحام یا دیگر پریشان کن اعذار کی بناء پر یوم النحر کے افعال میں ترتیب قائم رکھ نہ سکنے کی صورت میں تیسیراً علی الناس دم واجب نہ ہونے کا فتویٰ دیا گیا۔ تو کیا خوفِ زحام اور دیگر پریشان کن اعذار کی بناء پر ضعیف، مریض، کبیر السن عورتوں اور مردوں کے لیے نیابت فی الرمی یعنی دوسرے کسی شخص کے ذریعہ رمی کرانا بغیر وجوبِ دم کے جائز ہے یا نہیں؟

(۲) بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ ترکِ وقوفِ مزدلفہ میں عجز ومرض وغیرہ کی بناء پر خوفِ زحام کو عذر قرار دیا جانا مذکورہ بالا حدیث (أنه ﷺ قدم ضعفة أهله بليل) کی بناء پر منصوص ہے، لہٰذا اس پر قیاس کر کے خوفِ زحام کو نیابت فی الرمی یا ترکِ رمی کے بارہ میں عذر قرار دے کر درج بالا لوگوں کے لیے نیابت فی الرمی یا ترکِ رمی جائز نہ ہوگا۔

از عبداللہ ڈیوزبری، انگلینڈ، یوکے

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

آپ کے سوال میں یہ عبارت ہے کہ ''آج کل جمرات پر دن یا رات کے کسی بھی وقت میں حتی کہ رات کے بارہ بجے ایک بجے بھی اتنا ہجوم اور ازدحام ہوتا ہے کہ کمزور ضعیف بوڑھی عورتوں کے لیے تو بسا اوقات جان کا خطرہ لاحق ہو جاتا ہے اور یہ بالکل مشاہدہ کی بات ہے'' جمرات کے پاس ہجوم کا ہونا اور اس ہجوم کا اتنی مقدار میں ہونا کہ اس حالت میں کمزور ضعیف اور بوڑھی عورتوں کے لیے جان کا خطرہ لاحق ہو جاتا ہے یہ تو درست ہے؛ لیکن ہجوم کی یہ کیفیت اور نوعیت رمی کے پورے وقت میں باقی نہیں رہتی، بلکہ رمی کے لیے شریعت کی طرف سے جو وقت مقرر ہے، مثلاً پہلے دن کی رمی کے لیے دسویں ذی الحجہ کی صبح صادق سے لے کر گیارھویں ذی الحجہ کی صبح صادق تک کا جو وقت مقرر ہے، اس میں بعض لمحات ایسے آتے ہیں کہ ان اوقات میں ہجوم کی وہی کیفیت ہوتی ہے جو آپ نے تحریر فرمائی ہے؛ لیکن اس پورے وقت میں مسلسل از ابتداء تا انتہاء یہ کیفیت نہیں ہوتی بلکہ اسی مقررہ وقت میں بہت سے لمحات ایسے بھی آتے ہیں کہ ان میں مذکورہ افراد بسہولت رمی کر سکتے ہیں؛ اس لیے سوال میں مذکور

آپ کا دعویٰ خلاف مشاہدہ ہے۔ رہی وہ عبارت جو سوال میں ''الفقہ الاسلامی وادلتہ'' کے حوالے سے نقل فرمائی ہے، اس میں اس بات کی تصریح نہیں کہ یہ حنفیہ کا مسلک ہے بلکہ فقہ حنفی کی معتبر کتابوں کے مطالعہ سے اس کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔

''غنية الناسك فی بغية المناسك'' جو ہمارے اکابر کے یہاں اس باب میں بہت مستند سمجھی جاتی ہے اس کی عبارت پیش خدمت ہے:

السادس: أن يرمی بنفسه فلا تجوز النيابة فيه عندالقدرة، وتجوز عند العذر فلو رمی عن مريض با مره أومغمی عليه ولو بغيرامره أو صبی أو معتوه أو مجنون جاز، والأفضل أن توضع الحصاة فی اكفهم فيرمونها أويرمو نه بأكفهم ولو رمی عنهم يجزيهم ذٰلك، ولا يعادان زال العذرفی الوقت ولا فدية عليهم وان لم يرموا الاالمريض

وحد المريض أن يصيربحيث يصلی جالسا لأ نه لايستطيع الرمی راكبا ولامحمولا، اماالأ نه تعذرعليه الرمی أو يلحقه بالرمی ضرر فان كان مريض له قدرة علی حضورالمرمی محمولا و يستطيع الرمی كذلك من غير أن يلحقه ألم شديد ولا يخاف زيادة المرض ولا بطوء البرء لا يجوز النيابة عنه الا أن لا يجدمن يحمله. (غنية الناسك ص١٠٠)

آگے تحریر فرماتے ہیں:

(تنبيه): قدتبين مما قدمنا أنهم جعلوا خوف الزحام عذرا للمرأة و لمن به علة أوضعف فی تقديم الرمی قبل طلوع الشمس أو تأخيره الی الليل، لافی جواز النيابة عنهم لعدم الضرورة، فلولم يرموا بأنفسهم لخوف الزحام تلزمهم الفدية والله سبحانه و تعالی أعلم (١٠٠)

یوم النحر کے افعال میں ترتیب کے سلسلہ میں فقہی اجتماع اور فقہی سمینار میں جو فیصلہ کیا گیا ہے اس میں جس قول کو اختیار کیا گیا ہے وہ مذہب احناف سے بالکلیہ خارج نہیں، بلکہ صاحبین رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہونے کے ساتھ ائمۂ ثلاثہ بھی اسی کے قائل ہیں اس کو اختیار کرنے کی وجہ سے مذہب حنفی سے بالکلیہ خروج لازم نہیں آتا اور یہ چیز آپ پر مخفی نہیں۔

بعض حضرات کی جو رائے آپ نے ترک وقوف مزدلفہ کے مسئلہ پر قیاس والی پیش کی وہ بھی سمجھ میں آنے والی نہیں، خود آپ نے جو عبارت پیش فرمائی ہے اس میں صراحت موجود ہے کہ اگر خوف زحام کی وجہ سے حدود عرفات کو قبل الغروب پار کر لیا تو دم واجب ہوگا، حالاں کہ نفس وقوف عرفات کا تحقق ہو چکا، صرف غروب آفتاب تک اس کو ممتد نہ کرنے کی وجہ سے دم واجب ہوا، اور سب جانتے ہیں کہ امتداد الی الغروب واجب ہے اور یہاں واجب چھوڑنے پر اگر چہ خوف زحام کی وجہ سے ہے دم لازم کیا گیا، اور خوف زحام کو سقوط دم کے لیے کافی نہیں سمجھا گیا۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

املاہ: العبد احمد خانپوری، ۳/محرم الحرام ۱۴۲۵ھ

رمی جمار ترک کرنے سے دم واجب ہوگا

سوال: کوئی شخص حج کو گیا جیسا کہ بمبئی سے ٹور لے جاتا ہے؛ لہٰذا ایام نحر میں سات کنکریاں جمرۂ عقبہ پر ماردی؛ مگر جلدی میں تین جمرہ پر کنکریاں نہ مار سکا، اب اسے یاد آیا کہ حج میں اس سے کوتاہی ہو گئی ہے؛ لہٰذا اب آپ بتائیے اس کا کفارہ کیا ہے؟ کیا حج ادا ہو گیا؟ اب اس کی استطاعت بھی نہیں ہے کہ دوبارہ حرم جائے۔ برائے مہربانی آپ کوئی راستہ بتائیں۔

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

صورت مسئولہ میں حج ادا ہو گیا؛ مگر چوں کہ حاجی نے تین جمرہ پر کنکریاں مارنا ترک کر دیا ہے؛ اس لیے حج میں نقص آنے کی بناء پر اس پر دم (قربانی کے لائق جانور کا حرم میں ذبح) لازم ہے؛ لہٰذا اسے چاہیے کہ یہ دم غرباء وفقراء پر صرف کرے اس میں سے مالداروں کو دینا یا اپنے لیے رکھنا جائز نہیں ہے۔ (عالمگیری ۱/ ۲۷۴)

حکم مذکور اس وقت ہے جب تک حاجی حرم شریف میں موجود ہو؛ لیکن اگر گھر آنے کے بعد جو جنایت کی ہے وہ یاد آئی، جیسا کہ سوال سے معلوم ہوتا ہے تو ایسی صورت میں اسے چاہیے کہ کسی کو وکیل بنا کر یا کسی بھی ذریعہ سے دم کی قیمت حرم شریف میں پہنچا دے، یہ کہہ کر کہ اس رقم سے ایک دم جنایت خرید کر ذبح کیا جائے اس کے بعد وہ سبکدوش ہو جائے گا ان شاء اللہ۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد خانپوری عفی عنہ

ہجوم کی وجہ سے مرد کا عورت کی طرف سے رمی میں وکیل بننا

سوال: حج کے ایام میں شیطان کو کنکری مارنے کے لیے زیادہ بھیڑ بھاڑ کی وجہ سے شوہر اپنی بیوی کی طرف سے وکیل بن کر کنکری مار سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

عورت کی طرف سے کسی دوسرے کو نائب بن کر ہجوم کی وجہ سے رمی کرنا (شیطان کو کنکری مارنا) جائز نہیں، اگر ہجوم کے خوف سے عورت نے رمی نہیں کی تو فدیہ واجب

ہوگا۔ (معلم الحجاج ص۱۸۶) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد خانپوری عفی عنہ

تیسرے دن کی رمی چھوڑ دی تو کیا حکم ہے؟

سوال: دو دن جمرات کی رمی کی اور تیسرے دن رمی نہیں کی تو اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

تیسرے دن سے مراد اگر بارہویں ذوالحجہ ہے، تو اس کی رمی چھوڑنے پر دم واجب ہوگا، اور اگر تیسرے دن سے مراد تیرہویں ذوالحجہ ہے، تو اگر وہ شخص بارہویں کے غروبِ آفتاب سے پہلے منیٰ سے مکہ چلا آیا تھا، اس پر تیرہویں کی رمی واجب نہیں ہوئی، اور یہ چلا آنا بلا کراہت جائز ہے، اور اگر بارہویں کے غروب آفتاب کے بعد تیرہویں کی صبح صادق سے پہلے منیٰ سے مکہ چلا آیا تھا تو اس صورت میں بھی تیرھویں کی رمی واجب نہیں ہوئی؛ لیکن یہ چلا آنا بکراہت جائز ہے؛ مگر جو تیرھویں کی صبح صادق منیٰ میں ہو گئی تو رمی تیرہویں کی واجب ہے اگر بدون کیے چلا آئے گا تو دم واجب ہوگا۔ (زبدۃ المناسک ۱۹۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد خانپوری عفی عنہ

رمی جمار، ذبح اور حلق میں ترتیب

سوال: حج کے دنوں میں یعنی ۱۰، ۱۱، ۱۲/ ذی الحجہ کو منی میں لاکھوں جانوروں

کی قربانی ہوتی ہے؛ مگر اس کے گوشت وغیرہ کا معقول انتظام نہ ہونے پر چند سال پہلے ان تمام جانوروں کا گوشت ضائع ہوجاتا تھا، اس سلسلہ میں سعودی حکومت نے ابھی چند سال ہوئے غریب ممالک میں پہونچانے کا انتظام کیا اور اس کے لیے منی میں ایک بڑا مذبحہ (SLAUGHTERHUOSE) بنا کر اس کی ساری ذمہ داری ایک مقامی کمپنی کے سپرد کی ہے، اس کمپنی کا طریقۂ کار یہ ہے کہ قربانی کرانے والے حضرات سے پیسے لے کر رسید دے دی جاتی ہے، جس میں قربانی، دم، صدقہ وغیرہ کی خانہ پُری کے ساتھ قربانی کرنے کا وقت بھی لکھ دیا جاتا ہے تاکہ جس قسم کی قربانی جس وقت کرانا چاہے وہ متعین ہوجائے، اس سلسلہ میں حنفی حاجی صاحبان ایک اندازہ لگاتے ہیں کہ اتنے بجے تک ہم رمی جمار سے فارغ ہوجائیں گے اس اندازے کے مطابق اپنی قربانی کرانے کی اجازت دے دیتے ہیں؛ مگر بعض مرتبہ رمی جمار میں گڑبڑ ہوجانے سے طے شدہ اندازے کے مطابق رمی جمار نہیں کرپاتے، حالاں کہ احناف کے نزدیک حج میں ترتیب واجب ہے اس کے خلاف ہوجانے سے بطور کفارہ مزید ایک جانور کی قربانی ضروری ہوجاتی ہے، تو کیا ہزاروں حنفی حضرات ان لاکھوں کے اضافی اخراجات سے بچنے کے لیے اگر صاحبین رحمۃ اللہ علیہ کے قول پر (ان کے یہاں ترتیب واجب نہیں) عمل کرلیں تو احناف کے یہاں کوئی گنجائش ہے؟ اس طرح ہر سال لاکھوں جانوروں کا گوشت بھی ضائع ہونے سے بچ جائے گا اور حاجی صاحبان کے لیے اس بھیڑ میں سہولت ہوجائے گی۔

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

تمتع اور قران کرنے والے کے لیے رمی، ذبح اور حلق کے درمیان امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ

کے قول پر جو مفتی بہ ہے ترتیب لازم ہے، اس کے ترک سے دم واجب ہوتا ہے، جبکہ صاحبین رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ ترتیب سنت ہے اس کے ترک پر دم واجب نہیں۔

آج کل حجاج از دحام یا دیگر پریشان کن اعذار کے پیش نظر اگر ترتیب قائم نہ رکھ سکیں تو صاحبین رحمۃ اللہ علیہ کے قول پر عمل کی گنجائش ہے۔

(چھٹا فقہی اجتماع بمقام شیخ الھند ہال دیوبند منعقدہ ۲۶،۲۷/ مارچ ۱۹۹۷ء)(انمول حج ۱۱۵)

اس فیصلہ کے متعلق مفتی عبدالرحیم لاجپوری رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں: آج کل بے پناہ ہجوم اور دیگر پریشان کن اعذار کے پیش نظر سقوط ترتیب کے متعلق آپ کا اور دیوبند کے فقہی اجتماع کا فیصلہ غلط تو نہیں؛ مگر یہ عام فتویٰ نہیں ہو سکتا، معذورین کے لیے مخصوص ہونا چاہیے استطاعت ہوتے ہوئے دم دینے میں احتیاط ہے۔

اس کے بعد مفتی صاحب نے رسائل الارکان، ہدایہ اولین، فتح القدیر کی عبارت تحریر کر کے لکھا ہے کہ: حج عمر بھر میں ایک مرتبہ (بطور فرض) ادا کیا جاتا ہے؛ اس لیے اس طرح ادا ہونا چاہیے جو اس کا حق ہے، لہذا نوجوان، صحت مند اور باہمت لوگ مفتیٰ بہ قول پر ہی عمل کرنے کی کوشش کریں، اور جو حضرات ضعیف، کمزور اور معذور ہوں اور وہ لوگ ہجوم اور اپنی معذوری کی وجہ سے مفتی بہ قول پر عمل کرنے سے قاصر ہوں، تو ایسے ضعیف اور معذور حضرات صاحبین رحمۃ اللہ علیہ کے قول پر عمل کر لیں تو اس کی گنجائش ہے۔اھ پوری تفصیل چھ صفحات پر مشتمل ہے۔ (فتاوی رحیمیہ ۱۰/ ۱۸۴تا۱۹۰)

علاوہ ازیں اس مشکل کا ایک حل یہ بھی ہے کہ آدمی افراد کر لے، کیوں کہ مفرد پر قربانی واجب نہیں۔

اسلامی فقہ اکیڈمی کے دسویں فقہی سمینار منعقدہ ۲۴ تا ۲۷ اکتوبر ۱۹۹۷ء میں

حج وعمرہ سے متعلق جو تجاویز پاس ہوئیں ان میں تجویز نمبر ۷ حسب ذیل ہے:

حنفیہ کے قول راجح کے مطابق ۱۰/ ذی الحجہ کے مناسک میں رمی، ذبح اور حلق کو ترتیب کے ساتھ انجام دینا واجب ہے۔ اور صاحبین رحمۃ اللہ علیہ اور اکثر فقہاء کے یہاں مسنون ہے جس کی خلاف ورزی سے دم واجب نہیں۔ حجاج کو چاہیے کہ جہاں تک ممکن ہو ترتیب کی رعایت کو ملحوظ رکھیں، تاہم ازدحام اور موسم کی شدت اور مذبح کی دوری وغیرہ کی وجہ سے صاحبین رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر ائمہ کے قول پر عمل کی گنجائش ہے؛ لہٰذا اگر یہ مناسک ترتیب کے خلاف ہوں تو بھی دم واجب نہ ہوگا۔ (اہم فقہی فیصلے دسواں ایڈیشن ۱۱۴)

فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

رمی اور قربانی کی ترتیب میں راجح قول

سوال: رمی جمار اور قربانی کی ترتیب کے بارے میں ہمارے یہاں راجح مذہب کیا ہے؟ (وہاں پر جیسا کہ معلوم ہوگا قربانی کی رقم پیشگی حکومت کی طرف سے جو انتظام قربانی کا ہوتا ہے اس میں مشقت سے بچنے کے لیے حجاج جمع کراتے ہیں، اور وقت بھی لکھواتے ہیں، مثلاً دس ذی الحجہ کو صبح گیارہ بجے ہماری قربانی کرنا، اب عام طور پر مزدلفہ سے واپسی میں کسی بھی وجہ سے منیٰ پہنچ کر رمی جمار میں تاخیر ہوتی ہے، اس صورت میں رمی سے قبل قربانی جن کی رقم جمع کی ہے ہو جاتی ہے، اس صورت میں کیا دم واجب ہوگا یا نہیں؟) اس کے بارے میں گذشتہ سال میرے ہاتھ وہاں ایک چھوٹا رسالہ لگا جس میں اسلامی ڈیولپمنٹ بینک کے صدر کی دعوت پر مختلف ممالک کے علماء اور مفتی

صاحبان جمع ہوئے، اور کچھ مقالات پیش کئے، جس میں حنفی علماء نے بھی صاحبین وغیرہ کے مذہب کو بیان کرتے ہوئے نتیجہ نکالنے کی کوشش کی ہے کہ ترتیب لازم نہیں، کسی رکن کی ادائیگی میں تقدیم وتاخیر ہو تو دم لازم نہیں ہوگا، جس کی نقل آپ کے پاس روانہ کرتا ہوں جو آپ کے لیے مدد کا کام دے گی۔

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہی راجح ہے، اس لیے اگر قران یا تمتع کا احرام ہے تو رمی سے قبل ذبح ہونے سے دم واجب ہوگا، ہاں مفرد پر نہیں ہوگا، جو مضمون آپ نے ارسال فرمایا ہے اس میں کوئی ایسی عبارت کتب احناف سے نہیں پیش کی گئی جس میں یہ تصریح ہو کہ فتویٰ صاحبین کے قول پر ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد خانپوری عفی عنہ

تمام دن کی رمی ترک کرنے سے کتنے دم واجب ہیں؟

سوال: معلم الحجاج صفحہ نمبر ۱۸۹ میں لکھا ہے کہ حج کے دنوں میں رمیٔ جمار اگر بالکل کسی روز بھی نہیں کی اور رمی کا وقت نکل گیا تب بھی ایک ہی دم واجب ہوگا، فتاویٰ رحیمیہ ۵ / ۱۵۲ میں تحریر کیا ہوا ہے کہ دو دن کی رمی چھوٹ گئی تو دو دم واجب ہوگا، اس مسئلہ کو کس طرح تطبیق دی جائے؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

غنیۃ الناسک میں ہے: ولو أخر رمی الأيام كلها إلى الرابع مثلا رماها كلها فيه قبل الزوال أو بعده على التأليف قضاء عنده، وعليه دم واحد

للتاخير، وأداء اه عندهما ولا شيء عليه وإن لم يقض حتى غربت الشمس منه فات وقت القضاء والأداء، وعليه دم واحد اتفاقا. (۹۷)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی دم واجب ہوگا۔

عمدۃ الفقہ میں ہے: ''اگر کسی نے ایک دن تینوں جمروں کی یا دو دن یا تینوں دن کی رمی ترک کردی تو اس پر ایک ہی دم واجب ہوگا؛ کیوں کہ جنس متحد ہے، جیسا کہ حلق میں حکم ہے۔ (عمدۃ الفقہ ۴/ ۵۴۵)

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۴/ رمضان المبارک ۱۴۱۸ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

حج اور حیض سے متعلقہ مسائل

قران کا احرام باندھنے کے بعد حیض آگیا

سوال: ایک عورت حج قران کا احرام باندھ کر مکہ شریف پہنچی، پہنچتے ہی ماہواری کے ایام شروع ہو گئے، یہاں تک کہ عمرہ ادا نہ کر سکی حج کے ایام آنے کی وجہ سے منیٰ، عرفات، مزدلفہ جا کر حج کے ارکان پورے کیے، پاک ہونے کے بعد طواف زیارت بھی ادا کرلیا، اس کا عمرہ جو رہ گیا ہے اس کی ادائیگی کی کیا صورت ہوگی؟ کیا یہ حج اس کا حج افراد ہوگا؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً

وہ عورت اپنے فوت شدہ عمرہ کی قضا کرے اور ترک عمرہ کی وجہ سے ایک دم

دے اس کا یہ حج، حج افراد ہے؛ اس لیے اس پر دم قران نہیں۔

نوٹ: اس مسئلہ کی تفصیل اذان بلال ماہ رجب ۱۴۲۴ھ جلد ۱۴ شمارہ ۹ دیکھ لیں۔

املاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۱/ محرم الحرام ۱۴۲۵ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ

عمرہ کا احرام باندھتے ہی حیض آگیا

سوال: ایک عورت ہندوستان سے عمرہ کا احرام باندھ کر چلی اور فوراً اسے حیض شروع ہوگیا، اور سات دن کی اس کی عادت ہے تو اب چوں کہ وہاں پہنچ کر عمرہ کا طواف نہیں کرے گی اور دو تین دن کے بعد حج کا احرام باندھنے کا وقت آگیا تو اب عورت کیا کرے گی؟

اور اگر حج کا احرام بھی اس نے وقت پر باندھ دیا اور حج کے سارے ارکان بھی پورے کردیے تو اب سوال یہ ہے کہ طوافِ زیارت پہلے کرے یا عمرہ کا طواف کرے یا پھر ایک ہی طواف وسعی میں دونوں ادا ہوجائیں گے۔

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

ایسی عورت عمرہ کا احرام چھوڑ کر حج کا احرام باندھ لے۔ (اوجز المسالک ۸/۷۸)

عمرہ کا احرام چھوڑنے کا طریقہ یہ ہوگا کہ وہ اپنا سر کھول کر کنگھا کرے، یا ناخن تراش لے یا بال کترے۔ (شامی ۲/۲۷۴)

اب چوں کہ اس نے عمرہ کا احرام چھوڑا تھا؛ اس لیے حج کی ادائیگی سے فارغ ہو کر وہ اپنے اس عمرہ کی قضاء کرے گی اور اس پر دم بھی واجب ہوگا، ایک بکری یا

بڑے جانور کا ساتواں حصہ بطور دم ذبح کرے۔ (شامی ۲/ ۲۷۴، زبدۃ المناسک ۲/ ۳۳)
فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

حررہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، یکم ذوالحجہ ۱۴۰۷ھ

حالت حیض میں طواف وسعی کرنا

سوال: حائضہ کے حرم مکہ اور مسجد نبوی کے داخلہ کے بارے میں، اسی طرح طواف اور سعی کے بارے میں وضاحت فرمایئے؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

حیض والی عورت کے لیے مسجد میں داخل ہونا ممنوع ہے، اس لیے نہ وہ مسجد حرام میں داخل ہوسکتی ہے، اور نہ مسجد نبوی میں، حالت حیض میں طواف نہ کرے، اور جو حیض کے عذر سے طواف زیارت ایام نحر سے مؤخر ہو گیا تو کچھ حرج نہیں اور دم واجب نہ ہوگا، سعی طواف قدوم کے ساتھ نہ کی ہو تو سعی کو بھی موقوف رکھے، بعد پاک ہونے کے طواف زیارت کے ساتھ کرے، اور جس کو احرام سے پہلے حیض آجائے وہ نہا کر احرام باندھ لے، اور یہ نہانا ستھرائی کے واسطے ہے، اور سوائے طواف اور سعی کے سب کچھ کرے، اگر طواف پاکی میں کیا اور اس کے بعد حیض آیا تو سعی کو حیض کی حالت میں کرنا جائز ہے، کیوں کہ سعی میں پاکی ضروری نہیں ہے؛ البتہ یہ وقت اگر طواف قدوم کے بعد کا ہے تو سعی کو طواف زیارت کے بعد کرنا بہتر ہے، اور اگر یہ وقت طواف زیارت کے بعد کا ہے تو سعی کو حالت حیض میں ہی کرے؛ تاکہ ایام نحر نکل نہ جائے، اگرچہ سعی کا ایام نحر میں کرنا واجب نہیں ہے؛ مگر طواف زیارت کے بعد افضل ہے، اور طواف

کے ساتھ موالات سعی کی سنت ہے، اور جو حیض بعد وقوف اور طواف زیارت کے آئے تو طواف صدر ساقط ہوجاتا ہے اور دم بھی واجب نہیں ہوتا؛ مگر جو توقف کرے اور پاک ہوکر طواف صدر کرکے جائے تو بہتر ہے۔ (زبدۃ المناسک ۲۲۳، ۲۲۴) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد خانپوری عفی عنہ

حج کرنے والی حائضہ ہوگئی

سوال: اگر ایام حج میں احرام باندھنے کے بعد حیض آ گیا تو ارکان حج کے متعلق عمل کے بارے میں کیا فرماتے ہیں؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

سابق میں تفصیل آچکی ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد خانپوری عفی عنہ

حیض کی حالت میں طواف زیارت

سوال: حیض کی حالت میں طواف زیارت کے لیے کیا کریں؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

جواب بالا میں تفصیل آچکی ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد خانپوری عفی عنہ

حائضہ سے طواف وداع ساقط ہے

سوال: حیض کی حالت میں طواف وداع کے لیے کیا صورت ہوگی؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

اگر عورت کو حیض آ گیا ہے جس کی وجہ سے طواف نہیں کر سکتی ہے، تو اس سے طواف وداع ساقط ہے؛ لیکن اگر وہ مکہ مکرمہ کی آبادی سے نکلنے سے پہلے پاک ہو جائے تو اس کو لوٹ کر طواف کرنا واجب ہے، اور اگر آبادی سے نکلنے کے بعد پاک ہو تو واجب نہیں۔ (معلم الحجاج ۲۲۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۱/صفر المظفر ۱۴۱۲ھ

عمرہ کرنے والی حائضہ ہوگئی

سوال: اسی طرح عمرہ کرنے جانے والی عورت عامرہ مکہ پہنچی اور حیض شروع ہو گیا، تو اب ادائیگی ارکان میں کیا رہبری فرماتے ہیں؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

عمرہ کے ارادہ سے عورت مکہ پہنچی اور حیض آ گیا تو وہ پاک ہونے کا انتظار کرے اور پاک ہونے کے بعد طواف سعی کر کے قصر کرا کر حلال ہو۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد خانپوری عفی عنہ

متمتع حائضہ ہوگئی

سوال: ایک عورت حجِ تمتع کرنا چاہتی ہے، روانگی کے وقت اگر حیض شروع ہو جائے تو کیا کرے؟

اگر کوئی عورت احرام باندھ کر حدودِ حرم میں داخل ہو گئی؛ مگر حالتِ حیض میں ہونے

کی وجہ سے افعالِ عمرہ ادا نہیں کرسکتی اور اس کی عادت ایک عشرہ کی ہے تو کیا اب وہ پاک ہونے تک احرام کی حالت میں رہے یا احرام ختم کر کے پاکی حاصل ہونے کے بعد پھر میقات سے احرام باندھ کر عمرہ ادا کر سکتی ہے؟ اگر اتنے زیادہ ایام تک احرام میں رہے گی تو اس کی پابندیاں جو ہیں اس کی وجہ سے بہت دشواری ہوگی؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

احرام باندھنے کے وقت عورت اگر حالتِ حیض میں ہے تب بھی غسل کرلے، اس کے بعد احرام کی دو رکعت پڑھنے کے بجائے صرف عمرہ کی نیت: "اللّٰهم إني أريد العمرة فيسرها لي وتقبلها مني" کر کے "لبيك اللّٰهم لبيك لا شريك لك لبيك، إن الحمد والنعمة لك والملك لا شريك لك" پڑھ لے، اس کا احرام شروع ہو جائے گا، مکہ مکرمہ پہنچ کر ٹھہری رہے یہاں تک کہ جب پاک ہو جائے تب غسل کر کے عمرہ کے افعال ادا کرے، دیر تک احرام میں رہنے کی پابندی اٹھائی اس کا اجر ملے گا۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۶/شوال ۱۴۱۷ھ

حج تمتع کرنے والی عورت حائضہ ہوگئی تو کیا حکم ہے؟

سوال: (۱) ایک عورت ذی الحجہ کی شروع تاریخ میں حج تمتع کے ارادہ سے چلی، اپنے ملک کے میقات سے عمرہ کا احرام باندھ کر مکہ معظّمہ پہنچی، اب عمرہ کے ارکان ادا کرنے سے پہلے حیض شروع ہو گیا، حیض سے پاک ہونے سے پہلے حج کا احرام باندھنے کا وقت آ گیا تو ایسی عورت کے لیے حج تمتع ادا کرنے کا طریقہ کیا ہوگا؟ عمرہ

کے احرام سے نکلنے کے لیے چوٹی سے بال کاٹنے ہوں گے یا نہیں؟ عمرہ کی قضاء یا دم لازم آئے گا یا نہیں؟

② اسی طرح ایک عورت حج سے پہلے عمرہ کے ارکان ادا کرنے کے بعد وقت کی قلت کی بناء پر مدینہ منورہ چلی گئی، اور اس کا ارادہ حج تمتع کا تھا، اب واپسی کے وقت حیض شروع ہو گیا، تو ایسی شرعی عذر والی عورت مدینہ منورہ سے واپسی پر حج افراد کا احرام باندھے؟ یا اس کے لیے کوئی شکل آپ کے علم میں ہو تحریر فرمائیں۔ عین نوازش ہوگی۔

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

① امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے ''مؤطا'' میں اس مسئلہ پر مستقل باب قائم کیا ہے۔

باب المرأة تقدم مكة بحج أوبعمرة فتحيض قبل قدومها أو بعد ذلك.(موطأ امام مالك جديد ٢/ ٣٥٥)

آگے اس کا حکم بیان فرماتے ہیں:

قال محمد: وبهذا نأخذ الحائض تقضى المناسك كلها غيران لاتطوف ولاتسعى بين الصفا والمروة حتى تطهر، فان كانت أهلت بعمرة، فخافت فوت الحج فلتحرم بالحج و تقف بعرفة و ترفض العمرة فاذا فرغت من حجها قضت العمرة كما قضتها العائشة رضى الله عنها، و ذبحت ما استيسر من الهدى(ايضاً ٢/ ٣٦٠،٣٥٩)

عبارت بالا سے معلوم ہوا کہ عورت اگر عمرہ کا احرام باندھ کر مکہ معظّمہ پہنچی اور وہ حائضہ ہے ایام حج آجانے کی وجہ سے حج کے فوت ہو جانے کا اندیشہ ہے، یعنی عمرہ کا احرام باقی رکھ کر پاکی کا انتظار کرنے میں یہ اندیشہ ہے کہ حج فوت ہو جائے گا، تو اس کو

چاہیے کہ حج کا احرام باندھ لے اور وقوف عرفات کر لے، اور عمرہ کا احرام کھول کر عمرہ چھوڑ دے، اس کے بعد حج سے فارغ ہو کر عمرہ کی قضاء کر لے جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کیا تھا، اور دم رفض کے طور پر جانور ذبح کرے۔

احرام عمرہ سے نکلنے کے لیے محظورات احرام میں سے کوئی کام کر لے، مثلاً کنگی کر لے یا اور کوئی کام (چوٹی کاٹنا) کر لے۔

''مرقاۃ'' میں ہے: فأمرني النبي ﷺ أن أنقض رأسي أي شعره، وامتشط و أهل بالحج، أي أمرني أن أحرم بالحج، و أترك العمرة أي أرفضها، قال ابن الملك: أي أمرني أن أخرج من احرام العمرة و اتركها باستباحة المحظورات من التمشيط وغيره لعدم القدرة على الاتيان بأفعالها بسبب الحيض الخ (مرقاة شرح مشكوة ٥/ ٣٠٦)

حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: حنفیہ نے اپنے اس مدعا پر کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عمرہ فسخ کر دیا تھا کئی وجہ سے استدلال کیا ہے، ایک یہ کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا تھا اپنے عمرہ کو چھوڑ دو، دوم یہ کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ بھی فرمایا تھا: اپنا سر کھول کر کنگھی کر لو، ظاہر ہے کہ احرام میں کنگھی کرنا جائز نہیں ہے کیوں کہ بالوں کے جھڑنے کا اندیشہ ہے۔

(حجۃ الوداع وعمرات النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اردو ص:٦٠)

وہ عورت عمرہ کی قضاء بھی کرے، جیسا کہ اوپر ''مؤطا'' کی عبارت میں آچکا ہے اور چوں کہ عمرہ چھوڑا ہے؛ اس لیے دم بھی دے گی۔

حضرت شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

واهدت أى يجب عليها الهدى ايضاً كما اهدى النبى ﷺ عن عائشة بقرة كما فى روايات مسلم الا أن ذاك الهدى عندهم هدى القران و عند الحنفية هدى الرفض(اوجز المسالك ٥ /٨٧، ٨٨)

"فتح القدیر" میں ہے:

وكل من رفض نسكا فعليه دم لما روى ابو حنيفة عن عبد الملك بن عمير عن عائشة ان النبى ﷺ امر لرفضها العمرة بدم (٣/ ١١٤)

"زبدۃ المناسک" میں ہے: مسئلہ: جس چیز کو چھوڑا ہے اس کے چھوڑنے کی وجہ سے ایک تو دم رفض دینا واجب ہوگا، دوسرا یہ کہ اس چھوڑی ہوئی چیز کی قضاء کرنی ہوگی، پس عمرہ کے چھوڑنے سے اس کی قضاء اور دم رفض لازم ہے۔ فقط (٢/ ١٤)

② ایسی عورت افراد ہی کا احرام باندھے۔

"زبدۃ المناسک" میں ہے: اکثر الوقوع ضروری: مسئلہ اکثر حاجی اشہر حج میں آکر عمرہ کرتے ہیں، پھر اشہر حج میں حج کرنے سے پہلے مدینہ طیبہ روضۂ مقدسہ اور حجرۂ مطہرہ و معطرہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت کے لیے چلے جاتے ہیں، پس ان کو چاہیے، جب وہاں سے واپس ہوں تو فقط حج مفرد ہی کا احرام باندھ کر آئیں، تو امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ان کا تمتع صحیح ہے، اس سفر کرنے سے تمتع باطل نہ ہوگا، کیوں کہ وہ لوگ اشہر حج میں عمرہ کر چکے ہیں، اور عمرہ کرنے کے بعد وہ حکماً مکیوں میں داخل ہیں، اگر چہ اشہر حج میں میقات سے بھی باہر نکل گئے ہوں، کیوں کہ وہ اپنے اصلی وطن میں نہیں گئے ہیں، تو ان کا سفر باعتبار حکم کے واحد ہے، اس کو المام فاسد کہتے ہیں، جو کہ مبطل تمتع نہیں، اب ان کو مدینہ طیبہ سے قران کا احرام باندھنا ممنوع ہے کہ وہ مکیوں کے حکم

میں ہیں، اگر قران کا احرام باندھیں گے تو دم جنایت لازم ہوگا۔

(شرح اللباب وغنیۃ ۲/ ۱۴، ۱۵)

البتہ اس صورت میں اس پر دم تمتع لازم ہے۔ (زبدۃ المناسک ۲/ ۱۴) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲/ جمادی الاخری ۱۴۲۰ھ

قران کا احرام باندھنے والی حائضہ ہوگئی

سوال: اگر کسی عورت نے قران کا احرام باندھا، اور مکہ معظّمہ پہنچنے سے پہلے حائضہ ہوگئی، اور ایام حج تک پاکی کی امید نہیں، اس کے لیے کیا حکم ہے؟ کیا وہ احرام فسخ کرے اور وہ حج کا نیا احرام باندھے؟ یا اسی احرام سے حج کرے؟ اگر احرام فسخ کرے تو قضاء کس کی کرے، اور کتنے دم دے؟ اگر اسی احرام سے حج کرے تو کیا حکم ہے؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

آپ کا دریافت کیا ہوا مسئلہ مستقل طور پر صراحۃً باوجود تتبع اور تلاش کے نہیں ملا، البتہ "عمدۃ الفقہ" کتاب الحج میں قران کے بیان میں کچھ عبارت ایسی ملی جس سے آپ کا سوال حل ہوسکتا ہے۔

مؤلف کتاب شرائط قران کے عنوان کے ماتحت تیسری شرط بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ:

③ عمرہ کا پورا یا اکثر طواف وقوف عرفہ کو اس کے وقت میں ادا کرنے سے پہلے کرنا، پس اگر کسی قارن نے عمرہ کا پورا یا اکثر طواف نہیں کیا، مثلاً: وہ مکہ مکرمہ میں داخل نہیں ہوا، بلکہ سیدھا عرفات چلا گیا، یا اس نے اقل حصہ یعنی تین چکر یا اس سے کم طواف

کر کے زوال کے بعد وقوف عرفہ کر لیا، خواہ کسی عذر کی وجہ سے ایسا کیا ہو، مثلاً: کسی عورت کو حیض آ گیا اور وہ اس کی وجہ سے طواف عمرہ نہ کر سکی تو اس کا عمرہ جاتا رہا اگر چہ اس نے عمرہ ترک کر دینے کی نیت نہ کی ہو پس اس کا عمرہ جاتا رہا اور قران ساقط ہو گیا؛ اس لیے کہ جب اس کا عمرہ جاتا رہا تو وہ دو نسک (دو عبادتیں) ادا کرنے کا فائدہ حاصل نہیں کر سکا اور اس پر دم رفض واجب ہوگا، کیوں کہ اس نے عمرہ شروع کر کے ترک کر دیا ہے، اور ایام تشریق کے بعد اس عمرہ کی قضاء دینا اس پر واجب ہے کیوں کہ اس عمرہ کا شروع کرنا صحیح ہو گیا پس وہ محصر کے مشابہ ہو گیا؛ اس لیے اب اس کا ادا ممکن نہیں رہا، کیوں کہ اگر وہ اس کو وقوف عرفہ کے بعد ادا کرے گا تو وہ افعال حج پر افعال عمرہ کی بنا کرنے والا ہوگا اور یہ مشروع طریقہ کے خلاف ہے۔ (عمدۃ الفقہ ۲۶۱/۴)

(اضافہ از احقر): اوپر عبارت میں مؤلف نے لکھا ہے: اگر چہ اس نے عمرہ ترک کر دینے کی نیت نہ کی ہو...... الخ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب قران کا احرام باندھنے والی عورت کو مکہ مکرمہ پہنچ کر یا پہلے حیض آ جائے اور عمرہ کے افعال کی ادائیگی کا وقت نہ رہے اور عرفات میں وقوف کا وقت آ جائے تو اس کو چاہیے کہ عمرہ کے ترک کی نیت کر لے؛ لیکن یاد رہے کہ تمتع کا احرام باندھنے کی صورت میں وہ عورت عمرہ کا احرام کھولنے کے لیے کوئی منافئ احرام کام (مثلاً بالوں میں تیل ڈالنا وغیرہ) کر کے عمرہ کا احرام ختم کرتی تھی ایسا یہاں نہ کیا جائے؛ اس لیے کہ یہاں پر یہ احرام صرف عمرہ کا نہیں بلکہ ساتھ میں حج کی بھی نیت کی گئی ہے گویا دونوں کا مشترک احرام ہے، اب اگر یہاں عمرہ کا احرام ختم کرنے کے لیے کوئی منافئ احرام کام کرے گی تو یہ عمل حج کے احرام کے حق میں جنایت ثابت ہوگا، جیسا کہ متمتع عمرہ کے افعال ادا کرنے کے بعد حلق کرا کر عمرہ کا

احرام کھول دیتا ہے؛ لیکن قارن عمرہ کے افعال ادا کرنے کے بعد حلق نہیں کرائے گا، (جیسا کہ کتب فقہ میں مصرح ہے)۔

بہر حال قران کا احرام باندھنے والی عورت صورت مسئولہ میں عمرہ ترک کرنے کی صرف نیت کر لے اور عرفات چلی جائے، اور اگر نیت نہیں کی تب بھی وقوف عرفات کر لینے سے خود بخود عمرہ ترک ہو جائے گا اور ان دونوں صورتوں میں افعال حج ادا کرنے کے بعد احرام کھول دے اور اس عورت پر دم قران واجب نہیں؛ اس لیے کہ قران ہوا ہی نہیں؛ البتہ چھوٹے ہوئے عمرہ کی قضاء اور عمرہ کا احرام باندھنے کے بعد اس کو چھوڑ دینے کی وجہ سے ایک دم جس کو فقہاء کی اصطلاح میں دم رفض کہتے ہیں واجب ہوگا۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

املاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۴/ ربیع الثانی ۱۴۲۴ھ
الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ

باب حج البدل

بغیر وصیت حج بدل کرے تو فرض ساقط ہو جائے گا

سوال: میں سال گذشتہ اپنا حج کر چکا ہوں، امسال اپنے مرحوم بھائی کی طرف سے حج بدل کا ارادہ تھا اسی نیت سے فارم بھی بھر دیا تھا، مرحوم بھائی پر حج فرض نہ تھا، بعد میں بعض رشتہ داروں نے توجہ دلائی کہ والد مرحوم پر حج فرض تھا، اور انہوں نے اپنی زندگی میں حج نہیں کیا ہے؛ لہٰذا والد مرحوم کی طرف سے حج بدل کر لوں، تو کیا میں والد مرحوم کی طرف سے حج بدل کر سکتا ہوں یا نہیں؟ اور اس صورت میں والد مرحوم کی

طرف سے حج فرض ادا ہوگا یا نفل؟ اور میں حج بدل میں احرام باندھتے وقت کیا نیت کروں؟ بعض ساتھیوں کی رائے یہ ہے کہ میں پہلے مدینہ جاؤں اور پھر عین حج کے موقع پر یعنی ۷/ ذی الحجہ کو حج کا احرام باندھ کر مکہ پہنچوں۔ حج بدل میں افراد افضل ہے یا قران یا تمتع؟ مذکورہ مسئلہ میں قربانی کا کیا حکم ہے؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

اگر آپ کے والد مرحوم پر حج فرض ہو چکا تھا، اور زندگی میں انہوں نے حج ادا نہیں کیا اور بوقتِ وفات وصیت بھی نہیں کی ہے، اور اب آپ اپنے خرچ سے تبرعاً فرض حج ادا کر رہے ہیں تو ان شاء اللہ تعالیٰ ان کا حج فرض اداء ہو جائے گا۔ (شامی ۲/ ۲۶۶)

احرام کے وقت نیت اپنے والد مرحوم کے حج کی کریں، اگر زبان سے کہہ دیں "لبيك عن أبی" تو بہتر ہے ورنہ دل سے بھی کافی ہے، چوں کہ یہ حج آپ اپنے والد مرحوم کی طرف سے تبرعاً کر رہے ہیں؛ اس لیے آپ کو اختیار ہے، چاہیں افراد کا احرام باندھیں، چاہیں قران وتمتع کا۔ پہلے مدینہ منورہ جا کر عین حج کے موقعہ پر افراد کا احرام باندھ کر مکہ معظّمہ آنا چاہیں تو ایسا بھی کر سکتے ہیں، ضروری نہیں ہے۔

صورت مسئولہ میں آپ اگر تمتع یا قران کا احرام باندھیں گے تو دم قران وتمتع واجب ہوگا، اور اگر افراد کا احرام باندھا ہے تو جانور ذبح کرنا افضل ہے، واجب نہیں۔ یہ حکم تو حج کی قربانی کا ہے؛ رہی عید الاضحیٰ کی قربانی تو آپ حج کے خاص ایام شروع ہونے سے پہلے مکہ معظّمہ مقیم بن چکے ہیں، یعنی پندرہ یوم یا اس سے زیادہ قیام کی نیت کے ساتھ اتنا قیام کر چکے ہیں اور ساتھ ہی بقدرِ نصاب مال کے مالک ہیں تو عید الاضحیٰ

والی قربانی بھی آپ پر واجب ہے، ورنہ نہیں۔ (شامی ۲/۱۹۶، زبدۃ المناسک ۲/۱۲۹) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد خانپوری عفی عنہ

جھوٹے حلفیہ بیان کے ذریعہ حج بدل میں جانا

سوال: ① ایک آدمی نے کسی سال اپنا فرض حج ادا کیا، اس کے ایک یا دو سال کے بعد کسی آدمی نے اپنے کسی رشتہ دار کی طرف سے حج بدل کے لیے اس کو کہا، اب یہ آدمی جب حج بدل کے لیے حج کمیٹی میں درخواست دینے کے لیے گیا تو اس سے کہا گیا کہ آپ نے پچھلے پانچ سال کے اندر اندر حج کیا ہے؛ لہذا آپ کے لیے حج بدل میں جانا جائز نہیں ہے؛ کیوں کہ درخواست فارم میں ایک کالم ایسی آتی ہے جس میں آپ کو دستخط کرنی ہوتی ہے جس میں لکھا ہوا ہوتا ہے کہ: ''میں حلفیہ بیان دیتا ہوں کہ میں نے پچھلے پانچ سال میں حج نہیں کیا'' جو کہ غلط بیان ہوتا ہے، اب جواب طلب امر یہ ہے کہ اس کو حج بدل میں جانا جائز ہے یا نہیں؟ کہنے والے نے یہ بھی کہا کہ آپ انٹرنیشنل پاسپورٹ سے جا سکتے ہیں؛ کیوں کہ اس میں وہ پابندی نہیں ہے جو حج کمیٹی میں ہے۔

② اگر حج بدل میں جانے والا انٹرنیشنل سے جاوے تو دس پندرہ ہزار روپیہ زیادہ ہوتا ہے، اب قابل طلب امر یہ ہے کہ اگر بھیجنے والے کے پاس اتنے پیسے کی گنجائش نہ ہو جتنا کہ انٹرنیشنل میں خرچ ہوتا ہے، اور بھیجنے والے کو اسی سال حج بدل کرانا ہو؛ کیوں کہ مرنے والے کو چھٹکارا دلانا ہے، تو اب بھیجنے والا اگر اس کو کہے کہ تم

اسی سال جاؤ، تو وہ آدمی حج بدل کو جا سکتا ہے یا نہیں؟

③ حج بدل جس کی طرف سے کرتا ہے اس پر فرض ہو یا نہ ہو، دونوں صورتوں میں کیا کریں؟ تفصیل سے جواب دیں۔

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

① اس طرح کذب بیانی اور جھوٹے حلفیہ بیان کے ذریعہ حج بدل میں جانا ہرگز جائز نہیں ہے، احادیث میں جھوٹی قسم پر بے شمار سخت وعیدیں آئی ہیں، اور یہ کبیرہ گناہ ہے۔

② ③ اس صورت میں بھی جائز نہیں، چاہے حج بدل فرض ہو یا نفل، اس لیے کہ بھیجنے والے کے لیے شرعاً یہ ضروری نہیں ہے کہ اسی آدمی کو بھیج کر حج بدل کرائے، اگر وہ اس طرح گیا تو مرتکب کبیرہ ہے، اور بھیجنے والے کو اس کا حال معلوم ہونے کے باوجود بھیجا تو وہ بھی گنہگار رہے، ایسے بہت سارے آدمی بھیجنے والے کو مل جائیں گے جو اس قباحت سے پاک ہوں گے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۷/ شوال ۱۴۱۶ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

حج بدل

سوال: اگر کوئی آدمی اپنی جیب خاص سے کسی دوسرے آدمی کے والد کی جانب سے حج بدل ادا کرے، تو جائز ہے یا نہیں؟ اس کی کیا شکل ہو سکتی ہے؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

اس صورت میں میت کو حج کا ثواب ملے گا، صورت وہی ہے جو عام طور پر حج بدل کی ہوتی ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۴ / ذوالحجۃ الحرام ۱۴۱۱ھ

مرحوم کی طرف سے حج بدل

سوال: ہم سعودی عرب میں موجود ہیں ملازمت کے خاطر، اگر موقعہ ملا تو مرحوم کے نام سے حج بدل کر سکتے ہیں یا نہیں؟ وجہ یہ ہے کہ مرحوم نے وصیت وغیرہ نہیں کی ہے، خاص کر والدین، اور بھائی بہن اور عورت اور بچوں کے نام سے حج بدل کر سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

والدین یا دیگر اعزہ میں سے جو وفات پا چکے ہیں، ان کی طرف سے آپ حج کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں، چاہے انہوں نے وصیت نہ کی ہو، جن کی طرف سے آپ حج کریں گے ان کو اس حج کا ثواب ملے گا۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد خانپوری عفی عنہ

مرحومہ کی حج بدل کرانا

سوال: ایک شخص کا انتقال ہو گیا، وراثت تقسیم نہیں ہوئی تھی، وارث داروں میں لڑکے لڑکیاں اور عورت تھی، عورت پر حج فرض تھا، کاروبار مشترک چلتا رہا، وراثت

تقسیم نہیں ہوئی تھی، اس وقت اندازاً عورت پر فرض تھا، وصیت نہیں کی، عورت کا انتقال ہوگیا، حج فرض ذمہ باقی رہ گیا، لڑکوں نے اپنی طرف سے نفل حج کروایا، تو کیا مرحومہ کے ذمہ سے فرض اتر جائے گا یا نہیں؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

مرحومہ کی وصیت نہیں تھی؛ لیکن لڑکوں نے یہ سمجھ کر کہ ان پر حج فرض تھا، اُن کی طرف سے حج کرایا؛ تا کہ ان کا ذمہ بری ہو، تو ان شاء اللہ کافی ہوگا۔

في مناسك السروجي: لو مات رجل بعد وجوب الحج ولم يوص به فحج رجل عنه أو حج عن أبيه أو أمه عن حجة الإسلام من غير وصية، قال أبوحنيفة: يجزيه إن شاء الله، وبعد الوصية يجزيه من غير المشيئة اھ (شامي ٢/٢٥٩) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری ۱۹/ جمادی الاخریٰ ۱۴۱۹ھ
الجواب صحیح: عباس داود بسم اللہ

غیر حاج کو حجِ بدل کے لیے لے جانا

سوال: سالا (بیوی کا بھائی) بہنوئی کا قرض دار ہے، بہنوئی اپنے سالا کو اپنی ساس کے حج بدل کے لیے ساتھ لے جانا چاہتا ہے، ساس کا انتقال ہو چکا ہے جو کہ صاحبِ نصاب نہیں تھی، سالا بھی صاحب نصاب نہیں ہے، ایسی صورت میں دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا بہنوئی اپنے سالا کو اپنی ساس کے حجِ بدل کے لیے ساتھ لے جاسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

بہتر تو یہ ہے کہ حج بدل کے لیے ایسے آدمی کو بھیجا جائے جو مناسکِ حج سے بخوبی واقف ہونے کے ساتھ اپنا فریضۂ حج ادا کر چکا ہو؛ لیکن اگر ایسے آدمی کو بھیجا جس نے ابھی تک حج نہیں کیا ہے اور نہ اس پر حج فرض ہے تو درست ہے؛ البتہ مکروہِ تنزیہی ہے۔ صورت مسئولہ میں بہنوئی کا اپنے سالے کو اپنی مرحومہ ساس کے حجِ بدل میں لے جانا مکروہِ تنزیہی ہے۔ (شامی ۲/۲۴۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۱/ ربیع الآخر ۱۴۱۹ھ
الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

زندوں کی طرف سے عمرہ

سوال: ہم مکہ میں گئے اور ٹائم بہت مل رہا ہے، تو اس دوران میں کسی کے نام کا عمرہ کر سکتے ہیں یا نہیں؟ جبکہ گھر والدہ، بھائی، عورت، بچے موجود ہیں، ان کے نام سے عمرہ کرنا ہے۔

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

کر سکتے ہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد خانپوری عفی عنہ

کسی کی طرف سے طواف

سوال: گھر میں کسی کے بھی نام سے طواف کعبہ کا کرنا درست ہے یا نہیں؟

ثواب ملے گا یا نہیں؟ وہ معلوم کرنا ہے۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً

کر سکتے ہیں، اس طواف کا ثواب ان کو مل جائے گا۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد خانپوری عفی عنہ

فرض حج کے ذریعہ ایصال ثواب

سوال: مسئلہ یہ پیش آیا ہے کہ ناچیز کی پھوپھی نے ماہِ ذی الحجہ میں یہ نیت کی تھی کہ میں اپنے بھتیجے خالد کو آئندہ سال اس کے والد مرحوم کے حج بدل میں بھیجوں گی (انشاءاللہ) (یہ بھی یاد رہے کہ والدِ مرحوم پر اپنی حیات میں حج فرض نہیں ہوا تھا)۔

دوسرا واقعہ یہ پیش آیا کہ اسی سال والد مرحوم کے بھانجی داماد نے والد مرحوم کی طرف سے حج ادا کر دیا، جو انہوں نے حج کی ادائیگی کے بعد ظاہر کیا۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا پھوپھی کی نیت کا پورا کرنا ضروری ہے؟ یا یہ کہ پھوپھی یہ رقم ناچیز کو ہدیہ کر دیں اور ناچیز اپنا حج پڑھ لے۔ کیا اس کی گنجائش ہے؟

دراصل بات یہ ہے کہ پھوپھی یہ کہہ رہی ہے کہ میں تو اپنی نیت کے مطابق یہ رقم تیرے حوالہ ضرور کر دوں گی، اب مفتی صاحب سے یہ معلوم کر لیں کہ والد صاحب کی طرف سے حج پڑھا جائے گا یا ناچیز اپنی طرف سے پڑھ سکتا ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً

چوں کہ آپ کے والد مرحوم پر حج فرض نہیں تھا اور نہ ہی انہوں نے اپنی طرف سے حج بدل کرانے کی کوئی وصیت کی تھی، ایسی صورت میں آپ کی پھوپھی صاحبہ کا ان کی

طرف سے ان کے بیٹے کو حج بدل کے لیے بھیجنے کا حاصل صرف اتنا ہی ہے کہ اس حج کا ثواب ان کو پہنچے؛ اس لیے اگر ان کی دی ہوئی رقم سے آپ اپنا فرض حج ادا کریں اور بعد میں اپنے اس فرض حج کا ثواب والد مرحوم کو بخش دیں تو دونوں مقصد حاصل ہو جائیں گے، فقہاء نے فرائض کا ثواب دوسروں کو پہنچانے کے درست ہونے کی تصریح فرمائی ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

املاہ: العبد احمد خانپوری، ۳۰/ ربیع الآخر ۱۴۲۵ھ
الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ

مسائل منیٰ ومزدلفہ

مزدلفہ میں صبح صادق کے بعد مغرب وعشاء بہ نیت ادا پڑھنا

سوال: (۱) کوئی حاجی مزدلفہ میں دیر سے پہنچا یہاں تک کہ صبح صادق ہو گئی اس نے مزدلفہ پہنچ کر مغرب اور عشاء کی نماز ادا کی نیت سے پڑھی حالاں کہ قضاء کی نیت کرنی چاہیے تھی، تو کیا اس کی نماز ہو جائے گی یا دہرانی پڑے گی؟

مزدلفہ میں دیر سے پہنچنے پر مغرب وعشاء پڑھنے سے دم نہیں

سوال: (۲) مزدلفہ میں مغرب اور عشاء کی نماز عشاء کے وقت میں پڑھنا واجب ہے وہ دیر سے پہنچنے کی وجہ سے صبح صادق سے پہلے مزدلفہ میں یہ نمازیں نہ پڑھ سکا تو کیا اس پر دم آئے گا یا نہیں؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

① دل میں اگر اس بات کا تعین کیا ہو کہ میں نے گذشتہ شب کی مغرب اور عشاء پڑھی تو چاہے نیت اداء کی کی ہو پھر بھی یہ نماز درست ہو جائیگی دہرانے کی ضرورت نہیں، اور اگر ایسا نہیں تو دہرانا ضروری ہے۔ (ماخوذ از عمدۃ الفقہ ۲/۷۷)

② اس صورت میں دم واجب نہیں۔ (ماخوذ از بدۃ المناسک ۲/۵۰)

املاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۰/صفر ۱۴۲۵ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ

حکومت کا قیامِ منیٰ ومزدلفہ کے لیے حدود کے باہر خیمے گاڑنا

سوال: آج کل حاجیوں کی کثرت کی وجہ سے سعودی حکومت ہر جگہ توسیع کر رہی ہے، جیسے مسجد حرام ومسجد نبوی وغیرہ، اسی طرح منی میں بھی توسیع کی گئی ہے اور مزدلفہ کے کچھ حصہ کو منی کے حدود میں داخل کر دیا گیا ہے اور بعض حاجیوں کے خیمے بھی وہیں نصب کئے جاتے ہیں؛ لہذا درج ذیل سوالات کے جوابات مطلوب ہیں، امید ہے کہ ضرور جوابات سے نوازیں گے۔

① نئے حدود منی میں ٹھہرنے والے حجاج منی میں ٹھہرنے والے شمار ہوں گے یا نہیں؟

② مزدلفہ کی رات میں حجاج مزدلفہ سے خارج کردہ و منی میں داخل کردہ حصہ میں قیام کریں تو کیا مزدلفہ کا قیام ادا ہو جائے گا یا نہیں؟

③ کیا حکومت سعودیہ کو شرعاً یہ حق حاصل ہے کہ حدود منی، مزدلفہ میں کمی بیشی کرے جب کہ حدود پہلے سے متعین چلے آرہے ہیں؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

حج ایسی عبادت ہے جو مخصوص اوقات میں، مخصوص افعال کے ذریعہ مخصوص جگہوں میں ادا کی جاتی ہے، چناں چہ اس کی صحتِ اداء کے شرائط میں مکان اور زمان کو بھی شمار کیا گیا ہے۔

عالمگیری میں ہے: أما شرائط صحة ادائه فثلاثة:الإحرام، والمكان، والزمان. (۱/ ۲۱۹)

''غنیۃ الناسک'' میں ہے: واما شرائط صحة الأداء فتسعة: الاسلام، والإحرام، والزمان، والمكان، والتمييز، والعقل الخ(ص:۱۳)

آگے مکان والی شرط کی وضاحت وتفصیل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

والمكان: المسجد للطواف ولو سطحه، والمسعى للسعى، وعرفات للو قوف، ومزدلفة للجمع والمبيت والو قوف، و منى للرمى، وا لحرم للذبح، فلا يصح شئ من افعاله فى غير مااختص به من المكان. (ص۱٤)

چناں چہ حج کے تمام اعمال ومناسک (چاہے وہ رکن اور واجب ہوں یا سنت ہوں) میں سے جس کے لیے جو جگہ مخصوص کی گئی ہے اس کے علاوہ میں انجام دینے سے ادا نہیں ہوں گے۔

مناسک ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ میں ہے: فلا يصح شئ من افعاله أي من اعمال الحج ركنا أو واجبا أو سنة فى غير ما اختص به أي من اماكنها.
(ارشاد السارى إلى مناسك الملا على القارى:ص٤٢)

''عمدۃ الفقہ'' کتاب الحج میں ہے: ''چوتھی شرط حج کی جگہ کا ہونا ہے، یعنی وقوف، رمی، حلق اور ذبح وغیرہ میں سے ہر ایک کا اس کی متعین جگہ میں کرنا صحت اداء کے لیے

شرط ہے، اور مسجد الحرام طواف کے لیے متعین جگہ ہے؛ اگر چہ اس کی چھت پر ہو، اور سعی کے لیے مسعیٰ (صفا ومروہ کی درمیانی جگہ) متعین ہے، اور وقوف کے لیے عرفات متعین ہے اور سب حاجیوں کے عرفات سے روانہ ہو کر جمع ہونے اور رات گذارنے اور پھر وقوف کرنے کے لیے مزدلفہ متعین ہے، اور رمی جمار کے لیے منیٰ اور ہدی وغیرہ کے ذبح کے لیے حدود حرم متعین ہیں، پس اگر کوئی شخص حج کے اعمال میں سے کوئی عمل خواہ وہ رکن (فرض) ہو یا واجب یا سنت ہو اس کی خاص مقررہ جگہ کے علاوہ دوسری جگہ کرے گا تو وہ عمل صحیح نہیں ہوگا۔ (ص ٦١)

حرم، منیٰ، عرفات اور مزدلفہ وغیرہ مقامات جہاں اعمال ومناسک حج ادا کئے جاتے ہیں اور صحت اداء کے لیے شرط ہیں، ان کے حدود اربعہ بھی کتب مناسک اور کتب فقہ میں بیان کئے جاتے ہیں، اور ان کو بیان کرنے کا مقصد یہی ہے کہ ان مقامات کے یہ حدود متعین ومعلوم ہیں، ان میں تغیر وتبدل کی اجازت اور امکان نہیں، بیان حدود کے سلسلہ میں چند کتابوں کے حوالجات پیش ہیں، تفصیل کے لیے مراجعت فرمالیں۔

حدود عرفات: ارشاد الساری إلی مناسك الملا علی القاری: ص١٤٠، ١٤١ غنیة الناسك فی بغیة المناسك:٨٤ زبدة المنا سك:١/١٣٨ هدا یة السالك إلی المذاهب الاربعة فی المنا سك:٣/١٠٦ عمدة الفقه كتاب الحج: ص٢٢٣

حدود مزدلفہ: ارشاد الساری:ص١٤٧ غنیة النا سك:ص٨٩ هدا یة السالك:٣/١٤٧ زبدة المناسك:١/١٥٦ عمدة الفقه كتاب الحج: ص٢٣٠

حدود منیٰ: ارشاد الساری:ص١٤٩ غنیة النا سك:ص٩١،٩٠ هدا یة

السالك: ٣/٩٧٦ زبدة:١٧٩،١٧٨/١

مصنف زبدۃ المناسک حضرت مولانا شیر محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے منیٰ کے حدود تفصیل سے بیان کرنے کے بعد ایک تنبیہ فرمائی ہے، اس میں تحریر فرماتے ہیں:

''اور چوں کہ حاجیوں کو منیٰ میں رہنا سنت ہے، ان کو بھی چاہیے کہ جن جبلوں کا جو سامنا طرف منیٰ میں داخل ہے اگر ان پر چڑھ کر قیام کریں تو بھی سنت ادا ہو جائے گی، اس طرح اور کام جو منیٰ کی حد میں کرنے ہیں، واجب ہوں یا سنت وغیرہ وہ بھی اس حد کے اندر کرنا چاہیے، جبلوں کی پیٹھ کی طرف جو منیٰ سے خارج شمار کیا گیا ہے وہاں قیام نہ کریں، میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ بہت سے لوگ عقبہ سے مکہ مکرمہ کی طرف پہاڑیوں پر خیمہ لگائے یا ایسے پڑے رہتے ہیں ان کی یہ سنت وغیرہ ادا نہیں ہوتی۔ الخ (زبدۃ:١/١٧٩،١٨٠)

الحاصل: عرفات، منیٰ اور مزدلفہ کے حدود میں کمی بیشی یا توسیع کرنے کا اختیار وجواز سعودیہ حکومت یا کسی فرد اور جماعت کو حاصل نہیں ہے؛، البتہ آپ نے سوال کے الفاظ میں تسامح سے کام لیا ہے، اس لیے کہ سعودی حکومت نے بعض حجاج کرام کے خیمے جو حدود منیٰ میں ہونے چاہیے وہ حدود مزدلفہ میں لگائے ہیں؛ لیکن منیٰ اور مزدلفہ کے حدود میں کوئی تبدیلی نہیں کی ہے، اس لیے کہ منیٰ اور مزدلفہ کے حدود پر دلالت کرنے والے نشانات اور بورڈ پہلے جہاں نصب تھے وہیں برقرار ہیں، ان میں کوئی تصرف وتبدل نہیں کیا، اس لیے اس بنیاد پر جو سوالات آپ نے قائم فرمائے ہیں درست نہیں ہیں، پھر بھی یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ جن حجاج کرام کے خیمے منیٰ سے باہر مزدلفہ کے حدود میں قائم کئے گئے ہیں وہ حضرات ان خیموں میں قیام کرنے کی وجہ سے منیٰ

میں قیام جو سنت ہے (آٹھویں ذوالحجہ کی فجر کے بعد سے نویں ذوالحجہ کی فجر کے بعد تک اور دسویں ذوالحجہ کے طلوع آفتاب سے لے کر نفر اول یا نفر ثانی تک) اس کے ادا کرنے والے قرار دیے جائیں گے یا نہیں؟ تو اس کا جواب صاف ہے کہ صورت مسئولہ میں یہ تمام سنن ترک ہو جاتی ہیں جن کے چھوڑنے کی وجہ سے اگر چہ کوئی جزاء یعنی دم یا صدقہ تو لازم نہیں آتا؛ لیکن ان کا چھوڑنا نہایت برا اور مکروہ ہے، اور ان سنن کے ثواب سے محرومی کا سبب ہے، خصوصاً گیارہویں اور بارہویں ذوالحجہ کی رات میں منیٰ کا قیام جو اگر چہ حنفیہ کے نزدیک سنت مؤکدہ ہے؛ لیکن ائمہ ثلاثہ کے نزدیک تو واجب ہے، اور وہ اختلافی مسائل جن میں دیگر حضرات ائمہ وجوب کے قائل ہوں احتیاط کا تقاضہ یہ ہے کہ اس کی رعایت کی جائے، اس لیے سعودی حکومت کا یہ اقدام درست نہیں ہے، اس پر احتجاج کر کے اس کی اصلاح ضروری ہے، خصوصاً جب کہ ان خیموں میں جنوبی ایشیا (ہندو پاک و بنگلہ دیش وغیرہ) کے حجاج کو ٹھہرایا جاتا ہے تو اس علاقہ کے اہل علم اور ذمہ دار حضرات کو چاہیے کہ اس سلسلہ میں سعودی وزارت حج کے ذمہ داروں سے گفتگو کریں۔

جو لوگ دسویں ذوالحجہ کی رات میں ان خیموں میں قیام کریں گے اور وہیں مغرب وعشاء کی نماز ایک ساتھ ادا کریں گے؛ نیز فجر غلس میں ادا کریں گے؛ نیز فجر غلس میں ادا فرما کر وہاں وقوف فرمائیں گے تو مزدلفہ کے قیام کی یہ سنتیں اور واجب ادا ہوئے سمجھے جائیں گے؛ اس لیے کہ یہ حصہ مزدلفہ میں داخل ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۵/ صفر ۱۴۲۲ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ

منیٰ کے مکہ مکرمہ میں شامل ہونے پر دو مسئلوں کا حل

ندائے شاہی کے حج وزیارت نمبر جنوری، فروری ۲۰۰۱ء کے صفحہ ۱۷۲ تا ۱۷۶، ارسال فرما کر سائل نے کچھ مسائل دریافت کیے ہیں، اولاً ندائے شاہی کا مضمون پیش خدمت ہے، اس کے بعد سائل کے سوالات اور جوابات پیش کیے جائیں گے۔

حج کے ارکان ومناسک کے بارے میں بعض نئے فتاویٰ

سفر حج کے بارے میں نئے دور میں کچھ نئے مسائل سامنے آئے ہیں، جن کے متعلق برصغیر کے معتبر علماء ومفتیان نے غور وفکر کر کے احکامات متعین کیے ہیں، ان کا جاننا حنفی حجاج کے لیے بہت ضروری ہے تاکہ پرانی لکھی ہوئی مناسک حج کی کتابوں اور رسائل سے مغالطہ نہ پیش آئے، اس طرح کے مسائل کو نمبروار تحریر کیا جارہا ہے۔

منیٰ کا مکہ معظّمہ میں شامل ہونا:

پرانی سب کتابوں میں یہی لکھا ہے کہ مکہ معظّمہ اور منیٰ دونوں الگ الگ جگہیں ہیں؛ لیکن اس وقت مکہ مکرمہ کی آبادی منیٰ سے بالکل متصل ہو چکی ہے اور ان دونوں جگہوں کی میونسپلٹی بھی ایک ہے۔ مکہ معظّمہ کا بڑا اسپتال بھی خاص منیٰ کے حدود میں قائم ہے۔ جو سال بھر کھلا رہتا ہے۔ نیز رابطہ عالم اسلامی کا دفتر بھی منیٰ میں واقع ہے؛ اس لیے اب منیٰ پر بھی مکہ مکرمہ کے احکامات جاری کیے جائیں گے اور اس کو مکہ معظّمہ میں شامل کرنے کے حکم سے حجاج کرام کے درج ذیل مسائل وابستہ ہوں گے:

نمبر ۱: جو شخص ذی الحجہ کی نو تاریخ سے پہلے پہلے تک پندرہ دن مکہ مکرمہ میں مقیم ہو تو اس کو نماز پوری پڑھنی ہوگی، پہلے اس سلسلہ میں آٹھویں تاریخ کا اعتبار تھا، اب

نویں تاریخ کا اعتبار ہوگا، کیوں کہ اسی دن منیٰ سے عرفات جانا ہوتا ہے۔

نمبر ۲: جو شخص پہلے سے مقیم نہ ہو اور اسے دس ذی الحجہ سے آگے پندرہ روز یا اس سے زیادہ تک مکہ مکرمہ میں رہنا ہے تو وہ منیٰ ہی میں دس تاریخ کو ظہر کے وقت سے مقیم شمار ہوگا، اور اسے نمازیں پوری ادا کرنی ہونگی۔

نمبر ۳: جب ایسا حاجی جو پہلے سے مقیم ہو یا آئندہ پندرہ دن رہنے کے ارادے سے مقیم ہو گیا ہو، تو دس ذی الحجہ کو اقامت کی حالت میں رہنے کی وجہ سے اس کے ذمہ مالی قربانی (جو صاحب نصاب اور مقیم ہونے سے واجب ہوتی ہے یہ حج کے دم شکر کے علاوہ ہے) بھی واجب ہو جائے گی (اگر چہ اس مالی قربانی کو حدود حرم ہی میں ذبح کرنا واجب نہیں ہے بلکہ اپنے وطن میں بھی ذبح کرایا جا سکتا ہے اور اگر ایسے مقیم نے ایام نحر میں مالی قربانی نہ کی تو بعد میں قربانی کی قیمت کا صدقہ واجب ہے) مذکورہ تین مسائل کے سلسلے میں موسم حج ۱۴۲۰ھ ہندو پاک کے اکابر مفتیان نے درج ذیل فتویٰ کی تصدیق کی جس کا متن یہ ہے:

اقامت وقصر حاجی، منیٰ کی تحدید وآبادی، مسافر کی قربانی:

استفتاء: ① کیا منیٰ مکہ مکرمہ میں داخل ہے یا خارج؟

② کیا منیٰ میں حاجی کو قصر کرنا ہے یا پوری نماز ہوگی؟

③ حاجی پر مالی قربانی کا کیا حکم ہوگا؟

الجواب مبسملاً ومحمداً ومصلیاً ومسلماً: ① ② عام کتب فقہ میں یہ تحریر ہے کہ اگر کوئی شخص مکہ مکرمہ میں پہنچا اور ۸/ ذی الحجہ تک اس کے پندرہ روز نہیں بنتے تو اس کو قصر نماز ادا کرنی ہوگی، کیوں کہ ۸/ تاریخ کو اس کو ہر حال میں مکہ مکرمہ چھوڑنا ہے؛

لہٰذا اس کا پندرہ روز قیام کی نیت کا اعتبار نہ ہوگا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب منیٰ مکہ مکرمہ سے علاحدہ تھا۔ اب صورت حال یہ ہے کہ مکہ مکرمہ کی آبادی منیٰ سے بھی متجاوز ہوچکی ہے، اور منیٰ مکہ مکرمہ کا ایک محلہ ہے، جیسا کہ مقامی حضرات سے تحقیق کرنے سے اور مشاہدہ سے معلوم ہوا اور دونوں کی بلدیہ بھی ایک ہے۔ لہٰذا اب ۸/ تاریخ نہیں بلکہ ۹/ کا اعتبار ہوگا۔ نیز اگر حج سے قبل مسافر ہے اور حج کے بعد یعنی ۹/ ذی الحجہ کے بعد اس کو پندرہ روز مکہ مکرمہ رہنا ہے تو ۱۰/ ذی الحجہ کو ظہر کی نماز سے مقیم ہوگا اور نمازیں پوری ادا کرنا ہوں گی۔ اور جو پہلے سے مقیم ہے وہ تو ہر حال میں منیٰ، عرفات، مزدلفہ میں نماز پوری ادا کرے گا کیوں کہ عندالاحناف قصر سفر کی وجہ سے ہے نہ کہ حج کی وجہ سے۔

③ جب حاجی ۱۰/ ذی الحجہ کو مقیم ہوگیا تو دیگر شرائط پوری ہونے پر اس کے ذمہ مالی قربانی بھی واجب ہوگی، اور پہلے اگر مال نہیں تھا ایام نحر میں مال آگیا اور بقدر نصاب ہے تو قربانی واجب ہوتی ہے۔ اس پر حولان حول شرط نہیں ہے، اور اگر آخری دن مال آگیا، پہلے مسافر تھا آخری دن مقیم ہوگیا اور قربانی نہیں کی، تو بعد گذرنے ایام نحر کے اس پر قربانی کی قیمت کا تصدق واجب ہے، اور درمیانی درجہ کے بکرے کی قیمت کا اعتبار ہوگا۔ فقط واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ شیر محمد علوی، دارالافتاء جامعہ اشرفیہ لاہور

تصدیق مفتیان کرام واردین مدرسہ صولتیہ مکہ معظّمہ موسم حج ۳/ ذی الحجہ ۱۴۲۰ھ مطابق ۲۰۰۰ء نزیل مکہ معظّمہ

① محمد فاروق غفرلہ، جامعہ محمودیہ علی پور ہاپوڑ روڈ میرٹھ، نزیل مکہ مکرمہ

②مشرف علی تھانوی، دارالعلوم الاسلامیہ کامران بلاک اقبال ٹاون لاہور، نزیل مکہ مکرمہ
③العبد احمد خانپوری، مفتی جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل گجرات انڈیا،
۲۲/ ۱۲/ ۱۴۲۰ھ
④مبین احمد غفرلہ، خادم جامعہ عربیہ خادم الاسلام ہاپوڑ ۱۹/ ذی الحجہ ۱۴۲۰ھ نزیل مکہ مکرمہ
⑤شبیر احمد عفی اللہ عنہ، جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد، یوپی، انڈیا، نزیل مکہ مکرمہ
۲۰/ ۱۲/ ۱۴۲۰ھ
⑥احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ، مفتی مدرسہ شاہی مرادآباد، نزیل مکہ المکرمۃ
۲۱/ ۱۲/ ۱۴۲۰ھ
⑦رئیس الدین غفرلہ، مدرس جامعہ مظاہر علوم وقف سہارنپور، یوپی، انڈیا۔
⑧رشید احمد غفرلہ، خادم دارالافتاء دارالعلوم عبدیہ ہتھین ضلع: فرید آباد، انڈیا۔

منیٰ میں نماز جمعہ کا قیام:

نمبر④: منیٰ کے مکہ معظّمہ میں شامل ہونے سے چوتھا مسئلہ یہ متعلق ہے کہ اگر منیٰ کے ایام (۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳/ ذی الحجہ) میں جمعہ کا دن پڑ جائے تو وہاں جمعہ قائم کرنا ضروری ہوگا اگر مسجد میں نماز جمعہ قائم نہ ہو تو خیموں میں الگ الگ جماعتوں کے ساتھ جمعہ کی نماز پڑھی جائے گی؛ اس لیے کہ یہ بھی مکمل شہر کے درجہ میں ہو چکا ہے۔ حجاج کرام اس کا خاص خیال رکھیں۔

قربانی کی مشکلات:

نمبر⑤ حج ۱۴۱۹ھ تک عام لوگوں کو قربانی میں کوئی زیادہ پریشانی پیش نہ آتی

تھی؛ اس لیے کہ منیٰ کے اخیر میں مزدلفہ کے بالکل ابتدائی حصہ میں ایک بہت بڑی قربان گاہ قائم تھی جس میں لوگ جاتے اور وہیں جانور خرید کر اسی احاطے میں ذبح کر کے آجاتے تھے، اپنے ہاتھ سے ذبح کرنے یا کرانے میں کوئی مشکل نہ تھی۔

لیکن موسم حج ۱۴۲۰ھ سے حکومت نے مزدلفہ کی اس قربان گاہ کو بالکل ختم کردیا، اور اس جگہ پر حجاج کے خیمے لگادیے گئے اور منیٰ سے بالکل الگ کئی کلومیٹر کے فاصلے پر پہاڑوں سے راستے نکال کر ''المعیصیم'' کے نام سے بڑے اور چھوٹے جانوروں کی الگ الگ جدید سہولیات سے آراستہ قربان گاہیں تعمیر کی ہیں، جن میں ذبح، صفائی ستھرائی اور پھر جانور کو کولڈ اسٹور میں رکھ کر فوری طور پر گوشت غریب ممالک میں بھیجنے کا انتظام ہے۔ بلاشبہ یہ ایک عظیم منصوبہ ہے؛ لیکن حنفی حجاج کو اس میں یہ مشکل پیش آئی کہ اب ان جدید قربان گاہوں میں کوئی آدمی اپنی مرضی سے خرید و فروخت کر کے خود آسانی سے ذبح نہیں کرسکتا، زیادہ تر قربان گاہوں میں وکالت کا انتظام ہے، اور اس کا کچھ پتہ نہیں کہ جانور کس وقت ذبح ہوگا، اور جن چند قربان گاہوں میں اپنے ہاتھ سے ذبح کی اجازت ہے ان میں بھی پہلے لائن لگا کر ٹوکن خریدنا پڑتا ہے پھر اجازت ملنے پر اندر جاتے ہیں اس میں بھی کافی تاخیر اور دقت پیش آتی ہے، جو ایک ناواقف آدمی اور بالخصوص خواتین اور ضعفاء، کے لیے تو انتہائی مشکل ہے۔ اس نئی صورت حال میں حنفی حجاج کے لیے رمی، قربانی اور حلق کے درمیان ترتیب قائم رکھنا بہت مشکل ہوتا جارہا ہے، حکومت سعودیہ کا پورا زور اس پر ہے کہ لوگ قربانی خود اپنے ہاتھ سے کرنے کے بجائے بینکوں سے قربانی کے ٹوکن خرید لیں اور مطمئن ہوجائیں، اسی طرح کی مشکلات کے مداوا کے لیے ''ادارۃ المباحث الفقہیہ جمعیۃ العلماء ہند''

کے چھٹے فقہی اجتماع منعقدہ ۱۶ تا ۱۸ ذیقعدہ سنہ ۱۴۱۷ھ میں حنفی حجاج کو سہولت دیتے ہوئے یہ تجویز منظور کی گئی:

”متمتع اور قارن کے لیے رمی، ذبح اور حلق کے درمیان امام اعظم رحمۃ اللہ کے قول پر جو مفتی بہ ہے ترتیب لازم ہے، اس کے ترک سے دم واجب ہوجاتا ہے۔ جب کہ صاحبین کے نزدیک یہ ترتیب سنت ہے اس کے ترک پر دم لازم نہیں ہے۔ آج کل حجاج ازدحام یا دیگر پریشان کن اعذار کے پیش نظر اگر ترتیب قائم نہ رکھ سکیں تو صاحبین رحمۃ اللہ علیہما کے قول پر عمل کی گنجائش ہے“۔

اس تجویز کا مقصود یہ ہے کہ اولاً تو پوری کوشش یہ کی جائے کہ ترتیب قائم رہے، خواہ اس کے لیے کچھ دقت ہی اٹھانی پڑے؛ لیکن اگر کوشش کے باوجود ترتیب باقی رہنے کی کوئی شکل نہ رہے تو صاحبین رحمۃ اللہ علیہما کے قول پر عمل کرتے ہوئے دم واجب نہ ہوگا۔

حج بدل میں تمتع:

⑥ جو شخص دوسرے کی طرف سے حج بدل کرے اصل حکم اس کے لیے یہی ہے کہ اس کا حج میقاتی ہونا چاہیے۔ یعنی میقات ہی سے آمر کی طرف سے احرام باندھے، پہلے زمانے میں اس کی بہتر شکل یہ تھی کہ لوگ حج سے پہلے مدینہ منورہ کے ارادے سے سفر کرتے اور حج کے قریب ذوالحلیفہ سے احرام باندھ کر آمر کی طرف سے حج کرلیا کرتے تھے؛ لیکن اس دور میں حاجیوں کے لیے براہ راست مدینہ جانا کارے دارد ہے اور بہت مشکل سے سیدھے مدینہ جانے کی اجازت ملتی ہے؛ نیز حج کمیٹی یا گروپ سے جانے والے اپنی مرضی کے مالک بھی نہیں ہوتے بلکہ مقررہ نظام کی پابندی ان کے لیے ناگزیر ہوتی ہے ایسی صورت میں اگر حج بدل کے لیے حج میقاتی کو ضروری

قرار دیا جائے تو احرام کی مدت طویل ہونے کی وجہ سے نہ صرف مشکل پیش آتی ہے بلکہ بے احتیاطی کا بھی خطرہ رہتا ہے؛ اس لیے ادارۃ المباحث الفقہیہ کے مذکورہ اجتماع میں حج بدل کرنے والوں کو آمر کی اجازت سے حج تمتع کرنے کے جواز کا بھی فتویٰ دیا گیا ہے۔

تجویز کا متن حسب ذیل ہے:

''حج بدل کا اصل حکم تو یہی ہے کہ مامور حج افراد کرے؛ لیکن اگر آمر یا وصی تمتع کی اجازت دے دے تو تمتع بھی درست ہے، البتہ دم تمتع مامور اپنے مال سے ادا کرے الا یہ کہ آمر دم تمتع ادا کرنے کی بھی اجازت دیدے، خواہ یہ اجازت صراحۃً ہو یا دلالۃً، لہٰذا اس فیصلے سے معلوم ہو گیا کہ اگر حج پر بھیجنے والا شخص جانے والے کو تمتع کی اجازت دیدے تو تمتع کرنے سے بھی حج بدل ادا ہو جائے گا، اور اس وقت عام حجاج کو حج تمتع کرنے کا مشورہ دیا جاتا ہے؛ اس لیے کہ یہی آسان اور احوط ہے''۔

حالت حیض میں طواف زیارت:

⑦ ایک اور مسئلہ خاص طور پر خواتین سے متعلق ہے، وہ یہ کہ اگر ایام نحر میں کسی عورت کو ناپاکی کی بنا پر طواف زیارت کا موقع نہ مل سکے اور بعد میں اس کے اتنے روز ٹھہرنے کا بھی نظم نہ ہو کہ وہ پاک ہونے کے بعد طواف زیارت کر کے وطن لوٹ سکے اور ایسی ناگزیر شکل سامنے آجائے کہ پاکی کے ساتھ اس سفر میں طواف کا موقع ہی نہ رہے۔ تو اس میں جو شرعی گنجائش فقہاء نے دی ہے اس بارے میں بھی مذکورہ فقہی اجتماع نے مندرجہ ذیل تجویز بکمال احتیاط منظور کی:

''اگر طواف زیارت سے قبل کسی عورت کو حیض آجائے تو اس پر ایسی تدبیر اختیار

کرنا ضروری ہے جس سے وہ پاک ہونے کے بعد طواف زیارت کر کے ہی مکہ مکرمہ سے واپس ہوسکے، جیسے ٹکٹ اور ویزے کی تاریخ بڑھانا۔ یا حج کمیٹی سے روانگی کو موخر کرانا وغیرہ، اور اگر کوئی ایسی صورت ممکن نہ ہوسکے اور دوبارہ وطن سے واپسی بھی مشکل ہو اور وہ حالت حیض ہی میں طواف زیارت کرلے تو اگر چہ وہ گنہگار ہوگی؛ لیکن اس کا یہ طواف زیارت شرعاً معتبر ہوجائے گا، اور وہ پوری طرح حلال ہوجائے گی؛ مگر اس پر ایک بدنہ یعنی بڑے جانور کی قربانی جنایت میں لازم ہوگی، اور اگر قربانی نہیں کی جاسکی اور وہ کسی بھی موقع پر طواف زیارت کا اعادہ کرلے تو بدنہ کا وجوب اس سے ساقط ہوجائیگا"۔

ایام منیٰ میں مزدلفہ میں قیام:

منیٰ کی حدود شرعاً متعین ہیں، جہاں حکومت سعودیہ نے بڑے بڑے نیلے بورڈ لگا رکھے ہیں؛ لیکن موسم حج ۱۴۲۰ھ سے حکومت نے خیموں کی پلاننگ زیادہ محفوظ طریقہ پر کرنے کے لیے خیموں کا سلسلہ منیٰ کے اندر تک محدود نہ رکھ کر مزدلفہ کے کافی حصہ تک وسیع کردیا ہے۔ مزدلفہ میں بنے ہوئے ان خیموں میں ہزارہا ہزار حاجیوں کے ٹھہرنے کا انتظام ہے، اب اس صورت حال میں منیٰ میں رات گذارنے کی جو خاص سنت ہے وہ متروک ہورہی ہے؛ اس لیے مزدلفہ میں ٹھہرنے والے حجاج اگر بسہولت منیٰ کے حدود میں انتظام کرسکیں تو فبہا ورنہ اگر مزدلفہ میں ہی رہنا پڑے، جیسا کہ عام حجاج کا حال ہے تو اس کی وجہ سے ان پر کوئی دم وغیرہ لازم نہیں ہے اور حکومتی نظام کی مجبوری کی وجہ سے انشاء اللہ وہ ترک سنت کے گنہگار بھی نہ ہوں گے، اور یہاں ٹھہرنے والے حضرات اگر عرفات سے لوٹ کر مزدلفہ کے حدود میں اپنے بنے ہوئے خیموں

میں آکر رات گزاریں تو ان کا وقوف مزدلفہ کا عمل متحقق ہوجائے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

محترم المقام حضرت مولانا مفتی احمد صاحب دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

بحمداللہ خیریت سے ہوں اور حضرت کی خیروعافیت کا طالب ہوں۔

غرض تحریر ایں کہ ماہنامہ ''ندائے شاہی'' نے حج نمبر میں حج کے متعلق بعض نئے فتاوی شائع کیے ہیں جن کی فوٹو کاپی ارسال خدمت ہے، حضرت کے نزدیک یہ جوابات صحیح ہوں تو تصدیق فرمادیں، بصورت دیگر آپ کے نزدیک جو جوابات صحیح ہوں وہ تحریر فرمادیں۔

اگر مرسلہ فتاویٰ صحیح ہیں اور منی مکہ مکرمہ میں شامل ہے، تو دو مسئلہ کی مزید تحقیق مطلوب ہے:

سوال: ① تیرہویں کی صبح صادق منی میں ہوجائے تو تیرہویں کی رمی واجب ہے، اب جب کہ منی مکہ مکرمہ میں شامل ہے تو تیرہویں کی رمی کا مسئلہ کیا ہوگا، اگر تیرہویں کی صبح صادق منی میں ہوجائے تو منی اور مکہ مکرمہ ایک شہر ہونے کی وجہ سے رمی کا وجوب رہے گا؟

② منی میں قیام سنت ہے اب منی اور مکہ مکرمہ ایک ہونے کی وجہ سے کوئی شخص بجائے منی جانے کے مکہ مکرمہ ہی میں قیام کرکے وہیں سے عرفات ومزدلفہ ہوآئے تو تارک سنت کہلائے گا یا نہیں؟

طالب دعا: مرغوب احمد لاجپوری

(الجواب): حامداً ومصلیاً ومسلماً

آپ نے ماہنامہ (ندائے شاہی کے حج وزیارت نمبر جنوری، فروری ۲۰۰۱ء) کے صفحہ ۱۷۲ تا ۱۷۶ کی زیروکس ارسال فرمائی ہے۔ جس میں مفتی محمد سلمان منصور پوری صاحب زید مجدہم کا ایک مضمون حج کے ارکان ومناسک کے بارے میں بعض نئے فتاوی کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ اس میں مذکور تمام ہی مسائل سے اتفاق کرتے ہوئے ہم ان کی تصدیق کرتے ہیں۔

منیٰ کے باعتبار آبادی مکہ مکرمہ میں شامل ہونے کے فیصلہ اور فتویٰ کی وجہ سے جن مسائل پر اثر پڑتا ہے ان کی تفصیلی وضاحت اسی مضمون میں کردی گئی ہے۔ اس فیصلہ کی نسبت سے آپ نے جو سوال قائم فرمائے ہیں اس کی ضرورت نہیں؛ اس لیے کہ حج ایک ایسی عبادت ہے جو مخصوص اوقات میں مخصوص افعال کے ذریعہ مخصوص جگہوں میں ادا کی جاتی ہے؛ چناں چہ اس کی صحت ادا کے شرائط میں مکان اور زمان کو بھی شمار کیا گیا ہے۔

''عالمگیری'' میں ہے: اما شرائط صحة ادائه فثلاثة: الاحرام، و المكان، والزمان (۱/ ۲۱۹)

''غنیۃ الناسک'' میں ہے: واما شرائط صحة الاداء فتسعة: الاسلام، والاحرام، و الزمان، والمكان، والتمييز، والعقل. (ص۱۳)

آگے مکان والی شرط کی وضاحت وتفصیل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

والمكان المسجد للطواف و لو سطحه، و المسعى للسعي، و عرفات للوقوف، و مزدلفة للجمع، و المبيت والوقوف و منى للرمي، والحرم

للذبح، فلا يصح شيء من افعاله في غيرما اختص به من المكان (ص۱۴)

چناں چہ حج کے تمام اعمال ومناسک (چاہے وہ رکن اور واجب ہوں یا سنت ہوں) میں سے جس کے لیے جو جگہ مخصوص کی گئی ہے اس کے علاوہ میں انجام دینے سے ادا نہیں ہوں گے۔

''مناسک ملا علی قاری'' میں ہے: فلا يصح شئ من افعاله اى من اعمال الحج ركنا او واجباً او سنة في غيرما اختص به اى من اماكنها (ارشاد الساری الى مناسك الملا على القارى: ۴۲)

''عمدۃ الفقہ'' کتاب الحج میں ہے: چوتھی شرط حج کی جگہ کا ہونا ہے، یعنی وقوف، رمی، حلق اور ذبح وغیرہ میں سے ہر ایک کا اس کی متعین جگہ میں کرنا صحتِ اداء کے لیے شرط ہے، اور مسجد الحرام طواف کے لیے متعین جگہ ہے اگرچہ اس کی چھت پر ہو۔ اور سعی کے لیے مسعیٰ (صفا اور مروہ کے درمیان کی جگہ) متعین ہے، اور وقوف کے لیے عرفات متعین ہے، اور سب حاجیوں کے عرفات سے روانہ ہو کر جمع ہونے اور رات گذارنے اور پھر وقوف کرنے کے لیے مزدلفہ متعین ہے، اور رمی جمار کے لیے منیٰ، اور ہدی وغیرہ کے ذبح کے لیے حدودِ حرم متعین ہے۔ پس اگر کوئی شخص حج کے اعمال میں سے کوئی عمل خواہ وہ رکن (فرض) ہو یا واجب یا سنت ہو اس کی خاص جگہ کے علاوہ دوسری جگہ کرے گا تو وہ عمل صحیح نہ ہوگا۔ (ص۶۱)

حرم، منیٰ، عرفات اور مزدلفہ وغیرہ مقامات جہاں اعمال ومناسک حج ادا کیے جاتے ہیں اور صحت ادا کے لیے شرط ہیں۔ ان کے حدود اربعہ بھی کتب مناسک اور کتب فقہ میں بیان کیے جاتے ہیں، اور ان کو بیان کرنے کا مقصد یہی ہے کہ ان

مقامات کے یہ حدود معلوم و متعین ہیں ان میں تغیر و تبدل کی اجازت اور امکان نہیں۔ بیان حدود کے سلسلہ میں چند کتابوں کے حوالجات پیش ہیں۔ تفصیل کے لیے مراجعت فرمالیں۔

حدود عرفات: ارشاد الساری إلی مناسك الملا علی القاری: ص۱۴۰، ۱۴۱ غنیة الناسك فی بغیة المناسك: ۸٤ زبدة المناسك: ۱/۱۳۸ هدایة السالك إلی المذاهب الاربعة فی المناسك: ۳/۱۰٦ عمدة الفقه كتاب الحج: ص۲۲۳

حدود مزدلفہ: ارشاد الساری: ص۱٤۷ غنیة الناسك: ص۸۹ هدایة السالك: ۳/۱٤۷ زبدة المناسك: ۱/۱۵٦ عمدة الفقه كتاب الحج: ص۲۳۰

حدود منیٰ: ارشاد الساری: ص۱٤۹ غنیة الناسك: ص۹۱،۹۰ هدایة السالك: ۳/۹۷٦ زبدة: ۱۷۹،۱۷۸/۱

مصنف ''زبدۃ المناسک'' حضرت مولانا شیر محمد صاحب نے منیٰ کے حدود کو تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کے بعد ایک تنبیہ فرمائی ہے، اس میں تحریر فرماتے ہیں اور چوں کہ حاجیوں کو منیٰ میں رہنا سنت ہے۔ ان کو بھی چاہیے کہ جن جبلوں کا جو سامنا طرف منیٰ میں داخل ہے، اگر ان پر چڑھ کر قیام کریں تو بھی سنت ادا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اور کام جو منیٰ کی حد میں کرنے ہیں واجب ہوں یا سنت وغیرہ وہ بھی اس حد کے اندر کرنا چاہیے، جبلوں کے پیٹھ کی طرف جو منیٰ سے خارج شمار کیا گیا ہے وہاں قیام نہ کریں۔ میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا ہے کہ بہت سے لوگ عقبہ سے مکہ مکرمہ کی طرف پہاڑیوں پر خیمہ لگائے یا ایسے بھی پڑے رہتے ہیں ان کی یہ سنت وغیرہ ادا نہیں ہوتی۔

(زبدۃ ۱/ ۱۷۹، ۱۸۰)

اب آپ کے اٹھائے ہوئے سوالات کے جواب عرض ہیں:

(۱) باعتبار آبادی منیٰ کے مکہ مکرمہ سے متصل ہونے کے نتیجہ میں منیٰ کو مکہ مکرمہ کا ایک حصہ قرار دینے کی وجہ سے یہ لازم نہیں آتا کہ مکہ مکرمہ پر منیٰ کا حکم جاری کر دیا جائے۔ تیرھویں کی صبح اگر منیٰ میں ہو جائے تو حاجی پر اس دن کی رمی واجب ہوگی؛ لیکن حدود منیٰ سے باہر مکہ مکرمہ کے کسی اور حصہ میں تیرھویں کی صبح ہونے سے رمی واجب نہیں ہوگی۔

(۲) آٹھویں ذی الحجہ اور ایام رمی میں منی میں قیام سنت ہے، وہ سنت اسی وقت ادا ہوگی جب کہ وہ اوپر ذکر کردہ حدود منیٰ میں قیام کرے۔ منی کو باعتبار آبادی کے مکہ مکرمہ میں شامل کر لینے کی وجہ سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں کہ منیٰ کے علاوہ مکہ مکرمہ کے کسی اور حصہ میں قیام کرنے سے وہ سنت ادا ہو جائے گی۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

املاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۰ / ۷ / ۱۴۲۲ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ

متفرقات حج

ماءِ زمزم کافر کو دینا

سوال: زمزم کا پانی غیر مسلم کو پینے کے لیے دے سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

دے سکتے ہیں۔ (کتاب الفتاویٰ ۴/ ۸۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد خانپوری عفی عنہ

کافر کو زمزم کا پانی دے سکتے ہیں

سوال: کافر کو کھجور اور زمزم (اس کی طلب پر با عتقاد متبرکاً) پلا سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً

دے سکتے ہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد خانپوری عفی عنہ

احرام کی چادر کو کیا کرے؟

سوال: احرام کی چادروں کو اب گھر آ کر کیا کریں؟ آدمی اپنے کفن کے لیے رکھنا چاہتا ہے کیا حکم ہے؟ یا پھر اسے صدقہ کرنا چاہیے، افضل کیا ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً

کفن کے لیے بھی رکھ سکتا ہے، دوسرے کام میں بھی لا سکتا ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۹/ صفر ۱۴۱۰ھ

الجواب صحیح: عباس داؤد بسم اللہ عفی عنہ

طواف کے ذریعہ ایصال ثواب

سوال: (۱) ایک عورت ہے وہ حج کو جا رہی ہے اور اس کا خاوند انتقال کر چکا ہے، وہ عورت چاہ رہی ہے کہ ہم اپنے خاوند کی جانب سے طواف کریں، یا یہ کہ وہ عورت دوسری شادی کر چکی ہے تو وہ پہلے خاوند کے لیے طواف کر سکتی ہے یا نہیں؟

(۲) عورت مرد کی جانب سے طواف کر سکتی ہے کہ نہیں؟ اگر کر سکتی ہے تو ذی رحم

محرم، محرم اور غیر محرم؛ اِن سب کے لیے کرسکتی ہے کہ ان میں سے کسی ایک کے لیے خاص ہے؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

① ② عورت طواف کر کے اس کا ثواب کسی مردہ یا زندہ مرد یا عورت کو پہنچا سکتی ہے۔

الأصل أن كل من أتىٰ بعبادة ماله جعل ثوابها لغيره إلخ (در مختار) (قوله بعبادة ما) أي سواء كانت صلاة أو صوما أو صدقة أو قراءة أو ذكرا أو طوافا أو حجا أو عمرة أو غير ذلك إلخ ......(قوله لغيره) أي: من الأحياء والأموات عن البدائع إلخ (شامي ٢/٢٥٦) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۱۲رشوال ۱۴۲۰ھ
الجواب صحیح: عباس داود بسم اللہ

ٹی وی پر حج دیکھنا اور سیکھنا

سوال: ٹی وی پر حج کا پروگرام دیکھنا یا ٹی وی کے ذریعہ حج سیکھنا کیسا ہے؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

ٹی وی لہو ولعب کا آلہ ہونے کی وجہ سے حج جیسے اسلام کے ایک عظیم رکن کا پروگرام اس پر دیکھنا یا اس کو سیکھنے کے لیے ٹی وی کا استعمال کرنا درست نہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

أملاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۵ربیع الاول ۱۴۲۳ھ
الجواب صحیح: عباس داود بسم اللہ

خدمتِ حجاج کے لیے جانے والوں پر بھی احرام لازم ہے

سوال: مَیں ایک بار حج وعمرہ کر چکا ہوں، اب میرے چچا حج وعمرہ ٹور لے جاتے ہیں، حاجیوں کی خدمت کے لیے ٹور میں مجھ کو لے جانا چاہتے ہیں؛ لیکن میرے لیے مجبوری یہ ہے کہ وہاں پر ارکانِ حج کی ادائیگی میں دھوپ کی وجہ سے میں سخت بیمار پڑ جاتا ہوں، میرا بدن دھوپ سے جل کر زخمی ہو جاتا ہے، اس وقت میرے جسم کی چمڑی کی حالت ایسی ہو جاتی ہے کہ لوگ مجھ سے گھن کر کے بھاگتے ہیں، اب اگر میں وہاں جاؤں اور حج وعمرہ نہ کروں بلکہ کیمپ میں رہ کر فقط حاجیوں کی خدمت کروں، تو امید ہے کہ اس صورت میں دھوپ سے احتیاط کر کے حاجیوں کی خدمت انجام دے سکوں گا ان شاء اللہ؛ ورنہ ارکان حج کی ادائیگی کے ساتھ خدمتِ حجاج میرے لیے مشکل ہے۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ: مندرجۂ بالا مذکورہ صورت میں اپنے چچا کے ساتھ فقط حاجیوں کی خدمت کے لیے جاؤں اور بغیر حج کا احرام باندھے اور بغیر حج وعمرہ کیے حاجیوں کی خدمت کر کے وطن واپس آجاؤں، تو میرے لیے یہ جائز ہے؟ جو بھی صورت میرے لیے مناسب ہو ارشاد فرمائیں۔

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً

آپ حاجیوں کی خدمت کے لیے جانا چاہتے ہیں تو ظاہر ہے کہ مکۂ مکرمہ کے ارادے سے آپ کا سفر ہوگا، اور مسئلہ یہ ہے کہ کوئی آفاقی (میقات سے باہر رہنے والا) شخص اگر مکۂ مکرمہ میں داخل ہونے کے ارادے سے نکلا، تو اس کے لیے ضروری ہے کہ میقات پر حج یا عمرے کا احرام باندھ کر آگے بڑھے، اگر بغیر احرام

کے میقات سے گزرے گا تو گنہگار ہوگا اور اس پر دم بھی واجب ہوگا؛ اس لیے آپ جب ہندوستان سے مکۂ مکرمہ کے سفر کے ارادہ سے چلیں تو عمرہ کا احرام (میقات یا اس سے پہلے) باندھ کر جائیں، اور وہاں جا کر عمرہ کے افعال (طواف، سعی، حلق) ادا کر کے احرام کھول دیں، اس کے بعد آپ مکۂ مکرمہ میں بغیر احرام قیام کرنا چاہیں یہاں تک کہ ایامِ حج آنے پر حج کا احرام نہ بھی باندھیں اور منیٰ، عرفات، مزدلفہ میں حجاج کی خدمت کی غرض سے ان کے ساتھ رہیں، تو کوئی حرج نہیں ہے۔ مطلب کہ یہاں سے مکۂ مکرمہ جاتے وقت تو کم از کم عمرہ کا احرام باندھنا ہی پڑے گا، بغیر احرام کے مکۂ مکرمہ میں داخل ہوں یہ جائز نہیں ہے۔ (شامی ۲/۱۶۷)

خدمتِ حجاج کے دوران آپ کا مکۂ مکرمہ سے مدینۂ منورہ جانا ہوا، اب اگر دوبارہ وہاں سے مکۂ مکرمہ آنا چاہتے ہیں تو اس صورت میں بھی احرام باندھ کر آنا پڑے گا۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری ۶/رجب ۱۴۱۹ھ
الجواب صحیح: عباس داود بسم اللہ

حج کے لیے چندہ کرنا

سوال: اپنے کچھ متعلقین سے امداد و تعاون لے کر مثل چندہ کر کے حج کو جانا جائز ہے یا ناجائز؟ جس شکل میں درست ہو تحریر فرماویں۔ کیا زکوۃ کے پیسے سے جا سکتا ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً

چندہ کرنا یہ سوال کی ایک صورت ہے، جو اپنی ذات کے لیے جائز نہیں ہے؛ اس

لیے اس طرح رقم حاصل کر کے سفر حج میں جانا جائز نہیں ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری، ۲۹/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۰ھ

الجواب صحیح: عباس داود بسم اللہ